دو بھیگے ہوئے لوگ
15 افسانے
اقبال مجید
Title By : Ghulam Mustafa Daaim
PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

دو بھیگے ہوئے لوگ (۲)

(۱۵ افسانے)

○

اقبال مجید

ناشر: نصرت پبلشرز۔ لکھنؤ-۳
تعداد: پانچ سو
قیمت: ۵ روپے ۵۰ پیسے
مطبع: نامی پریس۔ لکھنؤ
کتابت: سید علی احمد زیدی

قیمت : ۵ روپے ۵۰ پیسے

فہرست

ٹوٹی چمنی

میرے گھر کے سامنے لکڑی کے ایک کھمبے میں میونسپلٹی کی لالٹین لگی ہے۔
لکڑی کے اس کھمبہ میں دیمک لگ گئی ہے اور لالٹین کے لوہے پر زنگ آگیا ہے۔
میں اس لالٹین کی چمنی کو ٹوٹا ہوا دیکھ رہا ہوں اور اس ٹوٹی ہوئی چمنی کو دیکھ کر میرا ذہن ان وادیوں کی طرف بھاگ رہا ہے جو آج سے دس سال پیچھے چھوٹ چکی ہیں۔ جہاں ہماری زندگی کے قافلے نے چند ساعتوں کے لیے قیام کیا تھا اور پھر وہ قافلہ اپنے راستے پہ آگے بڑھ گیا تھا۔

اس وقت میری عمر دس گیارہ سال کی تھی دائرہ شاہ سلیمان میں ابا میاں کو ایک مکان مل گیا تھا اس لیے ہم سب وہاں اٹھ آئے تھے۔ دائرہ شاہ سلیمان کے

لیے کشادہ سڑک سے ایک گلی جاتی تھی یہ گلی ایک پھاٹک میں گھس کر ایک چھوٹے سے میدان میں مل جاتی تھی۔ یہ میدان صرف اتنا بڑا تھا کہ اس میں پانچ چھ چارپائیاں بچھ سکیں۔ جسے تین دو منزلہ مکان گھیرے کھڑے تھے۔ ہر مکان کے پہلو میں ایک پتلی سی گلی تھی جو پانچ قدم چل کر بند ہو جاتی اور پھر وہاں سے اوپر جانے کے لیے زینہ کا دروازہ شروع ہوتا ہے۔ ہر مکان کی چھت کو دوسرے مکان کی چھت سے ایک محفوظ چھجے کے ذریعہ ملا دیا گیا تھا جس میں ایک کھڑکی لگی تھی۔ بس یہی چھوٹا سا قلعہ نما خط دائرہ شاہ سلیمان کہلاتا تھا۔ ہم لوگ بیچ کے مکان کی بالائی منزل میں رہتے تھے۔ ہمارے دونوں پہلو کے کوٹھوں پر مسلمان گھرانے کے لوگ رہتے تھے۔

میری بھابھو دوسرے ہی دن اپنے پڑوسیوں سے ملنے ملانے گئیں جب وہ واپس آئیں تو پاپا نے ان سے پوری رپورٹ مانگی۔

آپ نے تو ایک ہی دن میں دوستی پیدا کرنا شروع کر دی۔ سنائیے پڑوسی کیسے ہیں؟ "ٹھیک ہی ہیں" بھابھو نے کچھ منہ بنا کے کہا "دونوں گھر بیچارے غریب ہیں"۔ "غریب۔" پاپا نے حیرت ظاہر کی "ایک گھر پر تختی لگی ہے" وارث حسین کنٹریکٹر" اور دوسرے کلیم صاحب کی بازار میں جنرل مرچنٹ کی دکان ہے۔ دونوں باہر بڑی شان سے نظر آتے ہیں شہر کے بڑے ہوٹلوں میں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔"

"اونہ۔ آپ ایسے ہی کہا کرتے ہیں" بھابھو نے بھویں چڑھائیں "خدا جانے کیسے کنٹریکٹر ہیں اور کیسے دوکاندار، یا پھر عورتیں پھوہڑ ہوں گی مجھے گھر میں نہ کوئی گرہستی نظر آئی اور نہ کوئی سلیقہ، گندگی تو بیحد ہے۔ ادھر آم کی گٹھلیاں ڈھیر

ہیں ادھر تمام چینی اور کنڈہ ٹوٹی مٹی کی پیالیاں جھوٹی پڑی بھنک رہی ہیں۔
چارپائیوں کی ادوائیں ٹوٹی ہیں، اوڑھنے کو گت کے بچھونے تک تو ہیں نہیں۔
بچے کمبخت بھنکیلے اور گندے، نہ کہیں بیٹھنے کا ٹھکانا اور نہ اٹھنے کا بس زینہ والا
کمرہ تو ضرور صاف رہتا ہے وہاں ایک مسہری لگی پڑی ہے اور اس پر صاف شفاف
توشک اور چادر بچھی ہے۔"
"یہ آپ کس کے یہاں کا ذکر کر رہی ہیں" پاپا کو جیسے یقین نہیں آرہا تھا۔
"وہی تمھارے وارث حسین کنٹریکٹر صاحب کے یہاں کا۔" بھابھو نے
پھر کہنا شروع کیا "ہاں ان کی لڑکیاں دونوں سلیقہ مند اور مہذب ہیں۔ بڑی لڑکی
آمنہ یہی کوئی اکیس سال کی ہوگی ناک نقشہ کوئی صاف نہیں چیچک منھ داغ ہے۔
ابھی تک بیچاری کنواری ہے۔ بس ایک بات بری ہے ہر وقت ناک پر غصہ رہتا
ہے۔ جتنی دیر بیں رہی اس نے اپنے چھوٹے بھائی جمّو کو کم سے کم بیاد بار تو پیٹا
ہوگا۔ خدا جانے سسرال میں کیسے بسر ہو گی۔ ہاں چھوٹی لڑکی عشو ناک نقشے میں بہت
اچھی ہے اور اخلاق میں بھی، اس کی بھی عمر شادی کے لائق ہو گئی ہے۔"
اچھا خود بیوی کیسی ہیں؟" یہ سوال ابّا میاں نے کیا جس کا جواب بجائے
بھابھو کے میری امی نے دیا۔ وہ بولیں۔
"بیوی تو بیچاری بے حد ہنس مکھ ہیں۔ لڑکیوں سے بھی اچھا اخلاق ہے۔
گردے کے مریض ہیں جب دیکھو دو بلی ڈبیاں کاڑھا کرتی ہیں۔"
کلیم صاحب کے گھر سے بھی آپ لوگوں کو یہی شکایتیں ہیں؟" پاپا نے سوال
کیا جس پر بھابھو تڑخ اٹھیں۔

"اے ہے لو' وہ موا اس سے بدتر ہے!" وہ جیسے بیزار بیٹھی تھیں۔ "شوہر ہیں کہ پھیلا بنے پھرتے ہیں۔ گھر میں کچھ ہو جائے دوکان پر سے ٹلنے کا نام نہیں لیتے خود اچھا پہنتے ہیں اور اپنی لڑکی رشیدہ کو اچھا پہناتے ہیں۔"

ان کے بھی کوئی لڑکی ہے؟" ابا میاں نے دل چسپی لی۔

"اور کیا ایک لڑکا ہے شانو۔ یہی ماشاءاللہ اپنے اقبال کے برابر ہوگا اور لڑکی اللہ رکھے پوری جوان ہے۔ اسے بھی ابھی تک گھر پر بٹھائے ہیں، صورت شکل خاک نہیں پر فیشن کے مارے دیوانی رہتی ہیں۔ دن بھر جہاں رانی جی کے بدن پر بیریاں لگی رہتی ہیں، شام کو آئینہ کے سامنے ایک گھنٹہ کنگھی چوٹی ہوتی ہے۔ لپسٹک پوڈر تھوپا جاتا ہے اور نیا جوڑا نکال کر پہنا جاتا ہے۔ خدا جانے یہ کون سا دستور ہے؟"

"خیر صاحب ہمیں کسی سے کیا لینا ہے۔ ابا میاں کچھ سنجیدہ بن گئے" اگر محبت سے لیں گے تو یہاں بھی انکار نہ ہوگا۔"

"ہونہہ، بہن ایمان کی بات تو یہ ہے کہ دونوں گھر بڑے طنطنے والے ہیں۔" امی نے اپنے مخصوص انداز میں طرفداری کی" دونوں گھروں میں خوب آنا جانا ہے، وارث حسین کی بیوی تو رشیدہ کی ماں پر جان چھڑکتی ہیں۔ جتنی دیر میں رہی وہ رشیدہ کی تعریف کرتی رہیں۔ بولیں، بہن میرے آگے بھی اللہ جوان اولادیں ہیں میں کسی کا صبر کیوں سمیٹوں، لڑکی ماشاءاللہ بڑی شریف ہے۔ بڑی نیک ہے، جب میں رشیدہ کی ماں سے ملنے گئی تو انہوں نے وارث حسین کی لڑکیوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ کہنے لگیں، آمنہ اور عشو کو میں اپنی

اولادوں سے بڑھ کر سمجھتی ہوں۔ ویسے بھی میں نے اندازہ لگایا کہ دونوں گھروں کے لوگ آپس میں شیروشکر کی طرح گھلے ملے ہیں۔"

اسی طرح کچھ دن گزر گئے۔ دائرہ شاہ سلیمان میں ہماری زندگی ایک مختصر سے عرصے میں اپنے اعتدال پر آگئی تھی مجھے پڑوس میں میرے ہم عمر دوست مل گئے تھے اور آپا کا تو آدھے سے زیادہ دن پڑوس کے مکانوں میں گراموفون سننے اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ رمی کھیلنے میں گزرتا تھا۔ ایک دن شام کو میں اپنے کوٹھے کے پیچھے پر کھڑا تھا۔ نیچے اس چھوٹے سے میدان میں بیچ میں میونسپلٹی کی لالٹین ساکت تھی ایک روز پیشتر ہی اس لالٹین میں نئی چمنی لگائی گئی تھی سورج زمین و آسمان کی سطح پر آکر رل گیا تھا۔ ہمارے مکانوں کے سائے لمبے ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر میں میونسپلٹی کا آدمی آیا اس نے اپنے کندھے سے سیڑھی اتار کر لالٹین کے کھمبے پر لگائی اور اس پر چڑھ کر ایک کپڑے سے چمنی صاف کی۔ اور لالٹین روشن کر دی۔ ابھی مشکل ہی سے اس نے گلی پار کی ہوگی کہ لالٹین سے ایک زوردار چھناکے کی آواز آئی۔ میں نے گھبرا کر دیکھا، لالٹین کی چمنی ٹوٹ گئی تھی۔ میرے پہلو والے پیچھے پر شانو اور جمو لالٹین پر ڈھیلا مارنے کے بعد ہنس رہے تھے۔ آج پندرہ دن بعد انھوں نے پھر یہ شرارت کی تھی میں فوراً ہی اس پیچھے سے ہو کر جو ہمارے اور اس کے گھر کو ملاتا تھا شانو کے پاس گیا۔ جمو مجھے دیکھتے ہی خوشی سے بولا۔

"اماں کتنا بڑھیا ہے شانو کا نشانہ، مزا آ گیا مار ڈھیلا ٹھائیں سے۔"

"آنے دو تمھارے ابا میاں کو ان سے شکایت کروں گا۔ پھر پتہ چلے گا۔"

"آہا ان کے ابو جی ہی نے تو کہا تھا کہ چمنی توڑ ڈالو، میرے سامنے کہا تھا۔"

جمّو نے جیسے مجھے چت کر دیا۔

"تم جھوٹے ہو" میں نے غصّے میں کہا شانو اور جمّو سے میری لڑائی ہو گئی ہے۔ میں نے سوچا لاؤ۔ شانو کی رشیدہ باجی سے تو شکایت کر ہی دوں مگر پھر گیا نہیں۔

رات پونے دس بجے کے قریب ہم لوگ دستر خوان سے اٹھے۔ میں ہاتھ دھونے کیلئے لوٹا لے کر چھجے پر آیا میں نے یونہی نیچے جھانک کر دیکھا۔ میدان کے بیچ لالٹین ساکت کھڑی تھی اور ہر طرف گہرا اندھیرا تھا۔ سڑک کی طرف سے آنے والی گلی میں مجھے دو سائے کھڑے نظر آئے۔ چند لمحوں بعد کسی نے رشیدہ باجی کے کوٹھے سے نیچے کی طرف ٹارچ کی روشنی پھینکی وہ سائے روشنی کی طرف بڑھے میں اندھیرے میں ٹارچ پھینکنے والے کو پہچان نہ سکا۔ اسلیے بغیر نام لئے پکارا۔

"کون آیا ہے؟"

یک بارگی ٹارچ بجھ گئی اور ٹارچ کی روشنی کی طرف بڑھتے ہوئے وہ سائے ٹھٹھک کر پھر بڑی گلی کے اندھیرے میں ہو لئے، مجھے نہ معلوم کیوں کچھ خوف سا محسوس ہوا میں وہاں سے ٹل آیا مگر دس منٹ بعد میری طبیعت پھر نہیں مانی۔ میں نے چھجے پر آکر چپکے سے دیکھا رشیدہ باجی کے کوٹھے سے ٹارچ کی روشنی پھینکی جا رہی تھی اور دو آدمی رشیدہ باجی کے زینہ میں داخل ہو رہے تھے۔ میں بہت دیر تک سوچتا رہا" ہو نہ ہو لالٹین کی چمنی توڑ ڈالی ہے اب ٹارچ دکھا رہے ہیں" دل نے کہا کہ جا کر زرا میں بھی دیکھوں۔ بھلا اس وقت کون آیا ہے؟ میں بھاگا ہوا اس چھجے پر آیا۔ جہاں سے ہماری چھتیں ملتی تھیں۔ مگر رشیدہ باجی کے گھر کی کھڑکی بند

تھی۔ ان کی طرف سے کنڈی چڑھا لی گئی تھی۔

اس واقعے کو تین روز گزر گئے، تیسرے دن دوپہر کو جمو کو عشو باجی مجھے بلانے آئیں عشو باجی مجھے بہت چاہتی تھیں۔ شروع دنوں میں جب میری امی پڑوسیو کے یہاں ملنے گئی تھیں تو جمو کے گھر میں میں نے سوائے عشو باجی کے اور سب بڑوں کو سلام کیا تھا جس پر امی ناراض ہو گئی تھیں "اسے بھی سلام کر یہ تیری بڑی ہے" اور میں نے کچھ جھینپ کر اسے سلام کیا تھا۔ جس پر عشو باجی نے مسکرا کر تسلیم کیا تھا۔ اس وقت عشو باجی کی مسکراہٹ مجھے بڑی بھلی لگی تھی، ان کے باریک اور نرم نرم ہونٹ اس طرح ملے تھے جیسے چراغ کی لو یا تھرتھرا گئی ہوں اور ان ہونٹوں کی محرابوں سے ان کے موتی ایسے چنے ہوئے دانت جھانکنے لگے تھے اور پھر جتنی دیر میں وہاں رہا تھا عشو باجی کو چور نظروں سے دیکھتا رہا تھا وہ اپنی بڑی بہن آمنہ بی سے بالکل مختلف تھیں، آمنہ بی اس شمع کے مانند تھیں جو رات کا تیسرا حصہ گزار رہی ہو اور جس کی بیمار روشنی میں اجڑی ہوئی انجمن اونگھ رہی ہو — عشو باجی صبح کا حسین تارا تھیں۔

ان کے بال سنہرے تھے۔ جن کو انھوں نے دوپٹہ کا پلو ڈال کر ڈھک لیا تھا۔ وہ اس کا لحاظ رکھتی تھیں، جب بار بھی پلو ڈھلکتا وہ فوراً اسے ٹھیک کر دیتیں۔ عشو باجی کا ماتھا کشادہ تھا اور ناک ستواں تھی جس میں ایک چھوٹی سی سفید کیل تارے کی طرح چمک رہی تھی ان کے کانوں میں چاندی کے سفید سفید رنگ جھول رہے تھے جو ان کے طباقی چہرے پر انتہائی دل کش معلوم ہو رہے تھے۔ مجھے ان کی آنکھوں میں طوس کی پر بہار وادیاں مسکراتی نظر آئیں جنھیں لانبی لانبی اور گھنی پلکیں اپنے نرم سائے میں چھپائے تھیں۔ وہ اس وقت پان کھا رہی تھیں ان کا دہانہ بہت آہستہ

آہستہ حرکت کر رہا تھا اور ہونٹ پان کے سُرخ لعاب سے بھیگے ہوئے تھے جب وہ کچھ دیر منھ چلا کر ہلکا سا گھونٹ لیتیں تو مجھے ان کی دودھ ایسی باریک جلد کے اندر سے پان کی لال لال پیک تالو سے حلق کی طرف اترتے ہوئے محسوس ہوئی۔ گرچہ یہ میرا وہم تھا مگر عشو باجی کی جلد اتنی ہی صاف اور باریک تھی۔ شائد میں ان کو اسی طرح کچھ دیر اور دیکھتا رہتا کہ انھوں نے مجھے پکڑ لیا۔

"آپ کا نام کیا ہے جناب؟"

"جی۔ میرا نام.... اقبال!"

"اور میرا عشو" یہ کہہ کر وہ چراغ کی لویں جیسے تھرتھرا اٹھیں جن کی اوٹ سے موتی ایسے چنے ہوئے دانت جھانکنے لگے "عشو ہے آپ کا نام" میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ امی چیخ اٹھیں۔

"گنوار کہیں کے۔ نام لیتے ہو۔ بری بات عشو باجی کہا کرو۔ جیسے جمو میاں کی باجی ویسے تمھاری باجی۔" اور اس روز سے میں نے ان کو عشو باجی کہنا شروع کر دیا' اور پھر آہستہ آہستہ مجھے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ خدا نے شائد عشو باجی کو صرف میرے لیے آسمان کی تمام تر بلندیوں سے ایک تقدس مآب حور بنا کر اتارا تھا۔ دنیا کی تمام خوشیاں عشو باجی کے وسیلے سے مجھ تک پہنچتی تھیں۔ اسی لیے مجھے ان پر ناز تھا وہ مجھے ناراض نہیں دیکھ سکتی تھیں، اور یہی خیال کر کے میں اپنے بستر پر تکیے میں منھ چھپائے پڑا رہا اور تکیے کی اوٹ سے ذرا سی دراز کر کے ان کی نقل و حرکت کو دیکھتا رہا۔ کچھ دیر وہ مسکرا مسکرا کر آپا سے باتیں کرتی رہیں اس کے بعد میرے پلنگ کی طرف بڑھیں۔

"کیسے پڑے ہو بھولو رام؟" انھوں نے میرے بالوں کو بکھیر دیا۔

"اٹھو چلو میرے ساتھ دو روز سے چھپے چھپے پھر رہے ہو۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔"

"کیوں؟" میں نے کیا خطا کی ہے پگلے۔ اٹھ میں تجھے لینے آئی ہوں۔"
یہ کہہ کر انھوں نے میرا ہاتھ کھینچا۔

"چل اٹھ تجھے میری قسم۔"

"نہیں میں نہیں جاؤں گا۔"

"اچھا، اور جو مر گئی تو؟"

"اے نوج بیٹی۔" میری امّی نے شاید عشو باجی کے یہ الفاظ سن لیے تھے وہ کمرے اور پر گرج پڑیں۔ "جاتا کیوں نہیں۔ بچی اتنی دیر سے خوشامد کر رہی ہے۔" میں امّی کے ڈر سے ان کے ساتھ چلا گیا۔ عشو باجی کے گھر پر شانو کی بڑی بہن رشیدہ باجی بھی موجود تھیں۔ وہ بے حد دبلی پتلی تھیں اگر پھونک دو تو اڑ جاتیں۔ ان کا رنگ گندمی اور چہرہ لمبا اور ستا ہوا جس پر ہر وقت بڑی بڑی غلّہ ایسی آنکھیں مٹکا کرتی تھیں انھیں اپنے ہونٹوں پر اودے رنگ کی لپ اسٹک لگانے کا بڑا شوق تھا۔ رشیدہ باجی سے بھی مجھے کوئی خاص دل چسپی نہ تھی۔ کیونکہ انھیں عشو باجی کی طرح مسکرانا نہیں آتا تھا ان کے لہجے میں عشو باجی کی مٹھاس کے بجائے ایک بے زاری اور جھنجھلاہٹ سی محسوس ہوتی تھی وہ ہر وقت گم سم سی اور چپ رہا کرتی تھیں اس لیے میں ان کے پاس ٹھہر گیا۔ میں نے دیکھا شانو اور جمّو باورچی خانے میں گھسے ہوئے املی کے چیئیں بھون رہے تھے اور آمنہ بی اندر کوٹھری میں سو رہی تھیں تھوڑی دیر بعد عشو باجی نے گڑ کی پپڑی بنائی اور اس کے بعد شانو اور جمّو

اور مجھے ایک جگہ جمع کرکے پہلے میری دوستی کرائی اس کے بعد انھوں نے ہم سب کا منھ میٹھا کرایا۔

ایک دن میرے یہاں میلاد شریف تھا دائرہ شاہ سلیمان کے گھروں کے علاوہ دوسرے گھروں کی بھی خواتین میلاد میں آئی تھیں۔ اس دن عشو باجی نے سفید غرارہ اور سفید جمپر پہنا تھا اور سفید دوپٹہ کو اپنے چہرے کے چاروں طرف اس طرح لپیٹی تھیں جیسے ابھی ابھی نماز پڑھ کر اٹھی ہیں اور سفید داونی میں ان کا شہاب جیسا چہرہ بے حد پاک اور متبرک معلوم ہو رہا تھا وہ ایک اونچے اور سجے ہوئے تخت پر دوسری لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی میلاد شریف پڑھ رہی تھیں۔ آمنہ بی عورتوں کے مونہے کا عطر لگا رہی تھیں اور دبلی پتلی چھریری سی رشیدہ باجی ایک کونے میں آہستہ آہستہ درود شریف پڑھ رہی تھیں۔ اور ان کے ستے ہوئے چہرہ پر غلہ ایسی باہر نکلی ہوئی آنکھیں ایک خاص عقیدت اور احترام سے جھکی ہوئی تھیں' اس رات ان کے ہونٹوں پر اودے رنگ کی لپ اسٹک نہیں لگی تھی۔ چہرے پر پوڈر کے نشان بھی نہیں تھے اور وہ کپڑے بھی نہایت سادہ پہنے تھیں' تھوڑی دیر بعد سلام شروع ہوا، سب عورتیں احترام سے کھڑی ہوگئیں۔

"یا نبی سلام علیکا"

"یا رسول سلام علیکا"

عقیدت میں ڈوبا ہوا یہ پاک ترانہ ابھرا اور کمرے میں معطر فضائیں جھوم اٹھیں اور خدا کی ان گناہ گار بندیوں کو ایسا محسوس ہوا جیسے عرب کا معصوم گڈریا جنت کی بلوریں محرابوں کی اوٹ سے ان پر رحمت کے شگوفوں کی بارش کر رہا ہے ــــــ

رشیدہ باجی کے ہونٹ درود شریف پڑھ رہے تھے کہ شانو پیچھے سے آیا اور ان کا کندھا ہلا کر سرگوشی میں بولا۔ "بلا رہے ہیں ابّا۔"

"اچھا۔" انھوں نے اپنے دونوں طرف دیکھا اور چپکے سے چلی گئیں۔ میں نے شانو کو روک لیا اور اسے اپنی جیب دکھائی جس میں میں نے پانوں کی کئی گلوریاں پاندان سے چرا کر رکھ لی تھیں "انھیں میرے یہاں رکھ دو۔ نہیں تو کوئی دیکھ لے گا۔" اس نے مجھے رائے دی۔ میں نے اسے دو گلوریاں دے دیں جو کہ اس نے ایک وقت میں منھ میں رکھ لیں۔ اس کے بعد میں باقی گلوریاں اس کے یہاں رکھنے چلا گیا۔ میں نے دیکھا رشیدہ باجی کے بدن پر اس وقت بھڑکدار کپڑے چمک رہے تھے ان کے چہرے پر پوڈر کے نشان نظر آرہے تھے اور وہ آئینہ کے سامنے کھڑی اپنے ہونٹوں پر اودے رنگ کی لپ اسٹک لگا رہی تھیں۔

"رشیدہ باجی کہیں جا رہی ہیں؟" میں نے شانو سے پوچھا۔

"نہیں تو ــــ" میں نے دیکھا وہ شانو کی طرف گھور کر دیکھ رہی تھیں۔

"ہاں ہاں رشیدہ باجی کہیں جا رہی ہیں۔" وہ کچھ ٹپٹا گیا "آؤ چلو تمھارے گھر چلیں۔" اس واقعے کے کچھ دن بعد میری امی ابّا میاں سے کچھ عجیب قسم کی سرگوشیاں کرنے لگیں۔ جس میں نفرت اور غصّہ کا اظہار ہوتا۔ ایک دن وہ ابّا میاں سے کہہ رہی تھیں۔

"مجھ سے پوچھو تو دونوں بڑھیاں بڑی قیامت کی معلوم ہوتی ہیں۔ جب دونوں ایک دوسرے سے ملتی ہیں تو اس طرح بات کرتی ہیں جیسے اللہ میاں نے انھیں اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ یہ نہیں سمجھتیں کہ دلی راولی خوب ہی شناسد کہیں ٹھیٹھ رے

ٹھٹھیرے کی بدلائی ہوئی ہے" اس روز امی نے میری آپا کو خوب ڈانٹا اور رشیدہ باجی سے ملنے تک کو منع کر دیا۔ لیکن مجھے کوئی خاص احساس نہ ہوا وقت گزرتا رہا اور میں عشو باجی کی گود میں سر رکھ کر نئے نئے کھیل کھیلتا رہا۔ وہ اپنی پتلی پتلی انگلیوں سے میرے دونوں ہونٹ پکڑ کر مجھ سے کہتیں۔

"کہو گائے۔"

میں کہتا "گائے۔"

وہ کہتیں "کہو گائے کا بچہ۔"

"گائے کا بچہ۔"

"کہو گائے کھائے گڑ۔" اور میرے منھ سے صرف "گائے کھائے"، ہی نکل پاتا کہ وہ میرے دونوں ہونٹ بند کر دیتیں اور میرے منھ سے گائے کھائے گڑ کے بجائے گائے کھائے گپ" نکلتا جس پر ہم دونوں قہقہہ مار کر ہنس پڑتے۔ وہ بڑے پیار سے میرے لیے کرچھے میں آٹا بھونتیں اور اس میں شکر ملا کر ہم لوگ خوب پھنکے مارتے وہ میرا منھ آٹے سے بھر کر مجھ سے پھپھو کہلواتی اور جیسے ہی میں پھپھو کہتا تو اس لفظ کے ساتھ ہر پھّو، پر میرے منھ سے سگریٹ کے دھوئیں کی طرح آٹا نکلتا اور ہم لوگ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔

ایک بار رات کو میرے گھر پر سب لوگ تاش کھیل رہے تھے۔ عشو باجی میری پارٹنر تھیں، رشیدہ باجی کا چھوٹا بھائی نشا نو جسے میری امی کا بس نہ تھا گھر سے نکال دیتیں آمنہ بی کا پارٹنر تھا، ہمارا کھیل اپنے پورے شباب پر تھا میں نے اور عشو باجی نے مل کر اپنے مخالفین کو کئی بیس پسوائی تھیں عشو باجی جھوم جھوم کر اینٹ

پر نکال پتہ کھیل جانے کے بعد خوب خوب ٹرمپ لگا رہی تھیں ہر ہاتھ بنانے کے بعد میں اچھل کر عشو باجی سے ہاتھ ملاتا "جو میری عشو باجی کوٹ میں دو ہاتھ کی کسر اور باقی ہے۔" اتنے میں جمو اپنے گھر سے بھاگا ہوا آیا اور چپکے سے عشو باجی کی بڑی بہن آمنہ بی کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ اور آمنہ بی کے دوپٹہ کا پلو ہلا کر بولا۔

"اٹھو ابو جی نے بلایا ہے۔"

"اچھا ــــ" آمنہ بی نے اپنے ہاتھ کے پتے رکھ دیے۔

"واہ جی" میرا داؤں دے کر جاؤ" میں مچل اٹھا۔

"جانے دو بھیا۔" عشو باجی نے فوراً سفارش کی۔" آؤ شانو تم بیٹھ جاؤ آمنہ کی جگہ۔" آمنہ بی چلی گئیں ان کے جاتے ہی عشو باجی نے بیٹھے بیٹھے اپنی ساری درست کی، اس کے پلو کو سر پر ڈالا۔ ماتھے پر آئے ہوئے بالوں کو درست کیا۔ ایک بار پیچھے گھوم کر اپنی سینڈلوں کی طرف دیکھا اور پھر کھیلنے میں لگ گئیں۔ یہ سب انھوں نے اس طرح کیا جیسے ابھی ابھی جمو ان کو بھی لینے آئے گا، اور ابھی انھیں بھی جانا ہوگا ــــ ان باتوں کے علاوہ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے آمنہ بی کے جانے کے بعد یکبارگی عشو باجی میں ایک عظیم تغیر آگیا تھا۔ ان کے چہرے پر کئی پھیکے پھیکے رنگوں کی چھاؤں دوڑ گئی تھی ان کی ان چمکیلی آنکھوں میں ویرانیاں سی پھیلائے تھیں۔ اس عرصے میں انھوں نے کئی بار مسکرانے کی کوشش کی مگر ان کی وہ مسکراہٹیں مجھے دھوکہ نہ دے سکیں میں انھیں پہچان گیا کہ یہ عشو باجی کی وہ مسکراہٹیں نہیں ہیں جن میں بہن کی محبتوں کی ہلکی ہلکی بجلیاں کوندتی ہیں۔ ان میں چراغوں کی لوں کی کپکپاہٹ نہیں تھی ان میں شیریں بھرنوں کا راگ بھی نہیں تھا۔ اور پھر مجھے یہ بھی

محسوس ہوا کہ عشو باجی جیسے کسی دوسری دنیا میں ڈوب گئیں تھیں وہ حکم کی چال پر پان کا پتہ پھینک رہی تھیں۔ وہ میم کو غلام سے سر کرنا چاہتی تھیں جب کہ ان کے پاس بادشاہ موجود تھا ــــ آمنہ بی پانچ ہی منٹ بعد واپس آگئیں اور بولیں۔

"جاؤ عشو ابو جی بلا رہے ہیں" مجھے آمنہ بی کی آواز میں ایک شکست کا بوجھ محسوس ہوا۔ وہ شانو کو الگ کر کے بیٹھ گئیں، عشو باجی جیسے اس جملے کا انتظار کر رہی تھیں اٹھ کر جانے لگیں "عشو باجی کہاں جا رہی ہو؟" میں نے کچھ ڈرتے ڈرتے کہا ــــ "ابھی آتی ہوں" وہ جیسے بہت دور سے بولیں۔ ان کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا اور ان کے قدم اس طرح آگے بڑھ رہے تھے جیسے کوئی نڈھال مجرم پھانسی کے پھندے کی طرف بڑھتا ہے۔

آمنہ بی تو پانچ منٹ بعد واپس آگئی تھیں مگر آدھا گھنٹہ گزر گیا عشو باجی واپس نہ آئیں۔ میرا دل بے حد الجھ رہا تھا، کیوں چلی گئیں کھیلنے میں بڑی ہار سے آئیں ابو جی کی چہیتی، میں دل ہی دل میں بڑبڑا رہا تھا "میرا خیال تو انھیں بالکل نہیں ہے مجھے کیا پڑی ہے میں کبھی بات نہیں کروں گا" آدھا گھنٹہ اور گزر گیا۔ عشو باجی کھڑکی پر جھانکنے تک نہیں آئیں۔ پندرہ منٹ اور گزر گئے میں نے سوچا لاؤ جا کر دیکھ آؤں۔ ضرور پڑ کر سو گئی ہوں گی۔ اسی لیے تو جان چرا کر بھاگ گئی ہیں۔ اگر سو گئی ہوں گی تو زندگی بھر بات نہیں کروں گا۔ یہ سوچ کر میں چھوٹے تجھے کے پاس آیا کھڑکی اتفاق سے کھلی تھی میں جمو کے کوٹھے میں داخل ہو گیا۔ گھر پر جمو کے ابو جی نہیں تھے، عشو باجی کی ماں بمبے پر جائے کی پیالیاں اور کیتلی دھو رہی ہیں۔ اتنی رات گئے انھوں نے پتہ نہیں کس کے لیے چائے بنائی تھی۔

"عشو باجی —" میں نے آواز لگائی۔

"یہاں آؤ بیٹا" عشو باجی کی ماں نے جلدی سے مجھے پکار لیا۔

"عشو باجی کہاں ہیں" انھوں نے انگلی سے اشارہ کیا: "ابھی ابھی اس کے ابو جی نے اسے خوب ڈانٹا ہے۔ دن بھر ادھر ادھر لگی رہتی ہے پڑھتی نہیں ہے اس وقت اپنے کمرے میں ہے پڑھ رہی ہوگی، وہاں جانا نہیں اچھا" اور پھر عشو باجی کی اماں نے مجھے باتوں میں لگالیا۔ کچھ دیر بعد عشو باجی کمرے سے باہر آئیں، ان کا چہرہ دھواں دھواں تھا، انھیں دیکھتے ہی میں دوڑ پڑا۔

"کیا پڑھ رہی تھیں عشو باجی؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا "تم کون کون سی کتابیں پڑھتی ہو لاؤ مجھے بھی دکھاؤ" یہ کہہ کر میں انھیں ان کے کمرے میں کھینچ لایا۔ "آؤ پھر کبھی دیکھ لینا" انھوں نے ٹالنا چاہا لیکن میں انھیں گھسیٹ ہی لایا۔ اس کمرے میں نیچے اترنے کے لیے زینہ تھا اور دو کھڑکیاں میدان کی طرف کھلتی تھیں، کمرے میں صرف ایک مسہری بچھی تھی جس پر صاف شفاف بستر لگا تھا۔ دیوار کی طاق پر ایک موم کی بتی آہستہ آہستہ رو رہی تھی جس سے کمرے میں بیمار روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ کمرے میں کچھ نہ تھا۔ نہ قلم نہ دوات اور نہ کتابیں کاپیاں۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا میدان کے بیچ ٹمٹمنی ٹوٹی لالٹین کھڑی تھی اور ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔

اور پھر یک بارگی زندگی جیسے چلتے چلتے ٹھٹھر گئی۔ میرے گھر میں پھر چہ می گوئیاں شروع ہوگئیں۔ امی اور ابا میاں چپکے چپکے باتیں کرتے پائے جانے لگے، اور پھر

ایک دن وہ بات سامنے بھی آگئی، میری امی نے مجھے اور آپا کو بلا کے خوب ڈانٹا۔
وہ تنک کر میری آپا سے بولیں۔

"بس آج سے عشو کے گھر کا بھی جانا بند، میں ٹانگیں چیر کر پھینک دوں گی۔"

"کیوں ۔۔؟" عشو باجی کے مقابلے میں اس نئے حکم پر میں اور آپا چونک اٹھے۔

"تو بھی کان کھول کر سن لے" امی میری طرف بڑھیں" تو بہت عشو کا سگا بنتا پھرتا ہے، ہر وقت عشو باجی عشو باجی اب جو کبھی تیری زبان پر عشو کے علاوہ 'باجی' لفظ آیا تو انگارہ رکھ دوں گی زبان پر۔"

اس دن میں نے دیکھا کہ ابا میاں بھی اس معاملے میں کچھ سنجیدہ تھے، میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اب اگر امی مجھے مار بھی ڈالتیں تو شاید عشو باجی کو میں صرف عشو نہ کہہ سکتا تھا۔ امی تو ڈانٹ پھٹکار کر خاموش ہو گئیں لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھ پر رات کیسی گزری، میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں چیخ چیخ کر عشو باجی عشو باجی پکاروں۔ ایک رات تو میں نے جیسے تیسے گزاری لیکن دوسرے دن میں عشو باجی کے گھر چوری چھپے پہونچ بھی گیا۔ اس وقت وہ کوٹھری میں ایک پلنگ پر لیٹی ہی تھیں ان کے پلنگ پر رشیدہ باجی بھی ان کے گلے میں باہیں ڈالے باتیں کر رہی تھیں۔ رشیدہ باجی کہہ رہی تھیں۔

"تیرا دولھا کالا ہوگا۔ گوری لڑکیوں کے دولھا کالے ہوتے ہیں۔"

"اور تمھارا کہیں سے رنگا کے آئے گا۔"

مجھے اس وقت ان باتوں سے کوئی دل چسپی نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ میں چپکے سے ان کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ عشو باجی نے مجھے دیکھتے ہی میرا ہاتھ پکڑ کر

اپنی طرف گھسیٹ لیا " کہاں تھے بھولو رام ؟" لیکن میں نے ان کی بات کا کوئی جواب نہ دیا میری آنکھوں کے دو آنسو جنھیں میں پورے ایک دن تک روکے رہا تھا، عشو باجی کا دامن پانے کے بعد نہ رک سکے۔ اور میں ان کی گود میں آتے ہی رونے لگا " کیا ہوا پگلے " ؟ عشو باجی نے میرے بال پکڑ کر گود سے میرا سر اوپر اٹھایا میں روتا رہا کہ اتنے میں جمو نے آکر عشو باجی کو جھنجھوڑ دیا " چلو چلو، ابا جی بلا رہے ہیں "

" چلو آتی ہوں، عشو باجی نے اسے جھڑک دیا۔

وہ بولا " کپڑے بھی تو۔۔۔۔! "

" چل بھاگ یہاں سے " انھوں نے اسے بھی ڈانٹ دیا۔

پھر وہ میری طرف مخاطب ہوئیں۔

کیا بات ہے اچھے بھیا " ان کے لہجے میں انگوروں کا رس تھا لیکن میں ان سے ہچکیوں میں صرف اتنا ہی کہہ سکا " میرا دل بہت گھبراتا ہے عشو باجی، میں تمھیں عشو باجی ضرور کہوں گا "

" تو تجھے کون منع کرتا ہے پگلے " ؟

" چلو ابا بلا رہے ہیں " جمو نے انھیں جھوڑ دیا "

" کہہ تو دیا آتی ہوں " عشو باجی جھنجھلا گئیں " بات نہیں کرنے دیتا "

" نہیں وہ کہہ رہے ہیں ساتھ لے آؤ "

" جاؤ نہیں جاؤں گی " عشو باجی تقریباً چیخ اٹھیں جمو تنتناتا ہوا چلا گیا۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ اس خاموشی میں مجھے یہ خوف ہونے لگا جیسے میں اب

آخری بار عشو باجی سے مل رہا ہوں۔ آئندہ مجھے ان سے بات کرنے کا شاید موقع نہیں ملے گا۔ میرے دل کا بوجھ اگر آج ہلکا نہیں ہوتا تو پھر کبھی نہیں ہوگا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے ہمت کر کے جلدی سے کہہ دیا۔

"عشو باجی، کل امّی نے ہمیں ڈانٹا تھا وہ کہتی ہیں آپ کو باجی نہ کہا کرو، اور آپ کو بھی۔" میں نے رشیدہ باجی کی طرف اشارہ کیا، میرا جملہ ختم ہوتے ہی رشیدہ باجی اور عشو باجی نے ایک لمحہ کے لیے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر دونوں کی نظریں جھک گئیں، دونوں کے چہروں پر ایک ہی رنگ تھا، ایک ہی تاثر تھا اور تھوڑی دیر کے لیے دونوں ایک معلوم ہو رہے تھے۔ کافی دیر تک سکوت قائم رہا۔ اس کے بعد عشو باجی کی مری ہوئی آواز نکلی۔

"اور کیا کہہ رہی تھیں تمھاری امّی؟" ان کی اس طرح بدلی ہوئی آواز کو سن کر میں نے عشو باجی کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا، ان کے چہرے پر جلتی ہوئی دوپہر کا سناٹا تھا۔ میں نے ان حسین آنکھوں میں دھواں سا اٹھتے ہوئے دیکھا، بھورا بادل میں ان بادلوں میں ڈوب کر میں بڑبڑانے لگا۔ "میں تمھیں عشو باجی ضرور کہوں گا۔" یہ سن کر جیسے عشو باجی کی آنکھوں کے وہ بادل دھیرے دھیرے برسنے لگے، کہ جمو کی تیز آواز پھر سنائی دی۔

"ابا کہہ رہے ہیں کہ فوراً آجاؤ نہیں تو گلا گھونٹ دوں گا۔"

"کہہ دو میری طبیعت خراب ہے۔ میں نہیں جاؤں گی۔"

"کیسے نہیں جاؤ گی۔"

"چلو جاؤ عشو۔" رشیدہ باجی نے آہستہ سے کہا۔ کچھ دیر سناٹا رہا۔ "چلی

جاؤنا۔" رشیدہ باجی پھر بولیں "میں نہیں جاؤں گی، نہیں جاؤں گی" اور یہ کہتے ہوئے عشو باجی نے اپنا سر رشیدہ باجی کی گود میں ڈال دیا، وہ ہچکیوں سے رو رہی تھیں۔ "کیوں رو رہی ہے چڑیل ؟ چلی جانا، باپ بلا رہے ہیں، یہ کیسی نئی نئی باتیں کر رہی ہیں" رشیدہ باجی کی باہر نکلی ہوئی آنکھیں تیزی سے گھومیں۔

"خدا کے لیے مجھے روک لو میں نہیں جاؤں گی"

عشو باجی جیسے بلک رہی تھیں" مگر کوئی بات بھی تو ہو آخر آفت کیا ہو گئی" رشیدہ باجی کے چہرے پر جو تاثرات تھے وہ ساکت اور ٹھہرے ہوئے تھے۔ عشو باجی سسکیاں بھر رہی تھیں۔

"تم آج انجان نہ بنو رشیدہ باجی مجھ سے اعتراف کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لو۔ صرف مجھ سے۔ تنہائی میں" اب عشو باجی چیخ چیخ کر رو رہی تھیں کہ یک بارگی آمنہ بی کی کرخت آواز آئی۔ کیا ہے عشو۔ یہ کیا ہو رہا ہے" کچھ دیر بعد خاموشی رہی جس میں عشو باجی کی سسکیاں ابھرتی اور ڈوبتی رہیں۔

"جانے یہ کیا بک رہی ہے آمنہ اسے سمجھا دنا"

رشیدہ باجی کہہ رہی تھیں" اٹھو بیٹھو" آمنہ بی نے دوپٹہ سے آنسو پوچھے

"کیا اختلاج ہو رہا ہے ؟"

وہ نرمی سے بولیں "آؤ چلو میرے ساتھ" خاموشی پھر ڈسنے لگی۔

آہستہ آہستہ عشو باجی کی سسکیاں مدھم ہونے لگی تھیں اور اب وہ آمنہ بی کے ساتھ جا رہی تھیں۔ رشیدہ باجی نے ان کی طرف سے منھ پھیر کر دوپٹہ سے

آنسو پونچھے۔ میں نے سہمے ہوئے انداز میں پوچھا: تم کیوں رو رہی ہو رشیدہ باجی۔ عشو باجی کو کیا ہوا وہ کیوں رو رہی تھیں۔

■ ■

عدّو چچا

چودھری گڑھیا والوں کے لیے یہ بات ذرا الجھن کی تھی۔
سب دیکھ رہے تھے کہ عدّو چچا ان دنوں آہستہ آہستہ ایک سکوت میں ڈوبتا چلا جا رہا ہے لیکن محلے والوں نے ابھی انگلیاں نہیں اٹھائی تھیں۔ وہ اب بھی اسکے گن گایا کرتے تھے۔ وہ اس کی طرف اشارہ کرکے لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ یہی ہے وہ عدّو جس کے یہاں کی گیارھویں بہت مشہور ہے۔ ہر سال بڑے پیر کی نیاز بڑے دھوم سے کراتا ہے، اور محلے کے لڑکوں کو تو پچھلے سال کی گیارھویں کا ایک ایک واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ یاد تھا۔ جب ایک دن پہلے ہی سے انھیں عدو کی گیارھویں کا بے چینی کے ساتھ انتظار تھا اور جب وہ اسی جستجو میں ایک دن کچہری کے سامنے سے گزرے تو انھوں نے سوچا لگے ہاتھوں

بس اسٹینڈ پر عدّو چچا سے کبھی ملنے چلیں۔

اس دن عدّو کی دوکان کا سارا مال الٹا پلٹا پڑا تھا اور عدّو سیتا پور جانے والی بسوں کے چاروں طرف گھوم گھوم کر روز کی طرح لہک لہک کر آوازیں لگا رہا تھا۔

"نوجیون لو، دس جیون لو، گیارہ جیون لو۔ قومی آواز، سوتنتر بھارت اور پانیر لو۔" وہ اخبار بیچنے میں عجب عجب قافیہ ردیف کے ساتھ جملے تراشتا تھا۔ جب اس نے محلّے کے لڑکوں کو آتے دیکھا تو اوز نگاہ بچا کر تن گیا۔ پہلے تو لڑکوں نے اسے اس طرح نظر بچاتے دیکھ کر آپس میں کھسر پھسر کی اور اس کے بعد بولے۔

"عدّو چچا ہم آئے ہیں۔"

جانتا ہوں بیٹا کیوں آئے ہو!۔ آج عدو چچا نہیں منڈیں گے، روزانہ چائے پی پی کر پرکھ گئے ہو سالے۔" یہ کہہ کر وہ پھر کام میں لگ گیا۔ "بول بھائی بول۔ ہے کوئی پڑھا لکھا جو اخبار خریدے؟ قومی آواز، نیشنل ہیرلڈ، پانیر۔"

ایک لڑکے نے پھر ہمت کی۔

یہ تیور ہیں عدّو چچا۔ ہم سے کچھ ناراض ہو گیا؟" دوسرے نے کہا۔

"ہم تو یہ پوچھنے آئے ہیں کہ کل گیارھویں کر رہے ہو یا نہیں؟" عدّو چمک اٹھے۔

" ابے نہیں کا کیا مطلب، جب تک عدّو زندہ ہے گیارھویں، کیسے نہیں ہو گی؟ یہ بڑے پیر صاحب کی نیاز کا معاملہ ہے۔ کل رات کو آنا سب، اور ہاں جاؤ سالو اپنا مطلب بھی پورا کر لو، سامنے ہوٹل میں چھمن کے یہاں پی لو چائے، کہہ دینا

عدّو چچا کے حساب میں لکھ لے۔"

اور جب لڑکے چھمن کے ہوٹل سے چائے پی کر نکلے تھے تو عدّو اپنی دوکان سے سارا سامان نکال کر باہر پھینک رہا تھا۔ اخبار، رسالے کتابیں دوکان کی ساری چیزیں نکال نکال کر اس نے باہر پھینک دی تھیں اور بس اسٹینڈ کے تمام دوکان دار اس کی طرف چوری چوری دیکھ رہے تھے۔ لڑکوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا معاملہ ہے عدو چچا۔ یہ سب کیا کر رہے ہو؟"

"خیریت تو ہے؟"

"خیریت نہیں تو اس میں مصیبت کیا ہے۔ یہ اسٹیشن ماسٹر سالا کل کا لونڈا، بھلا میں اس کی خوشامد کروں گا، اس کی دوکان میں کوئی ہنڈی گڑی ہے، کل کی لیتا سالا ابھی لے لے۔" پھر عدو نے اپنی لمبی لمبی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اپنی پاٹ دار آواز میں کہنا شروع کیا۔

"میں تو ساری خدائی میں کہہ دوں کہ ایسی ایسی دوکانوں پر عدّو پیشاب بھی نہیں کرتا۔ اپنے رام کو نہیں پڑی ہے، دیکھ لینا عدو اسی ٹھاٹ سے مستی کاٹے گا۔" عدو بڑبڑا رہا تھا اور سامان نکالتا جا رہا تھا کہ اتنے میں ایک شخص نے اسے جھنجھوڑ دیا۔" عدو چچا اس وقت کام آجاؤ تو میں زندگی بھر تمھارا احسان نہیں بھولوں گا۔"

"کیا بات ہے؟" عدّو کے تیور اب بھی چڑھے تھے۔

"بات یہ ہے عدّو چچا کہ میری لڑکی کی طبیعت بہت خراب ہے، مجھے پہلی

ہی بس سے سیتاپور پہنچادو، ٹکٹ بند ہو گیا ہے، بس تیار ہے، ذرا اسٹیشن ماسٹر سے کہہ دو، پیسے میں دیتا ہوں۔"

"ہونہہ۔ اسٹیشن ماسٹر کیا کرے گا جی۔ اس کا تو دماغ خراب ہے" عدو نے منھ بنایا" بھائی اس وقت مجھے معاف رکھو۔"

"نہیں عدو چچا ایسا نہ کہو۔ کچھ تو کرو۔" وہ شخص پھر گڑگڑایا۔ عدّو کچھ دیر خاموش رہا۔ اس کے بعد اس نے ایک شخص کو اپنی مخصوص اکڑ کے ساتھ آواز دی۔

"ابے نورو بھائی۔ ذرا سننا۔"

"بولو ہم چچا۔" وہ شخص مسکراتا ہوا اس کے پاس آگیا۔

"کیا کہا بیٹا۔" ہم چچا۔ چلو سالے تم ہی ہمارے چچا سہی۔" اور پھر عدّو رعب کے ساتھ بولا۔

"دیکھ بے پارسی گنڈے۔ ایک آدمی ہمارا سیتاپور جائے گا۔

نورو بھائی نے رسان سے گردن ہلادی اور اپنی پکوڑی کی طرح پھولی ہوئی موٹی ناک میں نسوار سٹرکتے ہوئے چھینک ماری۔" چکر کا بات نائی چچا۔ ایک آدمی کیا دس آدمی کا ہو جائے گا۔" عدو نے اس آدمی کی طرف اشارہ کیا اور نورو بھائی اسے اپنے ساتھ لے گیا۔

عدّو محلّے کے لڑکوں سے مخاطب ہو کر بولا:

"گھر کی طرف جارہے ہونا؟" لڑکوں نے آہستہ سے گردن ہلادی عدّو نے انھیں اپنی جیب سے چار آنے نکال کر دے دیے۔

جب گولہ گنج کی طرف سے نکلتا تو مسجد کے نکڑ پر سٹران کی دوکان پڑتی ہے وہاں سے کتے کے لیے راتب لے کر اپنی بچی کو دے دو آج میں ذرا دیر سے آؤں گا، مجھے تقاضے پر جانا ہے، اور ایک جگہ سامان رکھنا ہے۔" لڑکے چلے گئے۔

دوسرے روز رات کو محلے والوں نے دیکھا کہ گیارھویں کا کھانا میدان میں ہو رہا تھا۔ چودھری گرمٹھیا والوں کی کالی بچی دانتوں میں مسی لگائے ساری برادری میں لنگڑاتی پھر رہی تھی اور میدان کے ایک کونے میں جہاں دیگوں سے چاولوں کی خوشبو ابھر رہی تھی عدو چکر کاٹ رہا تھا اور اپنے چنے ہوئے کرتے کی آستین چڑھا کر باورچی سے کہہ رہا تھا۔

"پہلوان بس تڑ بڑ یہ دیگ بھی سوارت کر ڈالو۔ دیکھ لو اول نمبر دہرہ دونی چاول ہے۔" عدو نے کوئی کہنے کی بات نہیں چھوڑی۔ "اب ذرا طبیعت سے ایسا پکاؤ کہ ساری برادری انگلیاں چاٹتی ہوئی جائے سمجھے؟ نہیں تو بیٹا ناک کاٹ لوں گا۔" اتنے میں رمضانی نے اسے اطلاع دی۔

"عدو چچا وہ نبی جان اور بجھلی محال والے بھی آگئے ہیں۔ لیکن سب ملا کر گیارہ آدمی ہیں، اور تم نے کہلوایا تو صرف چھ ہی آدمیوں کو تھا۔" ایک بوڑھا یہ سن کر بڑبڑا اٹھا۔

"ہونہہ بھلا بتاؤ تو بلایا چھ کو آگئے گیارہ۔ یہ تو کھلی کھلی بے عزتی کرنا ہوئی۔"

"اماں بھینگو جی۔" عدو نے اسے گھڑک دیا، "پرواہ نہیں آنے دو جتنے آتے ہیں۔ بڑے پیر صاحب سب کا پورا کر دیں گے۔ جا بے رمضانی بٹھال سب کو کھانے پر۔"

اور جب دوسرے غول کا کھانا لگا دیا گیا تو عدّو بھی وہاں ٹہلتا ہوا پہنچ گیا۔

"ادھر پلاؤ دو۔"

"ادھر زردہ کم ہے۔"

"دیکھ بے بچے کو پانی بڑھا۔"

"جلدی جلدی قدم بڑھاؤ کھاتے تو ہو ڈھائی من اور چلتے ہو بیٹا چیونٹی کی چال۔" وہ منتظمین کو چلا چلا کر مشورہ دیتا رہا" دیکھو بھائی جو کم ہو فوراً مانگ لینا" کے نعرے بلند کرتا رہا۔ ایک کے بعد دوسرا غول کھانا کھا کر اٹھتا رہا اور ساڑھے دس بجے رات تک پلاؤ اور زردے کی چاروں دیگیں خالی ہو گئیں۔ جب برادری والے کھا پی کر چلے گئے۔ تو تھوڑی دیر بعد بانس پر لٹکی ہوئی گیس کی بتیاں اتار لی گئیں اور میدان میں لگا ہوا چھوٹا سا شامیانہ اونگھنے لگا۔ محلے کے چھوکرے جو انتظام میں لگے ہوئے تھے فراغت پا کر دیگچیوں کے پاس جمع ہونے لگے۔ عدّو کی بھدی اور لنگڑی بیوی بھی کچھ دیر کے لیے اپنی کوٹھری میں ٹھسی ہوئی برادری کی عورتوں کو چھوڑ کر وہاں آگئی لڑکوں نے اسے گھیر لیا۔

"چچی نہ ہوتی تو سارا معاملہ چوپٹ ہو جاتا، تمھاری کنجوسی عدو چچا کی ناک کٹوا دیتی۔" کسی نے چڑایا۔

"ارے چچی آج تو بڑے غضب کی مسّی لگائے ہو، یہ عمر آگئی مگر نخرے نہیں گئے۔

"چل بھاگ حرامی! عمر آگئی ہے، تیری اماں پر کون سی جوانی پھٹی پڑ رہی ہے۔ اسے نہیں ٹوکتا؟" وہ لنگڑاتی اور بڑبڑاتی ہوئی لڑکے کی طرف جھپٹی اور

لڑکا تالی بجاتا اور ہنستا ہوا بھاگ گیا۔ وہ پھر عدّو کی طرف بھویں چڑھا کر مخاطب ہوئی۔

"سنتے ہو، سارے پان ٹھکانے لگ گئے۔ آٹھ آنے پیسے دے دو دو ڈھولی پان آئیں گے، عورتیں تمباکو کے بنا منھ باندھے بیٹھی ہیں۔"

"اب پیسے ویسے نہیں ملیں گے۔" عدّو نے بناوٹی غصّہ سے کہا "کوئی ٹھیکہ لیا ہے، خود تو ٹھونس کر بیٹھ گئی ہو اب مجھے تو چین سے کھا لینے دو۔ بیچ میں شرارت سے کوئی بول اٹھا" ارے دے بھی دو چچا۔ آٹھ آنے کی کون سی بات ہے۔"

"واہ رے چوٹے تو کون ہوتا ہے حامی بھرنے والا۔" وہ پھر گرج پڑی۔ لڑکے قہقہہ مار کر ہنس دیے۔ عدّو نے اٹھنی پھینک دی اور اس کے جانے کے بعد عدّو زمین پر پالتھی مار کر اور اپنے آگے پلیٹ رکھ کر بیٹھ گیا اور بولا۔

آؤ رے لڑکو اپنی رکابیاں لے کر۔ نکالنا ذرا پہلوان نیچے سے تر تراتا ہوا مال۔ میں بھی ذرا دو ہاتھ مار لوں۔" عدّو لمبے لمبے ہاتھ مارتا رہا اور اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہتا رہا۔" اماں عدّو میں کیا طاقت ہے؟ بڑے پیر صاحب دلوانے ہیں کرتا ہوں۔ اگلے سال دیکھنا اللہ نے چاہا تو اس سے بھی زیادہ شان سے کروں گا۔ تمھاری چچی کو تو ابھی سے اگلے سال کی فکر ہو گئی ہے۔ کہتی ہے اب کی دفعہ ۵ سیر چاول ہر مہینہ جمع کروں گی اور مجھ سے کہتی ہے کہ میں بھی ابھی سے بکروں کے لیے رقم الگ رکھنا شروع کر دوں۔ بوڑھوں نے سر ہلایا" ہاں جی اتنا کرتے ہو تو بہت کرتے ہو، آج کل اس مہنگائی میں کون کرتا ہے اتنی ہمت۔"

رات کے ساڑھے گیارہ بجے تک دیگوں کے پاس بھنبھناہٹ ہوتی رہی تھی، حقے گڑگڑاتے رہے، برتن لڑتے رہے، لکڑی کی مڈھیاں جلتی رہیں اور عدو سینہ پھلا پھلا کر اور اپنی پہلوانوں جیسی بڑی بڑی مونچھوں کو مروڑ مروڑ کر دوسرے سال اس سے کہیں زیادہ شاندار گیارھویں کرنے کے وعدے کرتا رہا تھا۔ پھر کچھ دیر بعد جب رات ڈھلنے لگی تو سارا محلہ خاموش ہو گیا۔ لڑکے گھروں کو واپس چلے گئے۔ سارا سامان ایک ٹھکانے کر دیا گیا اور عدو اپنی کوٹھڑی میں جا کر پڑ رہا۔۔۔ رات گزر جانے کے بعد وہ پھر اپنے معمول پر آ گیا تھا اور زندگی پھر اسی محور پر گھومنے لگی تھی۔

ہمیشہ کی طرح صبح سورج کی پہلی کرن پھوٹنے میں دیر تھی کہ وہ اپنی کوٹھڑی سے منہ اندھیرے باہر نکلا، اپنے کندھے پر لنگوٹ ڈالا، کھڑکھڑیا سائیکل اٹھائی اور بائیں داڑھ میں دتون دبا کر اپنی بیوی کو ہوشیار کیا۔

"بند کر لو دروازہ، میں جا رہا ہوں کام پر۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا۔ چودھری گڑھیا کی چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیوں میں آباد مزدور پیشہ لوگ اپنی کوٹھڑیوں کے باہر چارپائیاں بچھائے میلی میلی چادریں تانے ہوئے سو رہے تھے۔ اس نے سخاوت کے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی اور ایسی گونجتی ہوئی آواز میں پکارا کہ دروازے کے برابر لیٹا ہوا فضل پھلکی والا چونک پڑا اور جب چادر کے اندر سے منہ نکال کر اس نے عدو کی طرف دیکھا تو وہ دتون چباتے چباتے بگڑی ہوئی آواز کیساتھ بولا۔

"قسمت در ہو، جو صبح صبح عدو کا منہ دیکھتے ہو، سو بیٹا آج کا دن بھی چین سے گزرے گا۔" فضل مسکرایا اور کروٹ بدل کر سو گیا۔ سخاوت آنکھیں ملتا ہوا

باہر آیا تو عدّو بڑبڑایا۔

"چل بے جلدی چل، آج زیادہ دیر نہیں نہائیں گے، دیر ہو گئی ہے۔"

"آج کیا کروگے عدّو چچا دریا جاکر، آج تو بدھ ہے۔"

"تو کیا ہو؟" اسے پھر ایک دم خیال آیا۔ "ارے ہاں یار آج تو گومتی کا بندھ کھلا ہوگا۔ کوئی بات نہیں میں نہا لوں گا مگر تیراکی والا پانی آج نہیں ہوگا۔ اچھا تو پھر تم سو جاؤ، میں دو چار ڈبکیاں مار کر سیدھا پریس جاؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ اپنی کھڑکھڑیا سائیکل پر بیٹھ کر برابر والی گلی میں گھس گیا اور کچھ دور تک اس سائیکل کی کھڑکھڑاہٹ اس گلی میں گونجتی رہی۔ گلی میں رہنے والے صبح صبح اس کھڑکھڑاہٹ کے عادی ہو گئے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ عدّو دریا پر نہانے کا عاشق ہے، نہانے کے شوق میں وہ گرمی، جاڑا، برسات کچھ نہیں دیکھتا۔ ویسے وہ نہانے سے پہلے تیس چالیس ڈنڈ بیٹھک بھی مار لیا کرتا تھا اور جس دن اس کی لنگڑی بیوی رات کو چراغ میں کڑوا تیل زیادہ چھوڑ دیتی تھی اس دن وہ صبح دریا جانے سے پہلے چراغ کا تیل روئی میں لگا کر اڑا لے جاتا تھا اور دریا کے کنارے سخاوت سے اپنے جسم پر مالش کرتا اور نہاتا .... اور شاید اسی لیے اپنی عمر کے چالیس سال پورے کر لینے کے بعد بھی اس کے ہاتھ پیر کسرتی اور پھرتیلے تھے، سینہ کشادہ اور آگے کو نکلا ہوا تھا حالانکہ کشتی اس نے اب سے دس سال پہلے ہی لڑنا چھوڑ دی تھی ـــ محلّے کے نوجوان لڑکے جب اُسے اس معاملہ پر کرید دیتے تھے تو وہ ان سے بہت مزے لے لے کر بیان کیا کرتا۔

"بیٹا جب میں تیری عمروں کا تھا اس وقت دیکھنے کے قابل تھے میرے ریاض۔

تم ایسے چار چار کو ایک ایک بغل میں دبا لیا کرتا تھا۔ قاضی جی کے اکھاڑے میں جب مجھے اُستاد کھڑا کرتے تھے۔ تو بڑے بڑے سامنے آتے ہوئے کنی کاٹتے تھے۔ بس ایک تھا میرے جوڑ کا جوان۔ خدا جنّت نصیب کرے خوب لڑتا تھا ہر داؤں میں رواں ___ دھوبی پاٹ ایسا لگاتا تھا کہ اکھاڑے بھر میں کوئی اس کا جواب نہیں تھا۔ پانچ سال تک تو اکھاڑے میں ہمارے علاوہ اور کوئی دھنیسے بھی نہیں پایا۔

"لیکن چچا ایک بات تم چھپا رہے ہو۔" لڑکے اسے پھر ٹہوکا دیتے۔ "سنا ہے کریم پہلوان نے ایک بار تمھیں پچھاڑ دیا تھا۔ بس اس کے بعد ہی سے تم نے اکھاڑے جانا چھوڑ دیا۔"

"عدّو اس کی صفائی میں اسی طرح لہک کر جواب دیتا۔

"دیکھو بھائی۔ اس میں شرم کی کوئی بات نہیں۔ پہلوانی تو ریاض پر چلتی ہے۔ جب تک آدمی زور کرتا رہے مضبوط رہے گا، ان دنوں میں اصل میں کچھ بہک گیا تھا۔ .... بس یوں سمجھو کہ کسی زمانے میں تمھاری چچی سے میری آنکھ لڑ گئی تھی۔ پہلوانی تو پہلوانی اس چکر میں تو میں سب ہی کچھ بھول بیٹھا تھا۔ دو سال تک یہ چکر لگا رہا۔ آخر میں اسے بیاہ لے آیا۔ پھر میرا دل پھیکا پڑ گیا۔ لنگوٹ باندھنا چھوڑ دیا مگر میرا استاد نہ مانا۔ ایک دن اس نے دنگل میں گھیر لیا کریم کے ان دنوں بڑے ریاض تھے، بس بھیّا لے لیا کریم نے مجھے ___ پھر میں نے کبھی کہا۔ چلو سالی آج سے پہلوانی دہلوانی سب ختم ہے"

اسی طرح لڑکے جان جان کر عدو سے اس کے گزرے ہوئے زمانے کے بارے

میں کریدا کرتے اور وہ انھیں بڑے فخر کے ساتھ اپنی دلیریوں کے قصے سنایا کرتا تھا ــــــ جب میں فلاں ڈی ایس پی کے ساتھ اردلی بن کر مسوری گیا تھا تو میں نے ایک بار شکارگاہ پر چھ آدمیوں کے درمیان لاٹھیاں چلائی تھیں۔

محلّے کے لوگوں کو عدّو کی ان باتوں میں صداقت کی بہت کافی جھلک ملتی تھی۔ کیونکہ انھوں نے کئی موقعوں پر عدو کو آگے آگے دیکھا تھا۔ پچھلے دنوں جب ہیوٹ اسکول کے ایک لڑکے نے للّے کبڑیے کی لڑکی پر آوازہ کسا تھا اور اس کا بڑا تو مار بیجا تھا تو وہ لڑکا بُری طرح ٹھوکا گیا تھا۔ جس کے جواب میں ہوسٹل کے لڑکے اپنے اپنے کمروں سے مچھر دانیوں کے ڈنڈے اور ہاکیاں لے لے کر نکل آئے تھے اور للّے کی برادری والے بھی بالکل تیار ہو گئے تھے تو عدّو ان میں سب سے آگے آگے تھا اور چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

"سالو محلّے میں رہنا ہے تو آدمی بن کر رہو۔ نہیں تو ایک ایک کی ٹانگ چیر کر پھینک دوں گا۔ کیا سمجھ رکھا ہے تم نے یہ چودھری گڑھیا ہے چبکلا نہیں ہے۔ آؤ سالو بڑی ہمّت ہے تو۔ میں بھی دیکھوں تم نے کتنا ماں کا دودھ پیا ہے" ممکن تھا کہ یہ معاملہ بہت آگے بڑھ جاتا کہ محلّے کے بزرگوں نے بیچ بچاؤ کر دیا۔ سیٹھ ہرنام داس نے فلائنگ سکواڈ کو ٹیلی فون کر دیا اور بات رفع دفع کر دی گئی۔ ان باتوں کے علاوہ بھی محلّے والے جانتے تھے کہ عدّو بڑا دبنگ اور جی دار آدمی ہے۔ وہ ہر وقت اپنی اکڑ میں ڈوبا رہتا اور اس کی یہ اکڑ اور ٹرّا پن لوگوں میں اس قدر مقبول تھا کہ کوئی بھی اس کا بُرا نہ مانتا۔ شاید لوگوں کو اس کی اینٹھ اکڑ میں بے پناہ خلوص اور محبت کی جھلکیاں نظر آئیں اور وہ ایسا محسوس کرتے جیسے عدّو کے سوکھے ہوئے

جملے پیار کی بے انتہا چاشنی سے معمور ہیں، اور اسی لیے یہ باتیں عدّو کی اب عادت بن گئی تھیں۔ ایک دن جب وہ سڑک سے "بیگم نشتر لکھنؤ سے کالے کر فرار ہو گئی" کا نعرہ لگاتا ہوا محلّے کے ڈپٹی صاحب کی حویلی میں داخل ہوا تو اتفاق سے اس روز ڈپٹی صاحب کے یہاں ایک مہمان آکر ٹھہرے تھے جو حال ہی میں سوئٹزرلینڈ سے آئے تھے اور بلیک اینڈ وہائٹ کے سگریٹ پیتے تھے اور جن کی دیوریا شریف میں بڑی زمینداری تھی اور جو زمینداری ختم ہونے کے بعد اس فکر میں تھے کہ اپنی بارہ بور کی تینوں بندوقیں کسی کے ہاتھ فروخت کر دیں وہ حضرت برآمدے میں بیٹھے ڈپٹی صاحب کے منجھلے لڑکے سے باتیں کر رہے تھے کہ عدّو نے ان کے سر پر ہانک لگائی۔

"آج تو میں اخبار ڈالے جا رہا ہوں مگر کل سے مروّت نہیں ہو گی۔ میاں ڈپٹی صاحب سے کہنا۔ کیا کریں گے اخبار پڑھ کر ـــــ جب پنشن مل جائے تو سب سے پہلے اخبار بند کر دینا چاہیئے۔" ڈپٹی صاحب کا لڑکا تو مسکرا کر چپ ہو گیا مگر وہ حضرت لال پیلے ہو کر رہ گئے۔

"کیا بکتا ہے بے اخبار والے بات کرنا نہیں آتی تجھے؟"

"آپ سے کون بات کر رہا ہے صاحب؟"

"چل چل بھاگ یہاں سے" انھوں نے اسے گھُڑک دیا اور عدّو اس وقت خاموشی سے چلا آیا لیکن دوسرے دن سے اخبار دینے نہیں گیا۔ تیسرے روز ڈپٹی صاحب کا لڑکا اس کے گھر گیا تو وہ بگڑ پڑا۔

"لگا لو جی کسی اور اخبار والے کو۔ مجال تھی جو عدّو کو کوئی آدھی بات کہہ جائے۔

آج تک میں نے کسی کی نہیں سُنی، یہ کوئی طریقہ ہے۔ اخبار بیچتے ہیں، عزت نہیں بیچتے۔" لڑکا خوشامدانہ انداز میں بولا۔

"ایسا نہیں ہے عدّو چچا ـــــ اصل میں وہ ہمارے مہمان تھے۔ انھیں معلوم نہیں تھا۔ بعد میں جب میں نے سمجھایا تو بیچارے بہت نادم ہوئے۔ پھر بھی میں ان کی طرف سے معافی مانگتا ہوں، اور اب اخبار نہیں لاؤ گے تو ہم تمھیں عدّو چچا کہنا چھوڑ دیں گے۔" بس یہاں پر آکر عدّو پھر پسیج گیا کیونکہ اسے فخر تھا کہ اس کی جان پہچان کا ہر شخص اسے عدّو چچا کہتا تھا۔ محلہ کا بچّہ اور بوڑھا سب ہی اسے عدّو چچا کہتے تھے۔ ۶۹ برس کے لڈّن صاحب جن کی ایک آنکھ پتھر کی تھی اور جو نواب خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور جنھیں حسین آباد وقف سے سات روپیہ ماہوار وثیقہ ملتا تھا اور جو اب کنکوے بنا بنا کر اپنی گزر کر رہے تھے وہ جب عدّو کو چچا کہہ کر مخاطب کرتے تو عدّو کو ایک عجیب مسرّت اور بڑائی کا احساس ہوتا اور اس کا سینہ اور پھول جاتا۔ یوں تو اس نے کسی کو عدّو چچا کہنے پر نہ روکا تھا لیکن اس کے پڑوس میں جو پانچ چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں تھیں اور جن میں گونڈے کے بسکٹ والے رہتے تھے اُن کی عورتوں کو وہ ہمیشہ چہرے پر بناوٹی غصّے کے آثار لاکر چچا کہنے سے منع کرتا تھا اور گھڑک کر ان کے مردوں کے سامنے ہی کہہ اٹھتا۔

"واہ رہی کمبختو تم کیوں مجھے چچا بناتی ہو۔ خبردار جو کبھی چچا کہا نہیں تو روٹی کپڑا دینا بند کردوں گا۔" اور جب ان عورتوں کے مرد بسکٹوں کا جھوا لے کر شہر میں پھیری لگانے چلے جاتے اور لکڑیوں کے موٹے موٹے کندے بغیر چیرے

ان کے گھروں کے سامنے پڑے رہتے تو وہ عورتیں عدّو سے ایک مرٹک گیا تھا
اُکر کہتی تھیں۔

"ہے عدّو اپنی تہرا ا دن کی جرا لکڑیوا چیر دیو، دیکھو تو چولھا مندا
پڑا ہے۔"

اس کے جواب میں عدّو چچا چمکتی دھوپ میں کلہاڑی لے کر کُندوں پر
جُٹ پڑتا۔ وہ کلہاڑی چلائے جاتا اور شور و غل مچائے جاتا۔ اصل میں اس
کی یہ ایک خاص عادت تھی۔ وہ جس قدر کام نہیں کرتا تھا اس سے کہیں زیادہ
ہلّڑ مچایا کرتا تھا اور اس کی نقل و حرکت کو دیکھ کر اجنبی شخص یہی سوچتا کہ وہ کسی
بہت اہم کام میں مصروف ہے لیکن محلّے کے چھوکرے اُسے اس حالت میں دیکھ
کر دور ہی سے سمجھ لیتے تھے کہ آج عدّو چچاؔ کو کسی نے چڑھا دیا ہے۔
لیکن چودھری گڑھیا والوں کا یہ خوبصورت دل والا عدّو کھلی گیا دھوپ
کے بعد سے آہستہ آہستہ ایک سکوت میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ عدّو ان دنوں خاموش
کیوں تھا، لوگ فکر مند تھے۔ وہ محور کھسک گیا تھا جس پر عدّو کی زندگی گھوم رہی تھی،
جو صبحیں اور شامیں اس نے بتائی تھیں وہ اب اِدھر کچھ دنوں سے نہ معلوم کیوں کیسی
سی تھیں۔ عدّو کا معمول وہی تھا" اس کی بات چیت وہی تھی اور شاید اس کا برتاؤ
بھی قریب قریب کچھ ویسا ہی تھا لیکن پھر بھی ایک ایسا خلا پیدا ہو چکا تھا جس کا احساس
کم سے کم محلے والوں کو تو ضرور تھا۔ عدّو کبھی کبھی اس مخصوص ترنگ میں یک بارگی کھو کیوں
جاتا ہے یہ سوال اِدھر کچھ عرصہ سے سب کے دلوں میں چٹکیاں لیا کرتا تھا۔
ایک دن لوگوں نے عدّو کو پارسی نورو بھائی سے باتیں کرتے سنا، نورو بھائی

کہہ رہا تھا۔

"اگر تم اس مانک گردن تانے رہے گا تو جان سے بابا گاڑی چلنا کٹھن ہو جائے گا۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی پھولی پھالی ناک میں نسوار چڑھائی اور اپنے پیلے پیلے سوڑھے دکھاتے ہوئے بولا۔ "ہم عدّو چاتم کو ایک ٹھو دکان ابھی دلا سکتا ہے۔ پر تھوڑی سی پگڑی دینا پڑے گا کچھ چاپلوسی بھی کرنا پڑے گا۔ بس جانو سارا معاملہ پھٹ ہو جائے گا، سمجھا؟" عدو برس پڑا۔

"ابے جب دیکھو تو اپنی اڑایا کرتا ہے۔ ایسی بات کہتے تجھے شرم نہیں آتی، مجھے بھی کوئی دیال بک سیلر سمجھ رکھا ہے کہ اسٹیشن ماسٹر کی مٹھی گرم کرکے دکان ہتھیا لی۔ نورو بھائی نے پھر ناک سکیڑ لی اور ذرا ہاتھ ہلا کر سمجھاتے ہوئے بولا۔

"تمری تو بابا کھوپڑی الٹا ہے۔ ارے تم تو سالا ایک چھوکٹیا دوکان ڈر ہے۔ اپن نے تو بڑے بڑے باس لوگوں کو مسکا لگاتے دیکھا ہے۔ جب دھندا بگڑتا ہے تو سب سالا ہنڈل ہو جاتا ہے"

"ابے بھاگ" عدو نے آنکھیں نکالیں " دیکھ لینا بیٹا۔ مجھے اس دکان کی نہیں پڑی ہے، اپنے رام اسی ٹھاٹ سے مستی کاٹیں گے۔ نورو بھائی اپنی ناک سکیڑتا ہوا اور چھینکتا ہوا واپس چلا گیا اور اسی شام کو جب عدّو سیٹھ ہرنام داس کے یہاں حساب لینے گیا تو انھوں نے اس کا پچھلا حساب صاف کر کے آئندہ اخبار ڈالنے کو منع کر دیا۔ عدّو کے تیور بدل گئے اور وہ اپنے مخصوص رعب کے ساتھ بولا:

"سیٹھ جی تم سمجھتے ہو کہ عدّو اس طرح فاقے مرنے لگے گا!"

"کیا مطلب؟" ہرنام داس سٹپٹا گئے۔ عدو نے پھر حملہ کیا۔
" مطلب وطلب کیا، زبان کھلواتے ہو بیکار میں، کل سے میں اخبار
نہیں ڈالوں گا تو نرائن ڈالے گا، جیسے تم اس سے اخبار لے کر اسے بادشاہ ہی
تو بنا دو گے اور میں فقیر ہو جاؤں گا، ہے نا یہی بات؟"
"تمھارا تو دماغ خراب ہے۔
"ارے جاؤ سیٹھ جی تم نئے تھوڑی ہی ہو، تمھارے ایسے اور بھی لوگوں نے
مجھے الگ کر دیا ہے لیکن بڑے پیر صاحب کی دعا سے کیا بگڑ گیا میرا۔ اور پھر
میرے تو ہر مہینے دو چار مسلمان گاہک پاکستان کو اڑ لیتے ہیں۔ ابھی ارشاد
حسین اکاؤنٹنٹ ہی چلے گئے، لیکن کیا پاکستان سالا انھیں اپنے پاس بلا کر مجھے
توپ دم کر دیتا ہے۔ توبہ توبہ سیٹھ جی عدو یوں ہی مستی کاٹے گا۔ اس کے لیے ساری
خدائی پڑی ہے، ساری خدائی، عدو کو نہیں پڑی ہے کہ وہ کسی کی خوشامد کرتا پھرے
سمجھے۔۔۔" یہ بات سن کر سیٹھ ہرنام داس کا منھ سرخ ہو گیا اور عدو وہاں سے بڑبڑاتا
ہوا چلا آیا۔ محلے میں پھر ایک لہر دوڑ گئی۔
"عدو چڑچڑا ہو گیا ہے۔۔۔ عدو کا انداز بدل گیا!" لوگ تذکرے کر رہے
تھے اور آئے دن عدو کی تنک مزاجی کا کوئی نہ کوئی شکار ہو رہا تھا۔
لیکن اب تو محلے والے عدو میں ایک نمایاں تبدیلی محسوس کر رہے تھے۔ وہ
اجڑ رہا تھا۔ وہ چنے ہوئے کرتے کے بجائے پیوند لگی ہوئی قمیص پہننا تھا۔ بھنے
ہوئے گوشت کے بجائے اس کی بیوی گوبھی کی ترکاری پکاتی تھی اور وہ قینچی کی سگریٹ
کے بجائے دل نواز بیڑی پیتا تھا، اس پر ایک مردنی اور ویرانی سی چھا رہی تھی۔

اس کی چھوٹی سی کوٹھری کی فضا جس میں محلّے کے گپّی لڑکوں کے قہقہے گونجا کرتے تھے خاموش رہنے لگی تھی اور اس کی زندگی میں پیدا ہو جانے والا خلا روز بروز تاریک ہوتا جا رہا تھا جس میں عدّو کا وجود ایک دھندلے سائے کے مانند معلوم ہو رہا تھا۔

ایک دن خلافِ امید نورو بھائی اس کا پارسی دوست عدّو کو پھر مل گیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اپنی چمکدار اور لالچی آنکھوں کو نچاتے ہوئے ذرا رازدارانہ انداز میں بولا۔

"تم ٹھنڈے دل سے وچار نہیں کرتے عدّو چچا، اپنے نے ستّی کچہری کی دوکان کے لیے منشی سے بولا تھا، پر وہ سالا کڑوا آدمی ہے، تم تھوڑا پیسہ دے گا اور ذرا جھک کر مسکا لگائے گا تو معاملہ ایک دم فٹ ہو جائے گا۔" عدو یکبارگی بولا۔

"دیکھ بے سڑکیے ـــ میں دو منٹ میں برسوں کی یاری داری کا پتہ کاٹ دیتا ہوں، ابے تو جانتا ہے عدّو صرف ایک ہی سے مانگتا ہے، دیکھ لینا بیٹا بڑے پیر صاحب نے چاہا تو وہی دلوائیں گے مجھے۔"

اور یہ کہہ کر وہ اپنے گھر چلا آیا۔ جب وہ اپنے دروازے کے پاس پہنچا تو ہمیشہ کی طرح اس کے دونوں کتّے اسے دیکھ کر دوڑ پڑے اور اپنی دمیں ہلا ہلا کر اپنا منھ ان کے پیروں پر ملنے لگے۔ عدّو نے پہلے تو انھیں الگ کرنا چاہا لیکن جب وہ اپنے پیار کا بدلہ پچھلے پیار کی طرح پانے کے لیے اُس کا راستہ روکے اس کے پیروں پر پڑے رہے تو اس نے جھنجھلا کر ان دونوں کے لات مار دی اور انھیں پہلی بار رانتب کے بجائے لات کھانے کو ملی اور وہ چلاتے ہوئے الگ ہو گئے ـــ اس کی بیوی

نے جو اپنے کتّوں کے چلانے کی آواز سنی تو وہ کوسنے پیٹنے دیتی ہوئی اپنی کوٹھری سے باہر نکل آئی۔

"خدا کرے تیرا پیر لنجا ہو جائے" وہ چیخی۔ "جانوروں کو کوئی ایسی بیدردی سے مارتا ہے"

"بک بک نہ کر" عدو برس پڑا۔ "کہاں سے لاؤں چار آنے روز کا راتب ان سالوں کا دوزخ بھرنے کے لیے؟ مجھ سے نہیں پلے گی یہ علّت۔ بھجوا دوں گا کل دونو سالوں کو" اور پھر ایک دن جب محلّے میں میونسپلٹی کی کتا گاڑی آئی تو اس نے اپنی بیوی کے رونے پیٹنے کی پرواہ کرتے ہوئے کتّوں کو جمعدار کے حوالے کر دیا۔ کتّے گاڑی میں بند ہو کر اپنے گھروں کی طرف دیکھ دیکھ کر بُری بُری آوازوں کے ساتھ روتے رہے اور عدو اپنی کوٹھری میں بیٹھا بیڑیاں سٹکارتا رہا۔

محلّے والوں میں پھر ایک لہر دوڑ گئی۔ چرچے ابھرنے اور دبنے لگے۔

"اپنا پیٹ پالنا تو مشکل ہے کتّوں کو کون پالے گا؟"

"اجی بات یہ ہے کہ جب سے عدّو نے دوکان چھوڑی ہے وہ ہمارے نہیں رہے"

"اماں عدّو نے تو اب ساری برادری سے ناتا توڑ رکھا ہے"

یہ چہ میگوئیاں ہوتی رہیں اور لوگوں کو عدّو چچا لوگوں کی زبان پر صرف عدّو کے نام سے دہرایا جانے لگا۔ یہ تبدیلی اتنی تیز نہ تھی اور نہ عدّو کو اسے محسوس کرنے کی اب اہلیت ہی رہ گئی تھی۔

ایک دن عدّو اخبار بیچتے ہوئے غیر ارادی طور پر اپنے خیالات میں بہتا ہوا

بس اسٹیشن کی سڑک کی طرف گزرا اور جب وہ ٹھیک بس اسٹیشن کے پھاٹک کے قریب پہنچ کر وہاں کے ہنگامہ سے چونکا تھا اُسے ایک دم خیال آیا کہ اُسے یہاں نہیں آنا تھا۔ اُسے اِدھر کا راستہ ہی چلنا بند کر دینا تھا۔

وہ واپس ہونے والا ہی تھا کہ نورو بھائی نے اسے پکڑ لیا۔

"تم چوری چوری کاہے کو بھاگتا ہے عدّو چچا — اب تم اِدھر کو آگیا ہو تو ہم تم کو خالی مولی نہیں جانے دے گا۔ آؤ ہوٹل میں ایک کپ چائے مار لو" چائے آنے تک وہ اپنی قسوار سڑکنے کی پرانی عادت پر کچھ دیر تبصرہ کرتا رہا اور پھر وہ عدّو سے اپنے پچھلے دنوں کی ملاقاتیں بھول کر بہت ہی جذباتی بن کر کہنے لگا۔ "ہم قسم کھا کر بولتا ہے عدّو چچا۔ جس روز سے تم بس اسٹیشن چھوڑا ہے سالا بڑا سنّاٹا ہو گیا ہے۔" پھر وہ ایک بارگی چونک پڑا۔

"اور کچھ سنا تم نے؟ ارے او سالا اسٹیشن ماسٹر کا بدلی ہو گیا نیا اسٹیشن ماسٹر سنا ہے بڑے مزے کا آدمی ہے۔ بس اب کی تھوڑا اسکا لگا جاؤ عدو چچا تو جانو کام بن جائے گا۔" عدّو گردن جھکائے سُنی اَن سُنی کرتا رہا لیکن نورو بھائی بولے گیا۔

"بس تھوڑا پیسہ صرف ہوگا۔ پانچ روپیہ کی مٹھائی پر پچاس روپیہ رکھ کر پہنچ جانا اور بولنا حضور یہ آپ کے بے بی کے لیے مٹھائی لایا ہے ہم بس اسٹیشن پر کئی برس سے بزنس کرتا تھا۔ پچھلا اسٹیشن ماسٹر ہم کو نکال دیا۔ اپن غریب آدمی ہے۔ صاحب انصاف کر دے" یہ کہہ کر نورو بھائی کی چالاک اور لالچی آنکھیں چمکنے لگیں اور وہ اپنی جگہ سے کودتے ہوئے بولا۔

"بس پھر تو اس کا دادا پاس کرے گا آرڈر۔ اپن تو بس ایک بات بولتا ہے۔

اپن تو خود سالا بس سروس میں برابر مسکا لگایا ہے اس کے بنا کام نہیں چلتا۔ اب تم بولے گا کر اتنا پیسہ کدھر سے بنے گا تو وہ نورو بھائی دے گا۔" یہ کہہ کر وہ چھینکا اور اپنے دل ہی دل میں اپنی چھینک پر جھنجھلایا اور بولا "تم اپنا پرانا یار ہے عدّو چچا، تم کو معلوم ہے کہ اپن اکیلا ہوتا۔ بس سروس میں اتنے برس میں ڈیڑھ دو سو روپیہ بنا لیا ہے، تم بے فکر روپیہ لے لو۔ اپن جانتا ہے تم چار چھ مہینے میں لوٹا دے گا۔"

عدّو یک بارگی اُبل پڑا "ابے اب چچا کبھی رہے گا یا چھلے گا۔" عدّو نے مٹھیاں بھینچ لیں لیکن نورو بھائی کو اس عرصہ میں دو چھینکیں آگئیں اور عدّو کی بات اس کی چھینکو میں دب گئی۔ وہ پھر کہنے لگا۔

"ہم تو بابا تمری مستک کو پرنام کرتا ہے۔ ارے ہم بولتا دو کان مار لو بابا، یہ سالا کڑکی تو دور ہو جائے گا۔ خالی مولی مکھیاں تو نہیں مارے گا۔" یکبارگی میز پر چائے کی پیالی اوندھ گئی اور عدّو تیزی کے ساتھ ہوٹل کے باہر چلا گیا۔ نورو بھائی اپنی چھینکوں کے ساتھ اسے پکارتا رہا لیکن وہ لوٹ کر نہیں آیا۔

دن بھر عدّو اپنی کوٹھری میں نڈھال پڑا رہا۔ شام کو نجّا صاحب کے لڑکے کا ختنہ تھا، لڑکے کو نائی کے سامنے چوکی پر لے کر بیٹھنے کے لیے محلّے والوں نے عدّو چچا کو ہی منتخب کیا تھا لیکن جب تقریب کا وقت آیا تو عدّو نے یہ کہہ کر جانے سے انکار کر دیا کہ اُس کے سر میں درد ہو رہا ہے۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر آگے آگے رہنے والے عدّو نے پہلی بار ایک خوبصورت رشتے کو توڑا تھا، محلّے والے پھر سوچ میں پڑ گئے۔

اسی طرح آہستہ آہستہ صبحیں اور شامیں آتی رہیں موسم بدلنے لگا، بادل چھانے لگے اور برسات آگئی اور ایک بار مکمل چار روز تک طوفانی بارش ہوئی۔ شہر کے متعدد بوسیدہ مکانات گر گئے اور جب وہ طوفان پانچویں روز کچھ کم ہوا، اور بوندیں ہلکی ہوئیں تو چودھری گڑھیا والوں کی خائف نظروں نے دیکھا کہ عدّو کی وہ سوئی ہوئی ترنگ پھر سے جوان ہو گئی تھی، وہ پتلی پتلی گلیوں میں ہلکے ہلکے سہاروں پر کھڑی ہوئی بوسیدہ دیواروں کو لنگوٹ باندھے ایک لمبے بانس کے ذریعہ گرا رہا تھا اور غل مچا رہا تھا، نہا رہا تھا اور لڑکوں پر پھبتیاں کس رہا تھا۔ لیکن عدو کا یہ غل موسم کی نشیلی ہواؤں میں کچھ دیر کے لیے ابھرا اور ختم ہو گیا۔ برسات بیت گئی۔ ہلکے ہلکے جاڑے شروع ہو گئے۔ زندگی پھر اس مریل رفتار سے رینگنے لگی اور ایک سال اور گزر گیا۔ عدّو کی گیارھویں کے چرچے محلّے میں شروع ہو گئے اور عدّو اپنی گیارہویں کے ایک روز پہلے لوگوں کو چیخ چیخ کر دوسرے دن صبح کھانے پر دعوت دیتا پھر رہا تھا اور اس چیخ پکار میں اس نے سارا محلّہ سر پر اٹھا لیا تھا۔

رات کو عدو بھائی نورد پارسی سے ملنے گیا۔ اور بغیر کسی تمہید کے بولا۔

" مجھے ساٹھ روپیہ قرض دے دو ۔۔۔ تین مہینے میں کسی طرح ادا کر دوں گا" نورد بھائی نے ایک آنکھ ماری۔

" تم سالا راستے پر آ گیا نا ۔۔۔۔ لے جاؤ بھورا دوکان اپنے قبضے میں کر لو، وہ دیال بک سیلر دوکان خالی کر کے چلا گیا ہے "

" یہ بات نہیں ہے " عدّو ڈپٹ پڑا " کل عدّو کے گھر بڑے پیر صاحب کی نیاز ہو گی، دس بجے تک زہر مار کرنے تو بھی آ جانا " عدو روپے لے کر واپس آ گیا۔

اور پھر گیارھویں کی مقدس رات جب عدو بے خبر سو رہا تھا تو اس نے ایک خواب دیکھا۔

"وہ اپنی گود میں کسی کا بچہ لیے ہے۔ اس کے ہاتھ میں مٹھائی کی ایک ٹوکری ہے جس میں پچاس روپوں کے نوٹ رکھے ہیں۔ وہ کسی بڑی ہیبت آدمی سے کہہ رہا ہے" حضور یہ مٹھائی آپ کے بچے کے لیے لایا ہوں۔ بس اسٹیشن پر برسوں سے خدمت کرتا چلا آیا ہوں، میرا حق پچھلے اسٹیشن ماسٹر نے چھین کر دوسرے کو دے دیا تھا غریب آدمی ہوں سرکار انصاف کریں۔"

یک بار گی عدو چونک اٹھا۔ اس نے اپنے چاروں طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھا ہر طرف ایک غنودگی چھائی ہوئی تھی، وہ پھر سو گیا۔

اس نے پھر خواب میں دیکھا۔

"اس نے بس اسٹیشن پر دوکان کھولی ہے۔ وہ دوکان پر لوبان کی دھونی دے رہا ہے، سارا بس اسٹیشن اس کی بو سے بسا ہوا ہے وہ بو جس سے پاک اور متبرک ہستیوں کا خیال آتا ہے" اور پھر وہ بو جو عدو کی ناک میں بسنے لگی اس کی شدت سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ لیکن اب صبح ہو چکی تھی۔ اس نے بڑے اشتیاق سے ان خوابوں کو اپنی بیوی سے بیان کیا تو اس کی بیوی حیرانی کے ساتھ دبی دبی زبان میں صرف اتنا بولی "کون جانے اس پاک رات کے خواب تو کبھی جھوٹے نہیں ہوتے، تمھارے سامنے تو بقاتی اور حشمت کی زندہ مثال موجود ہے۔"

صبح خاموش گزری ــــ اور پھر دس بجے دن کو سامنے میدان میں شامیانے کے نیچے بچھی ہوئی دریوں کی طرف محلے کے لوگ اپنے گھروں سے نکل کر بڑھنے لگے۔

دیکھتے ہی دیکھتے کافی لوگ جمع ہو گئے۔ شامیانے میں لوبان جل رہا تھا اور ہر طرف اس
کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور لوگ پلاؤ زردے کی پلیٹوں کا انتظار کر رہے تھے کہ یکبارگی
لوگوں میں حرکت ہوئی۔ عدّو کی لنگڑی بیوی اپنے کندھے پر سینی رکھے ہوئے شامیانے
کے اندر داخل ہو رہی تھی اور سینی سے ایک ایک مٹھی گڑ کے چاول نکال کر بچوں کو
بانٹ رہی تھی "نیاز کے چاول ہیں، ایک دانہ بھی نہ گرنے پائے" کہہ کر لڑکوں کو
سمجھا رہی تھی کہ لوگ بول پڑے۔

"ارے چچی کھانا لگواؤ نا۔ اب صبر نہیں ہو رہا ہے۔"

"میں کیا جانوں کھانا دانا" وہ اپنے مخصوص چڑچڑے پن کے ساتھ بولی "
کھانے کے لیے اپنے عدّو چچا سے کہنا، میں تو تبرک بانٹ رہی ہوں بڑے پیر صاحب
کا، آؤ تم سب بھی ادھر کھسک آؤ۔"

"لیکن عدّو گیا کہاں ــ؟" کسی نے پوچھا۔

"گھبراؤ نہیں، بڑے پیر صاحب ہی کے کام سے گیا ہے" وہ تلخی سے بولی اور پھر
تبرک بانٹنے لگی۔ کچھ گھڑیاں اور بیت گئیں لوگ بھوک میں جھنجھلاتے اور بڑبڑاتے ہوئے
اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ لڑکوں پر جیسے سناٹا سا چھا گیا، شامیانے
کے نیچے لوبان جل رہا تھا، لڑکے عدّو کو ڈھونڈ رہے تھے۔ اور عدّو گیارھویں کی مقدس
رات کو دیکھے ہوئے خواب جو کبھی جھوٹے نہیں ہوتے اس کی تعبیر کی تمام منازل سے گزر چکا
تھا اور اپنی آنکھوں میں عقیدت کی چمک لئے بس اسٹیشن کی دوکان پر لوبان کی دھونی
دے رہا تھا۔ دوکان پھر سے کھولی جا رہی تھی۔

آئینہ در آئینہ

وہ دونوں بڑے پھاٹک سے بنارسی باغ میں داخل ہوئے۔ دونوں طرف سبزہ تھا اور بیچ میں روش۔ کچھ دور چل کر دونوں عجائب گھر کی اس نئی عمارت کے پاس آ گئے جہاں اژدہے اور دوسری قسم کے سانپ نمائش کے لیے رکھے گئے تھے۔

عمارت کو دیکھتے ہی عطیہ نے بے صبری کے ساتھ اعلان کر دیا۔

"دیکھئے جناب بسم اللہ اسی جگہ سے کریں گے۔"

"اچھا" جمال چپکے سے بولا۔ اس کی نظر عمارت کے باہر لگے ہوئے بورڈ پر پڑی جس پر لکھا تھا (فیس داخلہ ایک آنہ) اس نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ صرف ایک سکہ، اس نے تھوڑا سا ہاتھ باہر نکال کر تقریباً جھانک کر ہتھیلی کی طرف دیکھا، بس کل جمع یہی ایک اٹھنی تھی اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی، جمال نے دل ہی دل میں دعا مانگی۔

"یا اللہ اس عشق کی خیر رکھنا" اور پھر دل نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے خود ہی جواب دیا "ابھی تک خیر ہے میاں۔ آگے کی کون جانے" وہ اٹھنّی نکال کر ٹکٹ لینے کے لیے آگے بڑھا۔ ٹکٹ گھر کے قریب ہی ایک بوڑھا اور اندھا فقیر لاٹھی ٹیکے نحیف آواز میں صدا لگا رہا تھا۔

"اللہ کے نام پر — بابا آنکھوں سے محتاج ہوں"

"بابا اندھے محتاج کو ایک پیسہ"

فقیر کے سر کے بال سفید تھے۔ لیکن ان پر خاک اس قدر جم گئی تھی کہ وہ بھورے معلوم ہو رہے تھے —— پیشانی پر جھرّیاں پڑی ہوئی تھیں اور کیچڑ بھری چھوٹی چھوٹی آنکھیں سیاہ حلقوں کے اندر دھنسی ہوئی تھیں اس کی پلکیں غائب تھیں وہ سیدھے ہاتھ میں ایک میلا سا کٹورہ لیے جس میں کچھ پیسے پڑے تھے، بت کی طرح کھڑا تھا اور صدا لگائے جا رہا تھا۔ جمال فقیر سے بچ کر آگے نکلا۔ ٹکٹ خریدے اور عطیہ کو لے کر اندر چلا گیا۔ اندر شیشے کے بکسوں میں طرح طرح کے بھیانک اور زہریلے سانپ بند تھے، عطیہ ایک ایک سانپ کو دیکھ کر بہت زور و شور سے اپنی رائے دے رہی تھی۔ لیکن جمال ان باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں محسوس کر رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں جھنجھلا رہا تھا —— "کیا ضدی لڑکی ہے! لاکھ سمجھایا کہ حضرت اس وقت گھومنے کا موڈ نہیں ہے، سر میں درد ہو رہا ہے، حرارت بھی محسوس ہو رہی ہو۔ طرح طرح کے بہانے کیے مگر نہیں مانی۔ بس رٹ لگا دی۔ تمھیں میرے سر کی قسم، میرے جمال، میرے اچھے جمال، بس مرغے کی ایک ٹانگ، کوئی حیلہ، کوئی بہانہ نہیں سنا۔ رانی صاحبہ کو کیا معلوم کہ یہاں جیبوں کا باجہ بول چکا ہے۔ اور سو بکھیڑوں کے ایک بکھیڑ ہیں ——"

اصل میں تفریح کا یہ پروگرام بالکل اچانک بن گیا تھا۔ عطیہ نے کوئی صاف بات بھی نہ کی، بنارسی باغ میں گھومنے کا کوئی ذکر ہی نہیں آیا تھا اگر وہ اشارہ ہی کر دیتی تو کم سے کم وہ اپنے یاروں میں حسن عابد یا اختر کے پاس جا کر رو تا گاتا ۔ اور دو چار روپیہ قرض ہی مانگ لاتا۔ مگر اس کا موقع ہی کہاں آیا۔ عطیہ اُسے یونیورسل بک ڈپو میں یوں ہی مل گئی اور بنارسی باغ کھینچ لائی، وہ ان ہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ عطیہ نے چٹخارہ بھر کے کہا۔

" اہا ہا جمال دیکھو ــــ یہ ہے سانپوں کا گرو، مہا سانپ ۔ اسے دیکھ کر تو سابو اور جانکاؤس یاد آتے ہیں "

" جی نہیں " جمال جل کر بولا " اسے دیکھ کر عطیہ بیگم کی زلفیں یاد آتی ہیں "

پھر وہ دونوں عمارت کے باہر نکل آئے، باہر آکر جمال کو پھر اندھے فقیر کی اکتا دینے والی صدا سنائی دی۔ اس نے دل ہی دل میں کہا :۔

" تم بھی بڑے میاں کہاں بے موقعہ مانگ رہے ہو، خواہ مخواہ کی بکواس لگا رکھی ہے "

اور پھر وہ اپنی جیبوں کے چھ آنے کے پیسے بجاتا ہوا دو تین قدم تیزی سے رکھ کر دوسری طرف مڑ گیا۔

" کیوں ـــ ؟ خیریت ! یہ ایک بارگی آورد سے آمد کیسی ۔ ؟" عطیہ نے مسکرا کر جملہ کیا۔

" کچھ نہیں " وہ آہستہ سے بولا اور رک گیا۔ اس نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکال لی۔ اس میں کیپٹن کا ایک سگریٹ باقی بچا تھا اسے نکال کر سلگایا۔ اصل میں اس

نے وہ خطرناک راستہ کاٹ دیا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اس راستہ پر آگے چل کر بنارسی باغ کا اوپن ایئر ریسٹورانٹ ملے گا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ آج عطیہ کی محبت پورے فارم پر ہے جو جمال کو بمبئی کے ایک مشہور تاجر کا لڑکا پاشا جمال خاں سمجھتی ہے اور جو بٹلر ہوسٹل کے بیالیس نمبر کمرے میں رہتا ہے اور جس کے باپ اسے دو سو روپیہ ماہانہ صرف جیب خرچ بھیجتے ہیں جب کہ اصلیت کیا تھی اس کا باپ نوکری کرتا تھا یا انڈے بیچتا تھا وہ بٹلر ہوسٹل کے بیالیس نمبر کمرے میں رہتا تھا یا رکھا جاتا تھا۔ اسے دو سو روپیہ جیب خرچ ملتے تھے یا ان کے دو نقطے محض اضافی تھے ان سب باتوں کو کس نے دیکھا تھا۔ وہ خاموشی سے جلتا رہا کہ عطیہ نے ایک ہلکا پھلکا اعلان کر دیا۔

"میری پیٹ کی بڑی آنتیں تھرٹی ایٹ پیرلل کراس کر گئی ہیں۔ کہیں چائے ہونی چاہیئے" جمال کے کان کھڑے ہو گئے وہ جس خطرے سے ڈر رہا تھا وہ سامنے آ رہا تھا اور عطیہ نے اُسے اس خطرے سے اب بالکل آگاہ کر دیا تھا اور اتنی آسانی سے وہ ہار مان لینے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ کسی قیمت پر چاہے کچھ ہو جائے مگر وہ کر بھی کیا سکتا تھا، لیکن میں ہار نہیں مانوں گا، کسی قیمت پر بھی نہیں مانوں گا" وہ دل ہی دل میں سوچتا متفکرانہ انداز میں قدم آگے بڑھائے گیا۔ کچھ دور چل کر سامنے اسے ایک سانولے اور دوہرے بدن کا آدمی آتا دکھائی دیا۔ وہ سوٹ پہنے تھا اور اس کے گلے میں نیلے رنگ کی بو لگی تھی جس پر سفید چتیاں پڑی ہوئی تھیں اسکی چال بہت سمارٹ تھی اور دور ہی سے اس کا سیاہ اور سفید رنگ کا بٹلر شو چمک رہا تھا۔ اس کی بغل میں چمڑے کا ایک بیگ تھا۔ جب وہ آدمی قریب آیا تو جمال کو اس کی صورت

کچھ جانی پہچانی سی معلوم ہوئی اور یہی ہوا کہ وہ آدمی چند لمحہ اسے غور سے دیکھنے کے بعد ایک دم برسٹ ہو گیا۔

"ہلو مسٹر جمال ـــ ڈڈ یو' رگگنائزمی ؟"

"ہلو ہلو ـــ" جمال نے اسے پہچاننے میں توقف کیا اور پھر مسکرا کر بولا۔

"اچھا آپ ہیں ! کنور مسرا جی "

"یس یس " اسکے سوکھے اور موٹے ہونٹ پھیل گئے، جو سگار کی کثرت استعمال سے نیلے پڑ گئے تھے۔ اس کی ہنسی سے اس کے دونوں گالوں پر گڑھے پڑ گئے، اور آنکھوں کے برابر جھرّیاں سی ابھر آئیں پھر وہ ایک بارگی سنبھل گیا اور عطیہ کی طرف نگاہ ڈال کر کچھ ہنستے ہوئے اپنی بُو درست کرنے لگا۔

"ان سے ملئے کنور جی۔ جمال نے نرمی سے کہا " یہ ہیں مس عطیہ .... سائیکلوجی میں ایم۔ اے کر رہی ہیں میرے ساتھ "

"اوہ۔ اچھا اچھا۔ گڈ ـــ نمستے جی "

"آداب " عطیہ نے اس طرح سلام کیا جیسے بوجھ ہلکا کر رہی ہو، جمال کو یاد آیا کہ اس شخص سے وہ پچھلے دنوں نیو انڈیا کافی ہاؤس میں مل چکا ہے، اسی جگہ اس کے کسی نئے نئے دوست نے ان کا تعارف کراتے ہوئے بتایا تھا کہ گورکھپور کے قریب ان کی چھوٹی موٹی ریاست ہے جہاں ان کا وقت دو چیزوں سے کٹتا ہے، شکار اور شطرنج، لکھنؤ کبھی کبھی سیزن میں ریس کھیلنے آجاتے ہیں۔

"کہیئے کنور جی ـــ آپ اپنے علاقے سے کب آئے ؟"

"مجھے آئے تو ڈھیر سے دن ہو گئے۔ اب تو واپس بھی جانے والا ہوں "

"ارے"۔ جمال تکلفاً بولا "میری بد قسمتی ہے کہ آپ سے اتنی دیر میں ملاقات ہوئی"۔

"اوہ، نو نو ــــ مہربانی ہے آپ کی"۔ کنور جی نے چور نظروں سے عطیہ کی طرف ایک بار دیکھا اور جمال سے پگھل کر بولے "آیئے تھوڑا آپ کے ساتھ واک کر لیں"۔

"بالکل بالکل ــــ" جمال فوراً بول اٹھا "آپ کو کوئی جلدی تو نہیں ہے۔

"ارے جمال صاحب آپ نے ہماری طبیعت نہیں پہچانی ــــ ہم نے تو آج تک کوئی جلدی والی بات ہی نہیں کی۔ ہم سے اگر موت بھی جلدی کرے تو ہم انکار کر دیں گے، ہی ہی ہی"۔ وہ عطیہ کی طرف دیکھ کر بے ڈھنگی ہنسی ہنسا اور پھر یک بارگی سنجیدہ ہو کر بولا۔

"دیکھو موت کے نام پر یاد آیا۔ ہاں مسٹر جمال یہ تو بولو کہ تم نے اپنا بیمہ کرایا یا نہیں۔

"جی نہیں ــــ لیکن ارادہ ضرور ہے"۔

"اچھا ــــ" کنور جی تقریباً اچھل پڑے "ویری گڈ ونڈرفل آئیڈیا۔ ارے بھائی اسی سال ہم نے سب نپٹا دیا۔ پچاس ہزار کی چھوٹی سی پالیسی لے ڈالی، لیکن ایک بات ہے"۔ وہ گمبھیر چہرہ بنا کر بولے، "کسی ایسی ویسی کمپنی کے چکر میں نہ پڑ جانا۔ اور پھر نئے دھندے والی کمپنیاں تو سب بکواس ہیں اپن نے تمھارے یہاں کی کمپنی میں کرایا ہے"۔

"میرے یہاں کی کمپنی میں ــــ؟ جمال نے تعجّب سے پوچھا"۔

"ہاں جی ــــ وہی کیا نام ہے تمھاری

بمبئی والی۔ مائی گاڈ کیا گریٹ کمپنی ہے، میں نے اس کے دفتر کا فرنیچر دیکھا تو دل خوش ہو گیا۔ میں تو کہتا ہوں کہ تم بھی جھٹ سے بیمہ کروا ڈالو۔ مگر اسی کمپنی میں سمجھے ۔۔۔؟"

"جی ہاں میں بھی یہی سوچتا ہوں ۔۔۔ تو پچاس ہزار پالیسی کافی ہو گی؟"

"پچاس ہزار ۔۔۔؟" کنور جی نے جمال کی طرف غور سے دیکھا۔" اوہ، بیوٹی فل وہاٹ اے لکی فیلو یو آر ۔۔" پھر کنور جی نے انشورنس کے فوائد اور نقصانات پر روشنی ڈالنا شروع کر دی جس میں فوائد ہی فوائد تھے وہ بہت تند اور تیز لہجے میں بات کر رہے تھے۔ اسی تندی اور تیزی کے ساتھ ان کے قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ عطیہ کبھی کبھی اچٹتی نظروں سے ان کی طرف دیکھ لیتی تھی، جمال تو جیسے کچھ دیر کے لیے اپنی ذہنی الجھنوں سے نجات پا چکا تھا۔ بلکہ اب تو اسے امید کی ایک ہلکی سی جھلک بھی نظر آ رہی تھی۔ کچھ دور چل کر وہ دونوں اوپن ائر رسٹوران کے قریب آ گئے۔ اس نے دیکھا کنور جی کے قدم ارادتاً اسی طرف اٹھ رہے تھے اور پھر تینوں اوپن ائر رسٹوران میں تھے۔ کنور جی نے بہت اخلاق کے ساتھ کرسی کھینچ کر عطیہ سے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاکر بیٹھنے کا اشارہ کیا اسکے بعد خود بھی بہت شاہانہ انداز میں بیٹھ گئے۔

"دیکھئے تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں تو شام کی چائے کے ساتھ کچھ کھانے دانے کا عادی نہیں ہوں ویسے آپ لوگ بتائیں۔"

"ارے نہیں کیوں زحمت کر رہے ہیں آپ۔" جمال نے رواداری برتی۔

"واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ میرے گڈ فرنڈ ہیں۔ اور پھر مس عطیہ مجھے کیا کہیں گی۔ اچھا زیادہ نہیں ایک پلیٹ بھنے ہوئے کاجوؤں کی منگالی جائے"

چائے کے علاوہ جب کاجو آئے تو کنور جی نے بھی اس میں سے ٹونگ ٹونگ کر کھانا شروع کر دیا۔ اور اپنے علاقہ کے باغات سے جو انھیں پچیس ہزار کا فائدہ ہوا تھا اس کی تفصیل بیان کرتے رہے۔

چائے پی کر جب وہ تینوں باہر نکلے تو موڑ پر انھیں پھر وہی بوڑھا اور اندھا فقیر ملا۔ جو اپنے سیدھے ہاتھ میں کٹورہ لیے صدائیں لگا رہا تھا:

"اندھے محتاج کو ایک پیسہ۔ بابا آنکھوں سے مجبور ہوں" کنور جی جب اس کے قریب سے گذرے تو ایک لمحہ کے لیے ٹھٹکے اور جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ان کی جیب سے ایک روپیہ نکلا۔ وہ بولے۔

"اوہ ٹوٹے ہوئے پیسے ختم ہو گئے، چلو یہی سہی، جب کسی کو دو تو اتنا دو کہ اس کے کام آئے" یہ کہہ کر انھوں نے وہ روپیہ فقیر کے کٹورے میں ڈال دیا۔ اور ان کا سینہ ذرا فخر اور بڑائی کے احساس سے کچھ اونچا ہو گیا اور وہ عطیہ کی طرف چور نظروں سے دیکھتے ہوئے پھر اپنی ٹائی درست کرنے لگے۔ جمال کو جیسے ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے جھپکے سے اپنی آنکھیں زمین پر گاڑ دیں اور جلدی سے بول اٹھا۔

"اچھا کنور جی اب آپ سے تفصیلی ملاقات کب ہوگی؟"

"جب آپ کہئے۔ ہم لوگ کل شام یہاں میٹ کر لیں۔ کیا خیال ہے؟

"کل۔ ہاں کل ہی سہی" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ پیچھے سے ابھی تک فقیر کی دعا دینے کی صدائیں آ رہی تھیں۔ جمال نے پھر پوچھا۔

"ویسے آپ ٹھہرے کہاں ہیں؟"

"میں کیا بتاؤں مسٹر جمال وہ اپنے ایک پرانے دوست ہیں جسٹس نصیر نیو حیدر آباد

میں ان کی کوٹھی ہے، وہ نہیں مانے، بولے، میرے ہوتے ہوئے کہاں ہوٹل وہوٹل کا جھگڑا لگاؤ گے۔

"اچھا اچھا:"

"اچھا تو مسٹر جمال اب چلوں گا۔ ٹیکسی بہت دیر سے انتظار کر رہی ہو گی" پھر وہ موم کی طرح پگھل کر اور ایک بدنما مسکراہٹ کے ساتھ کچھ لجاتے ہوئے عطیہ سے مخاطب ہوئے۔

"اچھا مس عطیہ آپ بھی آئیے گا نا ـــ اچھا گڈ بائی آل آف یو۔ اور ہاں جمال کل میں بات کروں گا۔ تم سے پالسی کے بارے میں۔ میرے پاس اس کمپنی کے کچھ فارم پڑے ہیں۔ میں تمھیں ساری چیزیں سمجھا دوں گا۔"

اور وہ تیز تیز قدم رکھتے ہوئے اپنے کندھوں کو دوبارہ اچھال کر آگے بڑھ گئے۔

اب وہ دونوں بنارسی باغ کی بارہ دری کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ بارہ دری کے پیچھے سورج تیزی کے ساتھ ڈھل رہا تھا۔ اور صنوبر کے سائے لمبے ہو گئے تھے بارہ دری کے سامنے لان تھا جہاں ۱۸۵۷ء کے زمانے کی ایک توپ رکھی ہوئی تھی اور جہاں پر روز شام کو ۷ بجے پولیس بینڈ بجتا تھا۔ اس نے لان کی طرف چلنا شروع کیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔

"بھئی کیا مصیبت ہے" عطیہ نے خاموشی توڑی "خدا کی قسم اس وقت تو دل چاہ رہا ہے کہ ایک کونے میں بیٹھ کر خوب روئیں۔ تمھیں تو رونے کی پریکٹس ہے نا ـــ"

"جی نہیں" جمال بولا: "مجھے تو معاف رکھئے" وہ جو کٹہرے میں بن مانس

بند ہے یہ کام وہ بڑی شائستگی سے کرے گا " یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔ اب وہ قدرے بے فکر ہو گیا تھا۔ اس نے ذرا پرشوق نگاہوں سے عطیہ کی طرف اتنے عرصے میں پہلی بار دیکھا۔ عطیہ کے بھرے بھرے گالوں پر بشاشت اور سرخی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اس کی کٹورے ایسی سیاہ آنکھیں کبھی اپنے میں ایک کشش لیے چمک رہی تھیں اس کی سنہری اور جھکتی ہوئی زلفیں اس کے شانوں پر جھول رہی تھیں اور جسم کے یونانی خدو خال سے چمٹی ہوئی ریشمیں ساڑی کی کسمساہٹ سے ایک ہلکا ہلکا خواب آور ترنم پھوٹ رہا تھا اس نے اپنے دل میں ایک مشہور فلسفی کا قول دہرایا۔

"اے خوبصورت عورت! تو آنکھ کے لیے جنت ہے۔

قلب کے لیے دوزخ —!!

اور جیب کے لیے ویرانی " وہ عطیہ کی آنکھیں اسی طرح کچھ دیر اور دیکھتا رہا کہ عطیہ نے اسے ٹوک دیا " لنگوج پلیز لنگوج "

" اوہ — آئی ایم سوری "

" دیکھیے مسٹر جمال یار " وہ ذرا ترنگ میں آ کر بولی " اب یہ سب گڑبڑ فیکشن نہیں چلے گا "

" پھر کیا چلے گا۔؟ "

" اب ایک ایک کپ چائے اور چلے گا۔؟ "

" جی — " وہ جیسے اچھل پڑا اور پھر یکبارگی سنبھل کر بولا " میرا مطلب ہو کہ اب بھی چائے کی ضرورت ہے، آخر تکلف کس بات کا، صاف صاف کیوں نہیں بتاتیں کیا بھوک لگی ہے؟ "

"یہی تو قصہ ہے" عطیہ کچھ منہ بنا کر بولی "اصل میں دوپہر کا کھانا آج میں نے گول کر دیا۔ اب، اس وقت بھوک کے مارے بڑا حال ہے"

"تو یوں کہو" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

"اچھا تو کیا کیا زہر مار کرو گی" اس نے دل میں کہا۔

"اچھا تو کیا کیا نوش فرمائیں گی آپ؟" اس نے کہا۔

"بس زیادہ نہیں ایک پلیٹ آملیٹ"

"آٹھ آنے" جمال نے دل میں حساب لگایا۔

"دو سلائز دو بٹر"

"آٹھ اور چھ چودہ آنے"

"اور چائے"

"چودہ اور چار۔۔۔" ایک روپیہ دو آنے۔ اور دو آنے ٹپ" وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا "چلئے سوا روپیہ ہو گیا"

"یا خدا میری مدد کر" اس نے ایک سرد آہ کھینچی "میں اتنی جلدی ہار نہیں مانوں گا۔ نہیں مانوں گا"

"آؤ چلو" عطیہ نے بے نیازی کے ساتھ کہا اور وہ مری مری رفتار سے ریسٹوران کی طرف چلنے لگا۔ ایک کونے میں بیٹھ کر اس نے ان تمام چیزوں کا آرڈر دے دیا۔ کس بھروسہ پر یہ خود بھی نہیں جانتا تھا"

"تم نہیں کچھ کھاؤ گے"

"بالکل نہیں بس صرف چائے پیوں گا" وہ دھیرے سے بولا اس کا ذہن

تیزی کے ساتھ گھومنے لگا۔ اس نے اپنی جیب سے رومال نکال کر ماتھے کا پسینہ پونچھا۔
"کیا کیا جائے۔ سوا روپیہ" بار بار اس کے دماغ پر کوئی ہتھوڑے مار رہا تھا۔
ایک بارگی اس کے ذہن میں ایک عجیب ہی خیال آیا۔ بہت ہی انوکھا جس کے احساس سے پہلے وہ لرزا اٹھا لیکن پھر اس نے اپنے دل سے سوال کیا "آخر اس بات میں حرج ہی کیا ہے؟ وہ فقیر صبح سے مانگ رہا ہے۔ ایک ایک پیسہ کر کے اسے اتنے تو مل ہی گئے ہوں گے کہ وہ اس وقت اپنا پیٹ بھر لے.... اور اب تو کافی اندھیرا ہو گیا ہے، دوسرے وہ فقیر اندھا بھی تو ہے، دونوں آنکھوں سے اندھا، اگر اس روپے کو نکال لیا جائے.......... یک بارگی اس کے بدن میں جیسے کرنٹ دوڑ گیا۔ مگر اس نے پھر سنبھل کر اپنے آپ سے دل ہی دل میں جرح کرنا شروع کر دی:
"یہ بات قطعی غلط نہیں کیونکہ اس وقت اس فقیر کے لیے اس روپے کی اتنی اہمیت نہیں ہے جتنی میرے لیے، اگر میں اس روپیہ کو اس کے کٹورے سے نکال لوں تو شاید اسکے لیے کوئی فرق نہ پڑے۔ لیکن میری لاج رہ جائے گی...... ورنہ ان چھ آنوں میں کیا ہوگا" یہ سوچ کر اس نے اپنی پتلون کی ریزگاری بجائی: "لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے" اس کے دل کے گوشے سے کوئی بولا "کسی شریف آدمی کا دل اسے کیسے گوارا کرے گا، کوئی اصول، کوئی نظریہ اسے اچھی بات نہیں کہہ سکتا"
"ہش" اس کے دل کے کسی گوشے سے کسی نے پھر اسے سنبھالا دیا "کیسی بچوں کی سی باتیں ہیں یہ۔ جذبات کو اس انداز میں اچھے اور برے دو خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا، دنیا کے کسی بھی اصول کا جسم پوجنا حماقت ہے، بہت بڑی لغویت بغور سے دیکھا جائے تو ہر اصول اپنے میں ایک روح رکھتا ہے اور ہمیں یہاں صرف اسی

سے مطلب ہے ـــ آخر اس روپے کو ایک قرض کی نوعیت سے بھی تو دیکھا جا سکتا ہے
میں اس کا روپیہ کھا تھوڑا ہی جاؤں گا، یا یہ روپیہ میری زندگی کا آخری روپیہ تو
ہو گا نہیں۔ اگر آج ایک نکال رہا ہوں تو کل چار ڈال جاؤں گا۔ مع سود کے ادا کر دوں
گا۔ وہ فقیر روز ہی یہاں آتا ہے اور اس سے اس اخلاقی اصول پر کیا اثر پڑتا ہے ــ"
اور پھر اس نے فیصلہ کیا۔

"عطیہ ذرا ایک منٹ ـــ میں ابھی آیا" وہ آہستہ سے بولا اور اٹھ کر چلا گیا۔

سرمئی اندھیرا چاروں طرف پھیل گیا تھا، اور بارہ دری والے لان
پر پولیس بینڈ کوئی دھن بجا رہا تھا، جس کی دھن پر چلنے والا خواہ
مخواہ ہولے ہولے قدم رکھتا ہے۔ دور پر چلڈرنس پارک میں بچوں کی آواز اب مدھم
ہو گئی تھی۔ کچھ دور چل کر وہ بوڑھے فقیر کے پاس آیا۔ بوڑھا فقیر کمر جھکائے لاٹھی کے
سہارے کھڑا تھا۔ اس کا سیدھا ہاتھ پھیلا ہوا تھا اور اس میں ایک کٹورہ تھا۔

"بابا ــ" وہ فقیر کے قریب آ کر بولا۔

"ہاں بیٹا ــ؟" فقیر نے دانت نکال دئے، جمال کا دل تیزی کے ساتھ حرکت
کر رہا تھا، وہ اپنے پر قابو پاتے ہوئے پھر بولا۔

"دیکھو بڑے میاں۔ میں تمھارے کٹورے میں اکنیّ ڈال کر ادھنّا اٹھائے لے رہا
ہوں ــ"

"لے لو بیٹا، لے لو، خدا تمھیں بہت سا دے، سدا آباد رہو ــ" جمال نے کنکھیوں
سے دیکھا کٹورے میں کچھ پیسوں اور ادھنوں کے درمیان ایک بڑا سا سفید سکّہ چمک
رہا تھا، اس نے ہاتھ بڑھایا اور دوسرے لمحے وہ سکّہ اس کی انگلیوں کی گرفت میں تھا

وہ ریسٹوران میں آکر کرسی پر بے جان سا بیٹھ گیا۔ اسے فخر تھا کہ وہ اپنی ہار نہیں مانا تھا، اس کے ماتھے پر پسینہ کے چند قطرے ابھر آئے تھے، اس نے جیب سے رومال نکال کر ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ اور چہرے پر اطمینان اور سکون کے آثار لاتے ہوئے دھیرے دھیرے چائے کے گھونٹ لینے لگا۔ عطیہ واقعی بہت بھوکی تھی، اس کا چھری کانٹا بہت تیزی کے ساتھ...... آملیٹ اور سلائز پر چل رہا تھا۔ چند ہی منٹ بعد وہ کھا پی کر کھڑی ہو گئی۔ پھر وہ کاونٹر پر بل پے کرنے کے لیے بڑھ گیا۔ بیرے نے پرچ میں بل رکھ کر جمال کے آگے بڑھا دیا۔

"ایک روپیہ چار آنے۔ اس نے بل کی طرف دیکھا اور جیب کی ریزگاری کے ساتھ روپیہ شامل کر کے پرچ پر رکھ دیا، بیرے نے ریزگاری دیکھی، اور پھر روپیہ جمال کے آگے بڑھاتے ہوئے بولا"

"حضور یہ روپیہ دیکھ لیجئے"

"کیوں کیا ہوا؟ جمال نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر روپیہ لے لیا۔

"دوسرا دے دیجئے۔ یہ کچھ خراب ہے"

"ارے" جمال بڑی مشکل سے اپنے کو سنبھال سکا وہ روپیہ...... قطعی رانگے کا تھا۔ اس نے اپنے پیچھے گھوم کر دیکھا، عطیہ کا چہرہ اب سے' ایک سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔ جمال نے نچلا ہونٹ اپنے دانتوں کے نیچے دبا لیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک لمحہ کے لیے کنور سراجی سائے کی طرح لہرا گئے، جنھوں نے پچاس ہزار کی پالسی لی تھی۔

"پچاس ہزار کی پالسی" جمال بڑبڑایا " ذلیل۔ کمینہ۔ بیمہ ایجنٹ کا بچہ"

"تمھارے پاس ہے کچھ عطیہ۔؟" وہ تقریباً ہار مانتے ہوئے بولا۔ "کیا بتاؤں عطیہ میں کمرے سے یونہی جیب میں ڈیڑھ روپیہ ڈال کر چلا آیا تھا۔ سوچا تھا، سگریٹ پان کے لیے کافی ہوگا، مجھے کیا معلوم تھا کہ کمبخت، یہ روپیہ خراب ہے۔" عطیہ سٹ پٹا کر بولی۔

"میرے پاس تو دس روپے کا نوٹ تھا مگر میں نے ایک کتاب کے لیے یونیورسل بک ڈپو میں ایڈوانس جمع کر دیا۔

"تو پھر — ؟" وہ آہستہ سے مینیجر کی طرف بڑھا۔

"دیکھئے مسٹر" وہ مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے مخاطب ہوا۔

"ہمیں بڑا افسوس ہے جناب۔! اگر آپ ہم پر اعتبار کریں تو ہمارا یہ بل کریڈٹ میں ڈال لیں، ہم نے پہلے یہ روپیہ نہیں دیکھا تھا۔ اور اس وقت ہمارے پاس اور کوئی پیسہ نہیں، لیکن ہم وعدہ کرتے ہیں کہ کل صبح آپ کا بل پے ہو جائے گا۔"

"کوئی بات نہیں" مینیجر نرمی سے بولا "جب آپ کے پاس ہووے دیجیے گا، ہوٹل آپ ہی کا ہے۔" اس نے مینیجر کا شکریہ ادا کیا، بیرے کو ٹپ دیکر وہ مردہ قدموں سے آگے بڑھ گیا۔ عطیہ اس کے پہلو میں چل رہی تھی اور ساری کے پلّو سے منھ چھپائے شرارت سے مسکرا رہی تھی، وہ خاموشی سے گردن جھکائے تیز تیز قدموں کے ساتھ چلتا رہا۔ اس نے عطیہ سے نگاہیں نہیں ملائیں۔ عطیہ نے کبھی کوئی بات نہ کی، بس وہ ساری کا پلّو دبائے چپکے چپکے مسکراتی رہی۔ اندھیرا اب گہرا ہو گیا تھا، روش کے کنارے لگے ہوئے قمقمے روشن ہو گئے تھے۔ ہر طرف ایک سکوت تھا۔ ایسی حالت میں اسے عطیہ کے ساتھ اپنا تنہا وجود بے حد کھل رہا تھا، وہ چاہ رہا تھا کہ جلد از جلد

بنارسی باغ کے بڑے پھاٹک سے نکل کر ہجوم میں شامل ہو جائے۔
"کتنی بری بات ہوئی — آئندہ احتیاط رکھنا پڑے گی۔" وہ آہستہ سے بولا۔
عطیہ سنتی رہی۔ "مگر یہ روپیہ آخر میرے پاس آیا کہاں سے۔ پچھلا دس روپیہ کا نوٹ
میں نے شاید چیپ مارٹ سے بھنایا تھا۔ ہاں یاد آیا۔ ایک ڈبہ پالسن بٹر خریدا
تھا۔" وہ کہتا رہا اور عطیہ خاموشی سے سنتی رہی۔ جمال نے پھر گردن جھکا لی، بڑا
پھاٹک نظر آرہا تھا۔ جس کے دونوں کھمبوں پر بجلی کے بڑے بڑے قمقمے جل رہے تھے۔
پھاٹک کے باہر بوڑھے فقیر کی جانی پہچانی آواز کی دھیمی دھیمی صدائیں آرہی تھیں۔
جمال نے اس آواز کی طرف کان لگائے۔
"بابا ہم اندھے محتاج کو ایک پیسہ۔"
"آنکھوں سے لاچار ہوں۔" جمال نے سوچا، میں نے کس قدر رذالت کا ثبوت
دیا، لیکن یہ کمبخت کنور مسرا کیا کم ذلیل تھا۔ جمال کی مٹھی میں ابھی تک وہ روپیہ
پھنسا ہوا تھا، اس کے جی میں آیا کہ وہ اسے پوری طاقت سے ایک طرف پھینک
دے اس نے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ فقیر کی آواز اور قریب ہو کر اسے صاف سنائی
دینے لگی۔ اس نے سوچا کیوں نہ یہ روپیہ اسی کو لوٹا دیا جائے، کیوں نہ اسے اس کی
جگہ پہنچا دیا جائے۔ اور پھر وہ جیسے ہی بڑے پھاٹک سے باہر نکلا۔ اس کی نظر بوڑھے
فقیر پر پڑ گئی۔ وہ اسی طرح کمر جھکائے اور کٹورہ سامنے کیے صدائیں لگا رہا تھا۔
"ایک پیسہ بابا۔ ہم اندھے محتاج ہیں۔" اس کے کٹورے میں پیسے اور دھنے
پڑے تھے، جمال جب اس کے قریب سے گزرا تو اس نے نظر بچا کر اس کے کٹورے
میں وہ روپیہ ڈال دیا۔ کٹورے سے چھن کی آواز آئی، عطیہ نے چونک کر جمال

کی طرف دیکھا۔
"کیا تم نے بھی روپیہ خیرات کر دیا؟" وہ مسکرا کر بولی۔
"ہاہاہا" جمال ایک کھوکھلی ہنسی ہنسا اگر اس نے عطیہ کے جملے میں چھپے ہوئے زہر کو محسوس کر لیا تھا، لیکن اس نے سوائے ایک کھوکھلے قہقہے کے کوئی جواب نہ دیا کیونکہ اب سب کچھ جائز تھا، فقیر نے اپنے کٹورے کی آواز سن لی تھی۔ ایک لمحہ بعد جب جمال اور عطیہ آگے نکل گئے تو وہ اپنی کمر سیدھی کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس کی منڈی منڈی بھویں ایک بار سکڑیں اس کے کانوں میں آہستہ سے حرکت ہوئی اور چھپاتے ہوئے دیدے جن کی پلکیں غائب تھیں کھل گئے۔ اس نے اپنے سوکھے ہوئے ہاتھ سے کٹورے میں سے ٹٹول کر روپیہ نکالا۔ اور آنکھوں کے قریب لا کر غور سے دیکھا
" اس کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر ایک کڑوی مسکراہٹ دوڑ گئی، وہ دھیرے سے بولا" دھت تیرے کی۔ سالا پھر واپس آ گیا۔

▬ ▬

دلِ چارہ گر

ذاکر منزل کی ڈیوڑھی پر جب مختار میاں نے آواز لگائی تو اندر عورتوں میں کھسر پھسر ہونے لگی۔ اور اندر سے جواب ملنے کے لیے انھیں دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ جاڑے کی رات تھی، محلے کی تنگ و تاریک گلیاں ٹھٹھری ہوئی تھیں۔ اور نکڑ پر لگی ہوئی لالٹین کی لو کانپ رہی تھی اور ہر طرف گہرا کہرا پھیلا ہوا تھا۔ گھروں کے دروازے بند تھے۔ رات زیادہ نہیں گئی تھی لیکن سردی کی شدت نے لوگوں کو لحافوں میں سرِشام ہی سے چھپا دیا تھا۔ جہاں وہ سب اپنے اپنے کمروں میں انگیٹھیاں رکھے گپیں ہانکنے میں مصروف تھے۔ مختار میاں اکیلے ہی اندھیرے میں دروازے کے سائبان کے نیچے سردی میں کھڑے بیڑیاں سلگا رہے تھے۔ اور ان کے چوڑے چکلے سینے سے بھورے رنگ کا گرم شال لپٹا ہوا تھا۔ جب مختار میاں کو اسی طرح کھڑے کھڑے کافی دیر ہوگئی تو انھوں نے جھنجلا کر دروازے کی کنڈی ایک بار پھر کھٹکھٹا دی۔

اندر سے آواز آئی — "اچھا" مختار میاں بے چینی سے ٹہلنے لگے۔ اس وقت وہ کچھ زیادہ فکرمند نظر آرہے تھے۔ اتنی دیر میں ذاکر منزل کے سب سے بڑے دروازے کی بوسیدہ چولیں چرچرائیں اور کسی بڑھیا نے ذرا سا سر باہر نکال کر پوچھا۔

"کون، مختار میاں؟"

"جی" مختار میاں دروازے کے قریب آگئے۔ عورت نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔

"آؤ اندر آجاؤ" مختار میاں دروازے کے اندر چپکے سے داخل ہو گئے۔ ڈیوڑھی میں اندھیرا دور کرنے کے لیے ایک چھوٹا سا چراغ روشن تھا جس کی روشنی میں دھندلاہٹ تھی۔ بوڑھی عورت ٹٹول ٹٹول کر ڈیوڑھی کو پار کر کے پہلو والے کمرے کی طرف جانے لگی۔ مختار میاں بھی خاموشی کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے، کمرے میں پہنچ کر بوڑھی عورت نے ایک لمبی سی سانس لی۔ اور پھر محبت اور خوف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ مختار میاں کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر خاموشی رہی، مختار میاں گردن پھرا کر کمرے کا جائزہ لے رہے تھے۔ کمرے میں کافی روشنی تھی اور اس روشنی میں مختار میاں کے چہرے پر ابھری ہوئی دو ہڈیاں اور سیاہ حلقوں میں چمکتی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جن میں جگنوؤں جیسی چمک تھی اور لانبی لانبی گھنی مونچھیں بالکل صاف نظر آرہی تھیں، ان کے اونچے اور گندمی رنگ کے ماتھے پر سیاہ رنگ کا رومال بندھا ہوا تھا۔ یہ رومال اکثر اُن کے سر پر بندھا دکھائی دیتا جس پر تیل سے چیکٹ سیاہ بالوں کے لچھے پڑے رہا کرتے، کمرے کی فضا بالکل جامد اور خاموش تھی، بوڑھی عورت بار بار آنکھیں اٹھا کر مختار میاں کی طرف دیکھتی تھی، اس کے جھریاں پڑے ہوئے ہونٹ کپکپا رہے تھے

تھے اور وہ سہمے ہوئے انداز میں گردن گھما کر کمرے کے چاروں طرف دیکھنے لگتی۔
آخر کار اُس نے کھنکار کر بولنا شروع کیا۔
" تم جانتے ہو آج چھ روز سے لڑکی کو لئے بھتیجے کے گھر پر روٹیاں توڑ رہی ہوں۔ میں نے تم سے چلتے وقت ہی کہہ دیا تھا کہ خدا کے لیے یہاں نہ آنا۔ حیدر تمھارا ایک منٹ کا روادار نہیں اگر دیکھ لیا تو تمھیں الٹے پیروں واپس کر دے گا۔ مگر تم ایک ڈھیٹ ہو یہاں بھی میری بوٹیاں نوچنے آگئے۔"
" مجھے دس روپے چاہئیں۔" مختار کی آواز نکلی ___ سیدھی سپاٹ اور بے لوچ آواز۔ اور ان کی بڑی بڑی مونچھوں کے نیچے سے ان کے دانتوں کی سیاہ جڑا زیں چمک اٹھیں اور سامنے کا اوپر والا دانت بھی چمک اٹھا جس پر پیتل کی پتّی منڈھی ہوئی تھی ___ بوڑھی عورت سارے بدن سے کانپنے لگی۔ مختار میاں اُس کے اور قریب آگئے۔ وہ دھیرے سے بولی۔
" خدا کے لیے تیرے ہاتھ جوڑوں مختار یہاں سے چلا جا۔ میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ مکان ہاتھ سے نکل گیا۔
" کُل ۷۵ روپے ملے تھے۔ ان میں سے چالیس تو تُو نے ہی اَللّے تللّے اڑا دیئے"
" بک بک نہ کر۔" مختار میاں کی کرخت آواز ابھری ___" مجھے بالکل فرصت نہیں، مجھے دس روپے دے۔"
بوڑھی عورت گڑ گڑانے لگی۔" دیکھ مختار میں تیری منّت کرتی ہوں۔ غیر گھر میں فساد نہ کھڑا کر، لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ قسم ہے حضرتِ عباسؑ کی میرے پاس ڈلی تمباکو کے لیے بھی اب کچھ نہیں رہ گیا۔"

"چلیں ہیں نہ کراماں۔ میں کوئی بات نہ سنوں گا" مختار میاں گرجے۔ بڑھیا سہم گئی اور بولی۔

"آہستہ بول مُردے۔ حیدر گھر میں موجود ہے۔ سُن لیا تو میری اور فاطمہ کی چُٹیا پکڑ کر نکال باہر کرے گا"

"میں نے کہہ دیا کہ میں کچھ نہیں سنوں گا" بوڑھی عورت سپٹا گئی۔ اپنی کمر سے جلدی سے ایک میلا سا کپڑے کا بٹوا نکالا۔ اور اُسے ٹٹولتے ہوئے گلوگیر آواز میں بڑبڑانے لگی — "تیرے دیدے میں ذرا سا خوف نہیں ہے، کلیجے میں چھالے ڈال دیئے، گھر میں جھاڑو پھیر دی۔ خُدا کی مار اِن کرتوتوں پر" مختار میاں نے بڑھ کر بڑھیا کے ہاتھ سے بٹوہ چھین لیا اس میں دو روپے کا نوٹ رکھا تھا نکال کر بٹوا اس کے سامنے پھینک دیا۔ اتنے میں اندر سے کپڑوں کی سَرسَراہٹ اور چوڑیاں بجنے کی ہلکی ہلکی آواز آئی اور کسی کی جوان اور کھنکدار آواز سُنائی دی۔

"بی امّی پان لے جایئے —" بوڑھی عورت نے سانس روک لی۔ جب وہ اندر جانے لگی تو مختار میاں بولے —

فاطمہ کو ذرا بھیج دینا — مجھے اس سے کچھ باتیں کرنا ہیں" بوڑھی عورت اندر چلی گئی اور پھر مختار میاں کے کان میں اندر سے آنے والی ہلکی ہلکی گھنگھروں جیسی آوازیں ابھرتی رہیں۔

"ہائے اللہ کتنی سردی ہے آج"

"چلو شہنا امام باڑے میں چل کر بیٹھیں — بھائی میاں امام باڑہ سجا رہے ہیں۔"

"اِے ہی بچّی میں لے اب تک اپنی چوڑیاں ٹھنڈی نہیں کیں"

"اے فاطمہ کی بچی، کل میرا دوپٹہ کالا رنگ دینا۔" اور پھر گھنگرو تیزی سے بجنے لگے۔ مدھم مدھم پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگیں۔ دبے دبے ترنم خیز قہقہے۔

"اری چڑیلو آہستہ زور سے ہنستی ہو۔ گھر میں علم کھڑے کیے جا رہے ہیں۔ آقا مولا خفا ہو جائیں گے۔" پھر گالوں پر ہلکے ہلکے طمانچے مارنے کی آوازیں آئیں اور سرگوشیاں ہونے لگیں۔ مختار میاں نے تیزی کے ساتھ ایک بار سارے کمرے کا جائزہ لیا۔ سامنے دیوار پر ایک کھلی ہوئی الماری تھی؛ اس میں بجلی کا ایک ٹیبل لیمپ اور ایک مرادآبادی ٹفن کیریر رکھا تھا۔ مختار میاں نے ان دونوں چیزوں کو جلدی سے اٹھایا اور پھرتی کے ساتھ ڈیوڑھی پار کر کے دروازے کے پاس آئے اور گردن نکال کر آہستہ سے سیٹی بجائی۔ باہر اندھیرے سے ایک آدمی نکلا، مختار میاں نے اسے وہ دونوں چیزیں تھما دیں اور وہ پھر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ مختار میاں ایک لمبی سی سانس لیکر پھر کمرے میں آکر بیٹھ گئے ______ تھوڑی دیر بعد سانولی سی لڑکی اندر داخل ہوئی، اس کے جسم میں چستی تھی اور تنا ؤ تھا۔ اس کا سر دوپٹے کے پلو سے ڈھکا ہوا تھا اور بالوں کی لمبی سی چوٹی بہت نیچے تک لٹک رہی تھی اُس کے چہرے پر اداسی اور تھکن کے آثار تھے اور آنکھوں میں بلا کا تجسس، وہ بہت چپکے سے مختار میاں کے پاس آکر آنکھیں نیچی کر کے کھڑی ہو گئی۔ مختار میاں اس کے قریب آ گئے۔ اس کے سر پر آہستہ سے ہاتھ رکھا۔ چند لمحوں کے لیے ان کے چہرے کی وہ کرختگی نہ جانے کہاں ڈوب گئی۔ انھوں نے اس کی ٹھوڑی کو اپنے ہاتھ سے اونچا کر کے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ کر آہستہ سے پوچھا۔

"کیا بات ہے۔ فاطمہ۔۔؟"

"کچھ نہیں ___" فاطمہ کی گھٹی ہوئی آواز نکلی اور اُس نے سہمی ہوئی نگاہوں سے مختار میاں کی آنکھوں میں دیکھا۔ مختار میاں نے پھر پوچھا۔

"تو یہ بات اماں کو معلوم تھی؟"

"کیا ___" فاطمہ کی بڑی بڑی کاجل لگی آنکھیں پوری کھل گئیں۔

"بات تو کھل چکی ہے۔ اب کیوں چھپا رہی ہو؟" مختار میاں کے چہرے پر دہ کر خستگی ابھری اور ڈوب گئی۔

"کیسی بات بھائی جان؟"

"میرے پاس وقت نہیں ہے۔ مختار میاں کے لہجہ میں کرختگی پیدا ہو گئی ___ "دوسرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر یہ باتیں پیچ دے کر کرنے کے لائق نہیں ہیں۔ میں ہر بات کا جواب صاف اور مختصر سننا چاہتا ہوں" یہ کہہ کر مختار میاں نے ایک لمبی سی سانس لی اور دھیرے سے بولے۔

"شبّو سے تم کب سے مل رہی ہو؟ اس کے پاس تمھارے کتنے خط ہیں؟"

جواب میں خاموشی رہی۔

"اماں نے میری غیر موجودگی میں اسے کتنی بار گھر پر بلا کر ناشتہ کرایا ہے، بولو؟"

کمرے کی ہر چیز جامد تھی، ٹھٹھری ہوئی اور خاموش ___

"اماں نے شبّو سے کون کون سے وعدے کیے ہیں؟" مختار میاں نے پھر سوال کیا، اب کمرہ خاموش نہیں تھا فاطمہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا اور وہ سسکیاں بھر کر رو رہی تھی، مختار میاں کی آنکھیں جھک گئیں، انھوں نے بڑی شفقت سے اپنا ہاتھ بڑھا کر فاطمہ کے سر پر رکھ دیا اور بڑے نرم لہجہ میں بولے۔

" مجھے بہت دیر سے معلوم ہوا فاطمہ تو بہت بھولی ہے۔ اور اماں تو بالکل پاگل

ہیں وہ تو بس ایک ہی بات جانتی ہیں لڑکا سیّد ہو، قوم کا کھرا۔ چاہے جواری ہو

بدکار ہو کچھ بھی ہو، میں شبّو کو جانتا ہوں، وہ میری طرح سیّد ضرور ہے مگر میری

طرح اوباش بھی بالکل قلانچ بھی نہ گھر نہ بار ایک پیر جیل میں تو ایک باہر وہ کسی اور کو

کیا سہارا دے گا۔ اماں تمھیں ایک سیّد کے پلّو سے باندھ کر بھیک منگوانا چاہتی

ہیں تم اس کے لیے تیار ہو۔؟"

کمرے میں دبی دبی کرب ناک سسکیاں تیز ہو گئیں تھیں۔ مختار میاں نے

فاطمہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے آہستہ سے دبایا۔

"بولو فاطمہ —— میں لاکھ برا سہی، تمھارا بھائی ہوں۔ مجھ سے صاف

صاف کہہ دو —"

"........"

"بولو تم اپنا خیال بدل سکتی ہو؟"

"بھائی جان ——" فاطمہ چیخ کر مختار میاں کے سینے سے لگ گئی۔ اور بڑی

تھکی ہوئی آواز میں سسکیوں کے ساتھ اتنا ہی کہہ سکی۔

"بہت دیر ہو چکی ہے بھائی جان —— ویسے آپ کی مرضی"

"مختار میاں نے آہستہ سے اس کی پیٹھ تھپتھپائی اسے اپنے سینے سے الگ

کیا اور بڑبڑانے لگے: " مجھ سے کوئی خوش نہیں ہے میں ہمیشہ خاندان کی ناک

کاٹتا رہا ہوں تم بھی مجھے زندگی بھر کوستی دو گی۔ لیکن میں نہیں چاہتا کہ تم

شبّو کے ساتھ بھاگ جاؤ، بات بڑی سخت ہے مگر میں دنیا دیکھے ہوئے ہوں،

خود میری زندگی بھی یہی رہی ہے۔ لیکن تم اطمینان رکھو، جو تم چاہتی ہو وہی ہوگا مگر یوں ہرگز نہیں۔ اب تم جاسکتی ہو۔"

کمرے میں خاموشی پھیل گئی۔ فاطمہ سر جھکائے کمرے سے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب مختار میاں کی بوڑھی ماں پان لے کر کمرے میں آئیں تو کمرہ خالی تھا۔ مختار میاں جا چکے تھے ——— اور جب کچھ دیر بعد امام باڑے میں روشنی کے لیے بجلی کے لیمپ کی ضرورت ہوئی اور وہ باہر کے کمرے میں ڈھونڈا گیا تو دونوں چیزوں کے غائب ہونے کا انکشاف ہوا۔ انھیں سارے گھر میں تلاش کیا گیا مگر نہ ملیں۔

"کوئی جنات تو کھا نہیں گئے۔ کمرے میں ہی رکھیں تھیں دونوں چیزیں" گھر کی عورتیں بڑبڑائیں۔

"کوئی اور آیا گیا بھی نہیں ——— کیوں بی امّی؟ کچھ دیر پہلے آپ مختار میاں سے باہر کے کمرے میں باتیں کر رہی تھیں نا؟"

بوڑھی بی امّی نے اپنے کو لاکھ سنبھالا مگر غش آگیا۔ دانت بھنچ گئے اور وہ کھڑے قد سے فرش پر گر پڑیں۔

حیدر صاحب تک یہ بات پہونچ چکی تھی جسے سُن کر حیدر میاں کے منھ سے کف جاری تھا اور وہ طیش کے مارے سارے کمرے میں ٹہلتے ٹہلتے پھر رہے تھے اور اپنی بیوی سے کہہ رہے تھے۔

"یہ مختار اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے گا۔ خالہ اماں سے کتنی ہی بار کہہ چکا ہوں کہ آپ یہاں چاہیں تو زندگی بھر رہ سکتی ہیں مگر اپنے ذلیل سپوت کو یہاں بلانے

کی ضرورت نہیں۔ میں محنت سے روپیہ اس لیے کماتا ہوں کہ امن کے ساتھ رہ سکوں۔
میں نے دنیا بھر کا ٹھیکہ نہیں لیا ہے جو جیسا کرے گا اس کا ویسا انجام ہوگا مری عزّت پر کوئی ڈاکہ کیوں ڈالے۔"

دوسرے کمرے میں بوڑھی بی امّی پر بار بار غشی طاری ہوتی تھی اور وہ اپنی جوان لڑکی فاطمہ کو گلے سے لگا لگا کر روتی تھیں اور فاطمہ اپنی آنکھوں کے آنسو اور پھیلے ہوئے کاجل کو چپکے چپکے دوپٹہ کے پلّو سے پونچھ کر رہ جاتی۔ اس کے معصوم چہرے پر معاملہ کی نوعیت کو سمجھ لینے کے بعد پشیمانی کی لہریں دوڑ رہی تھیں اور وہ ماں کے پاس اپنا مجبور سا جسم اس طرح چرائے بیٹھی تھی جیسے اپنے خاندان کے بیچ ننگی کھڑی ہو۔ اس کا ذہن بالکل خالی تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ماں کو کس طرح تسلّی دے۔

تھوڑی دیر بعد ذاکر منزل میں سنّاٹا پھیل گیا۔

رات آہستہ آہستہ رینگتے جا رہی تھی۔ محلّے کے نکڑ پر لگی ہوئی لالٹین کی لَو مدھم ہونے لگی تھی۔ مختار میاں تنگ و تاریک گلیوں سے ہوتے ہوئے چوک پہنچے رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ تمبولیوں کے کوٹھوں پر طوائفیں اپنے مونڈھوں پر سے غائب تھیں۔ صرافے کی سب دوکانیں بند تھیں اور ان میں تالے لٹک رہے تھے اور ان کے برآمدوں میں آگ جلائے بوڑھے چوکیدار کمبل میں لپٹے ہوئے دھیرے دھیرے کھانس رہے تھے حنیف اپنی دوکان پر سرخ رنگ کی رضائی اوڑھے بڑی مستعدی سے بیٹھا پان بنا رہا تھا اور اس کے سر پر جلتا ہوا بجلی کا قمقمہ پھیلے ہوئے کہرے میں اونگھ رہا تھا۔ مختار میاں حنیف کی دوکان پر جا کر

رُک گئے۔ حنیف انھیں دیکھ کر مسکرایا۔ اور اپنے نیچے بچھی ہوئی گدّی سے ایک پرچہ نکال کر ان کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ رحمت دے گیا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ استاد سے کہہ دینا کہ میں قاسم کے اڈّے پر ملوں گا" مختار میاں نے پرچہ کھول کر پڑھا جس پر کچّے ہاتھ کی ایک مختصر سی تحریر درج تھی۔ مختار میاں نے اطمینان کا سانس لیا اور حنیف سے پوچھا۔

"شبّو آیا تھا یہاں؟"

"ہاں۔"

"کہاں گیا؟"

حنیف نے ایک آنکھ دبا کر اپنی دوکان کے اوپر والے کوٹھے کی طرف اشارہ کیا۔ مختار میاں نے اسے کوئی جواب نہ دیا اور بلا جھجک گردن اٹھا کر زینہ کے دروازے میں داخل ہو گئے۔ اوپر پہنچ کر انھوں نے آواز لگائی۔ فوراً ہی چھم چھم کرتی ایک عورت آئی اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ اور سلام کر کے ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ مختار میاں چپکے سے اندر داخل ہو گئے۔ سامنے پڑے ہوئے تخت پر قالین بچھا تھا۔ اور اس پر دیسی کھرّے کی خالی بوتل اور گلاس رکھا تھا۔ مختار میاں نے عورت کی طرف دیکھ کر کہا "یہ بوتل وغیرہ اٹھا کر ایک کونے میں رکھ دو میں تخت پر بیٹھوں گا۔"

"کیوں" عورت مسکرائی۔ "تم خود ہی اٹھا کر رکھ دو۔"

"میں ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔"

"خیریت تو، جسے منھ لگا لیا اسے ہاتھ لگانے میں شرم کیسی، کیا خدا نہ خواستہ کچھ طبیعت ...."

"یہ بات نہیں جی، تم جانتی ہو کہ محرّم بھر میں یہ سب نہیں چلاتا۔"

عورت مسکرا کر پھر سنجیدہ ہو گئی۔ مختار میاں نے سوال کیا "شبّو یہاں آیا تھا؟"

"ہاں ــــــ" وہ بولی "تمھیں پوچھ رہا تھا۔ نشہ میں دھت تھا، اندر کوٹھری میں پڑ کر سو گیا ہے۔"

"نشہ میں ہے؟" مختار میاں نے تیور بدلے اور کوٹھری کی طرف بڑھ گئے۔ اندر ایک گٹھیلے جسم کا نوجوان تیل کے دھبّے پڑی میلی کچیلی دری میں لپٹا خرّاٹے بھر رہا تھا۔ مختار میاں نے اپنے نیفے سے اپنی مخصوص قرولی نکالی اور اس کی نوک سے شبّو پر ڈھکی ہوی دری کو الٹ دیا۔ سانولے سانولے کرخت مگر نوعمر چہرے پر بال اُلجھے ہوئے تھے اور موٹے موٹے ہونٹوں سے خرّاٹے نکل رہے تھے۔ مختار میاں نے اس کے سر کے بال پکڑ کر کس کے جھنجھوڑ دیا۔

"شبّو ابے شبّو۔ ابے اٹھ شبّو نے انگڑائی لی۔ سرد ہوا کے تیز جھونکوں سے اس کے بدن میں جھرجھری آ گئی۔

" ابے اٹھ سالے، تیرے نشے کی ماں کا۔" مختار میاں کی آواز پہچان کر شبّو کا نشہ ہرن ہو گیا۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ بڑی بڑی سرخ آنکھیں، الجھے ہوئے بال ابھرا ابھرا سینہ چہرے پر نوجوان خون کی سُرخی یہی شبو تھا۔ مختار میاں کی عقابی آنکھیں اس کے سراپا پر دوڑ گئیں۔ انھوں نے اپنی قرولی کمر میں پھنسا لی اور بولے۔

"کیوں بے، وہ معاملہ ٹھیک ہے نا ــ"

" بالکل ٹھیک ہے استاد۔ تم بے فکر رہو" شبّو کے دانت نکل آئے اور اس نے اپنی کمر سے آٹھ انچ لمبا چمکتا ہوا چھرا نکال لیا اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔ بس

تمھارے اشارے کی دیر ہے۔ تم دیکھنا استاد، اس طرح پیٹ میں اترے گا جیسے پکے ہوئے ٹماٹر میں سوئی۔"

"لیکن تم اس کام میں نہیں جاؤ گے۔؟"

"کیوں استاد؟" شبّو کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"میں حجّت نہیں چاہتا۔" مختار میاں نے تیور بدلے اور اپنے سینے پر لپٹی ہوئی چادر کے پلّو کو درست کرتے ہوئے چلے آئے۔ باہر رکشا والا ان کا انتظار کر رہا تھا وہ اس پر نوابوں کی طرح بیٹھ گئے۔ ان کے دماغ میں صرف دو تصویریں تھیں شبّو اور فاطمہ۔ ان پر یہ راز آج ہی شام کھلا تھا وہ جب گھر گئے تھے تو باہر دروازے پر انھیں تالہ لگا ملا تھا۔ ماں فاطمہ کو لے کر حیدر صاحب کے یہاں چلی گئی تھیں۔ وہ کسی نہ کسی طرح سے مکان کی کچی دیوار پر پچھواڑے سے چڑھ کر اندر کود پڑے تھے اور کوٹھری میں جا کر انھوں نے جب اپنی پیٹی سے کپڑے نکالنا چاہے تھے تو ان کو فاطمہ کی اٹیچی میں چھوٹا سا کھٹکے دار تالہ لگا نظر آیا تھا اس سے پہلے اس اٹیچی پر کبھی تالہ ـــــ مختار میاں نے نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے خواہ مخواہ مختار میاں کو اٹیچی دیکھنے کی جستجو ہوئی اور انھوں نے ایک تار کے ذریعہ اس تالے کو کھول دیا اور جب اٹیچی کھلی تو مختار میاں کو کوئی خاص چیز نہ ملی۔ البتہ ایک کونے میں چار رومال تہائے رکھے تھے جن سے عطر کی بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی، اور جس کے کونوں پر خوبصورت پھولوں کے درمیان کڑھا تھا "شبّو" ان رومالوں کے نیچے دو چار پرچے رکھے تھے مختار میاں نے انھیں الٹ پلٹ کر دیکھا ان پر شبّو کے ہاتھ کی تحریر تھی۔ مختار میاں نے انھیں ایک ایک کر کے پڑھا ـــ "اماں کو راضی کر لو، آج سینما چلیں گے۔"

کسی خط کا نفس مضمون تھا "خدارا یہ شرم چھوڑ دو۔ ایک ہی بار صورت دکھا دیا کرو، اس رات میں گھنٹہ بھر دروازے پر کھڑا رہا تم ایک پان دے کر ایسی گئیں کہ واپس نہیں آئیں" مختار میاں نے ان خطوں کو یوں ہی رکھ دیا ۔ انھیں اپنے پڑوسی بوڑھی ننی جی کی باتوں پر اعتبار نہیں تھا۔ انھوں نے مختار میاں کو بہت پہلے اس خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ لیکن اب کسی کی گواہی کی ضرورت نہ تھی ۔ اسی لیے وہ جھنجلائے ہوئے فاطمہ سے ملنے گئے تھے۔ مختار میاں اور نہ جانے کیا سوچتے رہتے کہ رکشا کریم پورہ پہونچ گیا اور ان کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

کریم پورہ میں قاسم کا اڈّہ تھا۔

اس پراسرار علاقے کی گلیاں اور انھیں گھیرے ہوئے بوسیدہ عمارت سب اس جاڑے کی سنسان رات میں جیسے سردی سے اکڑے کھڑے تھے۔ یہ محلہ بہت قدیم تھا اور اس محلّے کے رہنے والے بھی قدیم اور اگلے وقتوں کے لوگ تھے۔ یہاں زیادہ تر مسلمان آباد تھے ــــ یہاں سے کربلا قریب تھی جہاں محرّم میں مجلس ہوا کرتی تھی اور نوجوانوں کی ٹکڑیاں ماتم پڑھتی ہوئی علم اٹھائے آیا کرتی تھیں۔ یہاں سے .... درگاہ بھی دور نہ تھی جہاں برقعہ اوڑھ کر اور ڈولیوں میں بیٹھ کر سیدانیاں آیا کرتی تھیں اور حضرت عباس کا علم پکڑ کر اور اس میں سرخ رنگ کے گلاوبے باندھ کر منتیں اور مرادیں مانگا کرتی تھیں۔ اس درگاہ میں بیبیاں علم کے پٹکے کے سائے میں چپکے چپکے آنسو بہایا کرتی تھیں اور اپنے دل کی مرادیں کہہ جاتی تھیں۔ اس محلّے میں نواب زادے رہتے تھے۔ ایسے نواب زادے جن کے گھروں کی عورتیں مصیبت کے وقت کوسنے اور منتیں مانگنے کے علاوہ اور کچھ نہ جانتی تھیں۔ اسی علاقے

میں قاسم کا اڈہ بھی تھا۔ جب مختار میاں اس اجاڑ اور ویران کھنڈر میں پہونچے جو چاروں طرف تاڑ کے لمبے لمبے پیڑوں سے گھرا ہوا تھا تو انھیں احساس ہوا کہ معاملہ سب ٹھیک ہے، وہاں رحمت قاسم، اور تقی وغیرہ کے علاوہ مختار میاں کے گروہ کے سب ہی آدمی موجود تھے۔ مختار میاں کو دیکھ کر ان سب کی آنکھوں میں تجسّس دوڑ گیا اور وہ لوگ مختار میاں کے قریب آگئے۔

"سب ٹھیک ہے — ؟ مختار میاں نے اپنے چاروں طرف گھور کر دیکھا۔

"سب ٹھیک استاد" سرگوشی ہوئی، مختار میاں ان سب کے بیچ میں کھڑے ہوئے تھے اور اس وقت اُن کے ہاتھ پیر اور ان کا قد ان سب سے زیادہ نمایاں اور واضح نظر آرہا تھا اور ان کی شخصیت سے ایک رعب وجلال ٹپک رہا تھا اور آنکھیں اس طرح گھوم رہی تھیں۔ جیسے دلوں کو ٹٹول رہی ہوں اور اپنے تجربات کی کسوٹی پر سب کو پرکھ رہی ہوں۔ یک بارگی مختار میاں ایک تندرست نوجوان کی طرف مخاطب ہوئے۔

"تم کیا خبر لائے رحمت ؟"

"استاد" رحمت سنبھل کر بولا" بات یہ ہے کہ استاد کہ مدحِ صحابہ کا جھنڈا کل صبح سات بجے اٹھے گا جس میں ایک گھنٹہ پہلے پہونچ کر مورچہ سنبھال لینا چاہیئے"

"ہونہ" مختار میاں نے قدرے عاجزی سے کہا" دیکھا جائے گا۔ جان دے دینا یا لے لینا مگر دیکھنا جھنڈا نہ اٹھنے پائے"

اس کے جواب میں ان سب کے چہروں پر ایک جوش اور ارادہ کا استحکام جھلکنے لگا۔ یک بارگی ان سب کی نظریں ایک کونے پر پڑیں، شبّو گم سم کسی فکر میں اُن

سب سے الگ تھلگ بیٹھا تھا۔ تقی جو عموماً شبّو پر آوازے کستا رہتا تھا بڑھ کر بولا ـــــ

"کیوں بے رانڈ کے سانڈ، تیری قردلی میں کیا زنگ لگ گیا ہے ۔ تو کیوں چپ بیٹھا ہے ؟"

"استاد سے پوچھو" شبّو قدرے ضبط کرکے بولا۔ سب لوگوں نے مختار میاں کی طرف گھور کر دیکھا۔ مختار میاں نے گردن جھکا لی اور دبی آواز میں بولے۔

"نہیں جی ـــ شبّو کل تم لوگوں کے ساتھ نہیں ہوگا، اس سے مجھے کچھ کام ہے۔"

شبّو گردن جھکائے بیٹھا رہا سب لوگوں کے لیے یہ پہلا موقعہ تھا۔ جب شبّو ایسے چاق و چوبند آدمی کو مختار میاں نے ایسے موقع پر روک لیا تھا جب کہ اس کا اس کام میں شریک ہونا ضروری تھا۔ مگر مختار میاں سے کسی کی ہمّت تھی جو کچھ پوچھ سکتا۔ تھوڑی دیر بعد مختار میاں کا گروہ قاسم کے اڈے سے درہم برہم ہو گیا مگر اس ٹوٹے ہوئے کھنڈر میں پھر بھی آگ جلتی رہی اور رات کے سنّاٹے میں اکیلا اور تنہا شبّو آگ کے کنارے بیٹھ کر اپنے آوارہ خیالوں میں نہ جانے کب تک ڈوبا سوچتا رہا ـــ

شبّو کو اکثر اپنا ماضی یاد آتا ـــــ اپنے بچپن کا وہ زمانہ سوچا کرتا جب کہ بنوٹ اور قردلی کے چند داؤں پیچ سکھا کر اس کا باپ مر چکا تھا اور اس کے بچپن کے پندرہ سال جہالت کے دور میں ماما کی گود میں گزرے تھے اور پندرہ برس کی عمر میں اس نے قرآن کی آیتوں کو تتلا تتلا کر پڑھنا سیکھا تھا۔ طبیعت ذرا خوش مزاج پائی تھی اس لیے جس کام کو سیکھنے کے لیے بٹھایا گیا وہاں سے دوسرے دن نکلے

اٹھا پائی اور سر پھٹول کر کے چلا آیا اور پھر ۱۹ برس کی عمر میں اپنے سفید کرتے کے نیچے رنگین بنیان اور ہاتھ بھر لٹکتے ہوئے ریشمین ازار بند کے علاوہ گلے میں سُرخ رومال باندھنا سیکھ لیا تھا۔ پھر کچھ ہی روز بعد اس کے چہرے پر قرولی نما مونچھوں کا اضافہ ہو گیا۔ طبیعت ذرا بانکی پائی تھی اس لیے دوست احباب بھی ایسے ڈھونڈھ نکالے۔ مختار میاں نے ہمت باندھی، پھر کیا تھا۔ قاسم کا اڈہ، تاش کے پتے شراب کی بوتلیں اور رنڈی کے مجرے زندگی کا محور بن گئے، دیواریں پھاندھنا سیکھ لیں ہاتھ کی صفائی اور قرولی کی دھار نے کتنی ہی آنتیں کاٹ کے ڈال دیں۔ تھانوں اور کوتوالیوں میں حاضری دینا پڑی اور پھر ہوتے ہوتے شبّو کی سانسیں جیسے اس زندگی میں رچ بس گئیں۔ اسے یاد آیا جب مختار میاں نے ایک ہی ماہ بعد پورے گروہ کے سامنے فخر سے کہا تھا۔

"تم سب لوگ حرام خور ہو، شبّو بڑا ہونہار شاگرد ہے کل رات ڈاکہ میں شبّو میری جگہ پر کام کرے گا۔"

اور پھر کتنے ہی موقعے ایسے آئے تھے جب کہ اُسے مختار میاں کی جگہ سنبھالنا پڑی تھی اور پورے گروہ نے اس کی ہدایتوں کو مانا تھا۔ اس سرداری پر شبّو کو بڑا ناز تھا۔ لوگ جانتے تھے کہ شبّو دھیرے دھیرے مختار میاں کا داہنا ہاتھ بن بیٹھا ہے، اس کے علاوہ شبّو کی جی داری اور اس کی ہوشیاری پر بھی کسی کو شک نہ تھا۔ بیس ہزار کا پوشیدہ جوا قاسم کے اڈے پر شبّو کی ہی نگرانی میں ہوا تھا اور جس وقت پولیس آ گئی تھی تو آدھے گھنٹہ دلیری سے مقابلہ کرنے کے بعد شبّو ہی نے گروہ کے ہر آدمی کو خطرے سے صاف نکال دیا تھا اور آخیر میں خود بھی چالیس فٹ اونچی دیوار پھاند

کر نکل بھاگا تھا۔
لیکن یہ پہلا موقعہ تھا جب اتنے اہم مورچے سے مختار میاں نے شبّو کو ہٹا لیا تھا۔ شبو نے بھی اس بات پر زیادہ دھیان نہ دیا۔ کئی دن ایسے ہی گزر گئے بات آئی گئی ہوگئی۔ مگر مختار میاں کے کرخت چہرے پر فکر کے آثار بڑھتے گئے یہ تبدیلی ہر شخص کو محسوس ہو رہی تھی ایک دن پھر خلافِ معمول ایک بات اور ہوگئی، ہوا یہ کہ شبّو مختار میاں کے پاس بیٹھا تھا کہ اتنے میں تقی بھاگا ہوا آیا اور ایک آنکھ دبا کر ہلکے سے بولا ——

"استاد —— دو شکار ہاتھ آئے ہیں۔"
"جیو میری جان۔" مختار میاں کے بجائے شبّو اچھل پڑا۔
"دونوں کان پور کے ہیں۔"
"مال کتنا ہے جیب میں؟" شبّو نے پوری دلچسپی سے پوچھا۔
"پانچ پانچ سو۔"
"خیر چل جائے گا —— تاش کی گڈیاں تیار ہیں؟"
"وہ سب تیار ہیں۔"
"اچھا۔" شبو نے سینہ پھیلا کر مختار میاں کی طرف دیکھا "اجازت ہو استاد!"۔
مختار میاں نے گردن جھکا لی اور دھیمے سے بولے۔
"تم جوا نہیں کھلواؤ گے شبو۔ میں خود جاؤں گا۔"
"تم استاد۔ اتنے چھوٹے سے معاملہ کے لیے۔" شبّو نے آنکھیں پھاڑ کر مختار میاں کی طرف دیکھا۔ مختار میاں کے چہرے پر کوئی تغیر نہیں تھا۔ وہ چلتے

ہوئے بولے "تم اب جو انہیں کھلواؤ گے"

"کیوں استا؟"

"میں حجت نہیں چاہتا" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔ نقی آہستہ سے شبّو سے مخاطب ہوا۔

"کیا معاملہ ہے شبّو یہ استاد کو کچھ روز سے کیا ہو گیا ہے؟"

مجھے کیا معلوم ـــــ جو جی چاہیں کریں استاد میرے بلنٹے سے" شبّو بڑبڑا کر خاموش ہو گیا۔ نقی نے سارے گروہ میں یہ بات پھیلا دی۔

"معاملہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے ـــــ معلوم ہوتا ہے استاد شبو کی چھٹّی کرنے والے ہیں"

اور مختار میاں کے رویے میں روز بہ روز تبدیلی ہوتی گئی۔ قاسم کے اڈّے پر یہ چرچے کئی بار ابھرے۔ شبّو چپ چاپ ایک کونے میں بیٹھا رہتا۔ اسکے تندرست اور ابھرے ہوئے سینے سے کبھی کبھی ایک لمبی سی سانس نکلتی اور کبھی کبھی اپنے مضبوط ہاتھوں کی انگلیوں کو فکرمندانہ انداز سے چٹخانے لگتا۔

"آؤ میری جان، ہو جائیں دو دو ہاتھ"

"بناؤ۔ بناؤ ابھی آیا" شبّو میں بھی ایک ہلکی سی تازگی آ گئی، وہ بھی اپنا سکورہ لے کر بیٹھ گیا۔ مگر سکورہ ہونٹوں تک نہ پہنچ پایا تھا کہ مختار میاں آ گئے۔

"آؤ استاد اچھے موقع سے آئے دیسی چل رہی ہے" لوگوں نے انھیں بلایا۔

تم لوگ چلاؤ ـــــ" مختار میاں نے بالکل خوشی کا اظہار نہ کیا اور پھر وہ شبّو کی طرف دیکھ کر بولے۔

"ذرا میرے ساتھ چلو شبو۔"

"ابھی چلتا ہوں استاد، ذرا ایک پیگ لگا لوں۔"

"شراب چھوڑ دو اور میرے ساتھ آؤ۔"

"خیریت تو ہے؟" شبو نے سکورہ رکھ دیا اور مختار میاں کے پاس گیا۔ وہ اسے باہر لے گئے۔ اور پھر شبو لوٹ کر نہیں آیا۔ اس کی جگہ مختار میاں اندر آ کر بیٹھ گئے۔ کئی الجھنیں ایک ساتھ پھر ابھر آئیں۔ سب نے ایک گھٹن سی محسوس کی، مگر کوئی بھی اس الجھن کو سلجھانے کی ہمت نہیں رکھتا۔ کسی میں اتنی مجال نہ تھی جو اس گھٹن کو توڑ دیتا۔ مگر پھر بھی مختار میاں کی گھٹن دور نہ ہوئی۔ مختار میاں کی خاموشی بڑھتی گئی ـــ ایک رات وہ اپنے پڑوسی منشی جی کے پاس جا کر بیٹھ رہے مختار میاں اکثر منشی جی کے پاس گھنٹوں بیٹھے رہا کرتے تھے۔ منشی جی کی عمر ۸۰ برس کی تھی اور انھیں بچپن سے مختار میاں سے پدرانہ عشق تھا۔ اس رات بھی وہ مختار میاں سے بہت ہی اعتماد کے ساتھ باتیں کرتے رہے۔

"دیکھو بیٹا ـــ میں نے ہمیشہ غداگتی کہی ہے ـــ تم خود سوچو۔ گھر میں جوان لڑکی ہے، تمھاری ماں صاحبِ حیثیت رشتہ داروں کا منھ دیکھنے کے علاوہ ہر ایرے غیرے لڑکے کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہیں۔ ادھر ذرا میل ملاقات رکی ہوئی ہے ورنہ شبو کا روز ہی آنا جانا تھا۔

"لیکن بابا مجھے اسی کی تو ساری پریشانی ہے" مختار میاں آہستہ سے بولے۔ منشی جی نے سرگوشی کی۔

"دیکھو بیٹا۔ اسے شاعری نہ سمجھنا۔ یہاں دو خواب آپس میں ٹکرا رہے

ہیں۔ شبّو کو تم جانتے ہو۔ وہ تمھارے گروہ کا ایک مشّاق کارندہ ہے۔ اس کے خواب اور اس کی آرزوئیں رات کے سنّاٹوں اور قردیلوں کی جھنکاروں تک محدود ہیں۔ ذرا غور سے دیکھو یہ خواب فاطمہ کے نرم و نازک خوابوں سے کتنے مختلف اور کتنے جدا ہیں۔ میں نے دھوپ میں بال سفید نہیں کئے۔ میں جانتا ہوں کہ فاطمہ ایک معصوم اور بے خبر لڑکی ہے بیٹا ایسی لڑکیوں کے دلوں میں بڑی لطیف اور گداز تمنّائیں جنم لیتی ہیں۔ یہ ساون کے جھولوں اور محل سراؤں کی خیالی سیجوں کی گودیں پروان چڑھتی ہیں۔ یہ پتھر اور پھول تمہاری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ ان کا ملاپ ناممکن ہے۔ مختار میاں گردن جھکائے بیٹھے تو منشی جی نے پھر سرگوشی کی۔

"دیکھو بیٹا میں نے جوانی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور وہ بھی عورت کی جوانی۔ بس یہ سمجھو کہ اس کی مثال برف کی اس مٹھائی کے مانند ہے۔ جسے ہلکی سی حرارت پانی پانی کر دینے کے لیے کافی ہوتی ہے اور بعد میں بیٹا وہ پانی بھی بھاپ بن کر اڑ جاتا ہے۔ بُرا نہ ماننا تمھاری ماں کی شہ پا کر یہ آنچ کافی بڑھ چکی ہے۔ کیا پتہ کب برف کی مٹھائی پانی پانی ہو جائے۔"

"ہونہہ" مختار میاں کے چہرے پر تلخ مسکراہٹ دوڑ گئی "اگر خدا کو یہی منظور ہے تو کوئی بات نہیں منشی جی — ویسے بھی میں زندگی میں سب بازیاں ہار چکا ہوں۔ کیا دیا ہے زندگی نے مجھے۔ نہ نام نہ عزّت، اگر فاطمہ کے ساتھ بھی یہ سالی زندگی یہی سلوک کرے تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے"

"ایسا مت سوچو مختار" منشی جی نے ڈھارس دی "انسان پیدائشی

برا نہیں ہوتا ۔"

"اسی کی تو میں کوشش کر رہا ہوں۔"

"مگر یہ کوشش ادھوری ہے۔" منشی جی کی بوڑھی آنکھوں میں جلال آ گیا۔ "شبّو کو ٹھیک کرنا ہے تو اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے ماحول کے خول کو پہلے ٹھیک کرو۔"

——— اور پھر مختار میاں منشی جی کے پاس سے اٹھ کر چلے آئے۔ اداس اداس، چپ چپ۔ قاسم کے اڈے پر پہونچ کر انھیں معلوم ہوا کہ آج کی رات انھیں مورچے پر جانا تھا۔ بھگو داس ریٹائر ہوا تھا اور اسے دفتر سے سات ہزار نقد فنڈ کی حیثیت سے ملا تھا۔ تقی کے بیان کے مطابق وہ روپیہ ابھی بھگو نے ڈاک خانہ وغیرہ میں منتقل نہیں کرایا تھا۔ جب مختار میاں اڈے پر پہونچے تو گیارہ کا عمل تھا۔ آگ جل رہی تھی۔ رحمت، قادر وغیرہ اپنے چہروں پر کالے کپڑے کے ڈھاٹے باندھ کر تیار ہو چکے تھے۔

"شبّو" مختار میاں نے پہنچتے ہی آواز لگائی۔

"استاد" شبّو ان میں سے نکل کر سامنے آ گیا۔

"تم تیار ہو" مختار میاں نے اسے سر سے پیر تک دیکھا۔ شبّو پہچانا نہیں جا رہا تھا۔

"بس حکم دیجئے استاد سارا معاملہ تیار ہے۔"

آج تم کام پر نہیں جاؤ گے۔ اور دیکھو تم سیتا سُنار کے یہاں بارہ بجے تک پہنچ جانا اور اس سے کہنا کہ سونا گلانے کی بھٹی تیار رکھے۔ اور دیکھو میں جب

تک نہ آؤں تم سُنار کے یہاں ہی رہنا۔
شبّو سب کچھ سنتا رہا۔ اس نے ہاں یا نہیں میں کوئی جواب نہیں دیا مگر اس کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور غائب ہو گئے۔ اس نے آہستہ سے حلق کے نیچے اپنے منھ کا لعاب اتارا اور مختار میاں کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔
مگر یہ خاموشی اور سکوت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا مختار میاں بہت دیر تک اپنے جذبات کو اپنے سینے میں دبائے نہ رہ سکے اور اسی رات جب مختار میاں قلعہ فتح کر کے واپس آئے تو شبّو ذہنی طور پر استادی کے ادب لحاظ کو بالائے طاق رکھ کر دو دو باتوں کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ — ہوا یہ کہ مختار میاں نے آتے ہی شبّو کو الگ بلا لیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔
"میرا مطلب تمھارا حق مارنا نہیں تھا۔ لو یہ تین سو روپے تم رکھ لو۔
"کیسے روپے؟" شبّو نے پوچھا۔
"قلعہ فتح ہو گیا۔ تمھارے حصّے میں تین سو روپے آئے ہیں"
"میرا حصّہ کیسا؟ میں کام میں شریک کب تھا"
"تو کیا ہوا؟"
"بُرا نہ ماننا استاد۔ شبو حرام خور نہیں ہے۔ وہ تم سے جو کچھ لیتا ہے اس کا حق ادا کر دیتا ہے۔ میں یہ روپیہ نہیں لوں گا"
"کیوں؟" مختار میاں چونک اٹھے۔
"استاد یہ بھیک ہے بھیک۔ مجھے نہیں چاہیئے۔ ابھی میرے ہاتھوں میں بہت دم ہے۔

"یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو شبو۔"

"میں کیسی باتیں کر رہا ہوں۔" شبّو کی آواز تیز ہو گئی۔ "تم خود آج کل اکھڑے اکھڑے رہتے ہو۔ تمھاری نظریں بدلی ہوئی ہیں۔ میں نے تو تمھارے ساتھ کوئی برائی نہیں کی۔" یہ جواب سن کر مختار میاں کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ شبو بھی خاموش رہا۔ دونوں کی نظریں جھکی ہوئی تھیں کہ اس خاموشی میں مختار میاں کی آواز پھر ابھری۔

"شبّو۔"

"جی۔"

"میں جو کچھ کہوں گا اسے ٹھنڈے دل سے سنو گے" مختار میاں کے لہجے میں گمبھیرتا تھی۔ شبو نے آہستہ سے جواب دیا۔

"کیوں نہیں ؟"

"تم جانتے ہو شبّو کہ میں نے مشکل سے مشکل بات کو ایک منٹ سے زیادہ نہیں سوچا۔ مگر اب میں خاموش رہتا ہوں۔"

"جی ہاں استاد۔"

"شبّو ـــــ سیدھی بات یہ ہے کہ میں تم کو اس دنیا سے ہٹا دینا چاہتا ہوں جس میں تم اب تک میرے ساتھ رہے ہو۔ میں چاہتا ہوں تم شریفوں کی سی زندگی گزارو اس لیے میں تم سے ہاں یا نہیں میں اپنے سوال کا جواب چاہتا ہوں ذرا سوچ سمجھ کر جواب دینا۔"

"کیا جواب استاد ؟" شبّو نے خوف اور تعجب کے ملے جلے تاثرات کے

ساتھ پوچھا۔ مختار میاں نے اپنے نیفے سے چمکتی ہوئی قرولی نکالی اور ایک بار شبّو کی آنکھوں کے سامنے گھماتے ہوئے بولے۔

"مجھے فریب دینے کی کوشش نہ کرنا شبّو۔ مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے، تم اپنا گھر بسانا چاہتے ہو۔ محبّت کی زندگی گزارنا چاہتے ہو تو اس راستے سے الگ ہو جاؤ۔ میں تم پر کسی طرح کا ظلم نہیں کروں گا۔ سارا فیصلہ تمھارے ہاتھ میں ہے۔ بولو تمھیں یہ قرولی پسند ہے یا فاطمہ —— میری بہن دو میں سے صرف ایک چیز لے لو۔"

فضا میں جیسے کئی تیر ایک ساتھ چھوٹ گئے۔ ہوا میں جیسے کئی چنگاریاں جگنو بن کر اڑنے لگیں۔ شبّو کو ایسا لگا جیسے اس کی کنپٹیوں کی نسیں پھٹ جائیں گی۔ اس کی ناک کے موٹے موٹے نتھنے تیزی کے ساتھ پھڑپھڑانے لگے اس کے دماغ کی ایک ایک رگ میں جیسے ہزاروں بھونچال اُبھر آئے۔

"بولو شبّو —— نئی زندگی کا بوجھ تم سے اُٹھ سکے گا، ہے اتنی ہمت؟"

".... شبّو کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا وہ پتھر کی طرح بے حس وحرکت کھڑا تھا۔

"تمھارے فیصلے میں دیر نہ ہونا چاہیے شبّو!" مختار میاں کی گمبھیر آواز پھر ابھری" تم اپنی محبّت کو غربت اور فاقوں میں دم توڑتے دیکھ سکو گے شبّو؟" اور پھر دھیرے دھیرے شبّو کی پتھرائی ہوئی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ کشادہ پیشانی پر پسینا آگیا۔ ہر طرف سنّاٹا تھا۔ دل دھڑک رہے تھے۔ شبّو کے ہونٹ آہستہ آہستہ پھڑپھڑائے اور آنکھوں کے وہ آنسو اس کے کھردرے گالوں پر بہہ آئے۔

"کیا دیر ہے شبو؟"

شبو کے سیدھے ہاتھ میں ایک بار جنبش ہوئی۔ اس کا کانپتا ہوا ہاتھ قربلی کی طرف بڑھنے لگا۔ اور پھر یک بارگی قربلی اس کی گرفت میں تھی جسے لے کر وہ مختار میاں کے پیروں پر گر پڑا۔

"شبو کی شادی اس قربلی سے ہو چکی ہے۔" شبو نے مختار میاں کو اپنی گرفت میں اور کس لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

رگِ سنگ

پہوتا ایک جھٹکے کے ساتھ ہٹی اور کٹی ہوئی ران سے مکھیوں کا ایک چھتہ اڑ کر ادھر ادھر پھیل گیا۔ منے کی چھری جو انگوٹھے میں پھنسی گوشت کی بوٹیاں بنا رہی تھی رک گئی۔ ننگے ننگے بازوؤں کی پھڑکتی ہوئی مچھلیاں جن پر کالے دھاگے میں ایک تعویذ بندھا ہوا تھا رک گئیں۔ اس نے نظر گھما کر چھت کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولا۔

"آگئیں اشنان کر کے بہارانی جی"

یہی تھی وہ بہارانی جس کا نام جوہی تھا۔

سر کے بال کھلے ہوئے۔ پیر لمبے کرتا۔ جھولتے ہوئے سوکھے سوکھے سے بال، دمکتا ہوا چہرہ، آئینہ جیسی صاف شفاف تھرکتی ہوئی آنکھیں، ابروؤں کا خم اور جوڑے سے اٹھے

پر تیوری کا ہلکا سا ایک بل اجلے اجلے سے گال اور بھرے بھرے ہونٹ مگر سب کچھ اس شے کے مانند جس پر نقش و نگار تو موجود ہوں لیکن جس کی زمین کو مصوّر رنگ دینا بھول گیا ہو۔ ایسا رنگ جو دوسری تمام چیزوں کو اجاگر کرکے رکھ دیتا ہے۔ ویسے تو جوہی کا رنگ بھی سفید تھا مگر اس میں شادابی اور تازگی نہ تھی۔ وہ آگ نہ تھی جو عارضوں کے نیچے چراغ روشن کر دیتی ہے۔ جوہی کی آنکھیں صاف و شفاف بھی تھیں اور کھر کتی ہوئی بھی مگر ان میں ٹھنڈک نہیں تھی رس نہیں تھا اور نمی نہیں تھی۔

منے چپکے سے بولا "کہو آج کل کام وام کیسا چل رہا ہے"

"کیسا کام؟" وہ تیز آواز میں بولی۔ اس کا لہجہ بھونڈا اور بے حجابانہ تھا۔

"اب کام بھی بتانا پڑے گا" منے آہستہ سے بولا جیسے بڑبڑا رہا ہو۔

یہ سن کر اس کی تیوری پر ایک ہلکا سا بل پڑ گیا اور جذبات سے عاری لہجہ میں بولی ـــــ

"تم کیا دنیا بھر کے قاضی ہو؟"

"خفا ہو گئیں" منے پھر دھیرے سے بولا۔

"ہم سے ایسی باتیں نہ کیا کرو۔ لاؤ یاد کچھ چکنا قیمہ۔ اس بار وہ تنک کر بولی۔

"چکنا تو ختم ہو گیا۔ میرے کہنے سے آج روکھا کھالو" منے قدرے شرارت سے بولا۔

"بڑے حرامزادے ہو" یہ کہہ کر اس نے اپنے بال جھٹکے اور تام چینی کا پیالہ اس کے منھ پر جھک کر بولی "دس منٹ میں قیمہ بنا کر رکھ دو۔ میں ابھی آتی ہوں چربی الگ سے رکھ دینا" اتنا کہہ کر جوہی نے جھپ سے چق اٹھائی اور لمبے لمبے

ڈگ بھرتی گلی میں غائب ہو گئی۔

مینے نے ایک لمحہ اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ اور چلا کر بولا "ایک دن تیرا خصم اگر دکھا قیمہ کھالے گا تو مر نہیں جائے گا" اور پھر وہ دکان میں بیٹھے ہوئے ایک گاہک سے بولا "بھیا سنا ہے بڑی چھچھالیدر مچائے ہے یہ عورت۔ کریم بھائی کہہ رہا تھا کہ چاندنی رات میں حرامزادی کھلی چھت پر کھڑی ہو کر آڑی ترچھی انگڑائیاں لیتی ہے۔ اور لونڈوں کو اشارے کرتی ہے" اور پھر بہت دیر تک وہ سب جوہی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

ہر صبح جوہی کی باتیں اس دوکان سے شروع ہوتیں اور سارے محلے میں کھیل جاتیں اور اس طرح جوہی کی باتوں کا ایک دن گذر جاتا۔

رات کو کوئی ایک بجا ہوگا۔ جاڑوں کی رات تھی، گہرے گہرے اور دھند میں لپٹی ہوئی رات میں مجھے کئی بار کنڈی کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز سن کر جاگنا پڑا تھا۔ اگرچہ میرے سرہانے گلی کی طرف کھلنے والی جو کھڑکی تھی وہ بند رہتی لیکن پھر بھی میری کھڑکی سے جوہی کے دروازے کا فاصلہ اس قدر کم تھا کہ اس کے ہاتھ پکارنے والے کی آواز صرف سنائی دیتی۔ ادھر اس کی کنڈی ہلتی ادھر میرے کان کھڑے ہو جاتے۔

لیکن اس بار تو میں اپنے لکھنے کی میز پر بیٹھا رات گئے تک کام کرتا رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر پہلے چوکی کے پولیس والے گشت کر کے ادھر سے گذرے تھے اور ان کے بھاری جوتوں اور لاٹھیوں کے کھٹکنے کی آوازیں سنائی دیں تھیں۔ اور ابھی سناٹا ٹھیک سے دم بھی نہ لے پایا تھا کہ گلی کے نکڑ کے پاس پکی سڑک پر کسی موٹر کے رکنے

کی آواز سنائی دی۔ اور پھر دور سے کسی کے جوتوں کی آواز ابھری رتنائے میں جوتے چرمر چرمر۔بول رہے تھے اور ان کی چرمراہٹ میری کھڑکی کی طرف بڑھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ پھر جوتوں کی چرمراہٹ میرے سرہانے کھڑکی کے نیچے آکر رک گئی۔ ایک لمحہ کے لیے کوئی آواز نہ ہوئی اور پھر آہستہ سے جوہی کے دروازے کی کنڈی ہلائی گئی۔ ایک لمحہ جواب میں خاموشی رہی اور پھر مردانی آواز نے اندر سے پوچھا۔

"کون ہے؟"

"جوہی سے کہو موٹر آیا ہے" کنڈی کھٹکھٹانے والے نے آہستہ سے جواب دیا۔ میں نے کھڑکی میں بنی ہوئی جھریوں سے باہر جھانک کر دیکھا۔ اس کڑکڑاتی سردی میں ایک لمبا تڑنگا آدمی سائے کے مانند نظر آرہا تھا۔ پھر اس میں حرکت ہوئی اور اندھیرے میں ایک ننھا سا شعلہ.......... ایک لمحہ کے لیے چمک کر بجھ گیا۔ شاید آنے والے نے انتظار کے لمحہ گزارنے کے لیے سگریٹ جلائی تھی۔

جوہی اور اس کے شوہر میں ہمیشہ کی طرح کچھ دیر کشم کشتا ہوتی رہی۔ وہ اسے روکنے کے لیے چارپائی پر دھکیل دیتا اور بانس کی چارپائی سے چر کی آواز آتی۔ وہ پھر اٹھتی اور پھر ایسا لگتا کہ کپڑوں کی سرسراہٹیں دروازے تک آکر پھر لوٹ گئی ہو.. اور پھر اس دھینگا مشتی میں جوہی کے منہ سے گالیاں سنائی دیتیں۔ گھڑکیاں اور ڈانٹوں کی آوازیں آتیں، گھونسوں اور تھپڑوں کی دھادھم ابھرتی اور پھر سناٹا چھا جاتا۔

آخر کار اس رات بھی جوہی کے منہ سے گالیوں کا ایک فوارہ پھوٹ پڑا

اور بہت دیر تک وہ اپنے شوہر کے ساتھ گتھی رہی۔ گھونسے اور تھپیڑوں کی آوازوں کے بعد ایک لمحہ کے لیے سناٹا چھا گیا لیکن اسی سناٹے میں جوہی کے گھر کا دروازہ ایک چراہٹ کے ساتھ کھلا اور جوہی سامنے کھڑی تھی۔ آنے والا جلدی سے بولا۔

"جلدی چلو۔ بڑی دیر ہو گئی ہے"

جوہی بغیر کچھ کہے اس کے پیچھے چلنے لگی۔ اور جب ان جوتوں کی چُرمر چُرمر دھیرے دھیرے گلی کے نکڑ تک پہنچ کر غائب ہو گئی اور موٹر کے انجن کی غوں کی آواز ابھر کر ڈوب گئی تو جوہی کے گھر کا دروازہ آہستہ سے پھر کھلا۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ جوہی کا شوہر دہلیز سے اتر کر گلی میں تھا۔ اندھیرے میں پہلے تو اس نے دائیں بائیں ایک بار نظر دوڑائی اور پھر اس کڑکڑاتے جاڑے میں اپنا سینہ پھلا کر ایک لمبی سی انگڑائی لی۔ وہ صرف ایک قمیص پہنے تھا۔ کچھ دیر وہ بڑی لاپرواہی کے ساتھ اپنی جانگ کھجاتا رہا اور پھر وہیں پاجامے کا ایک پائنچہ اٹھا کر نالی کے نیچے جماہی لیکر بیٹھ گیا اور پیشاب کرنے لگا۔ اس کی عمر ۴۵ سال سے اوپر ہوگی ہاتھ پیر مضبوط تھے۔ محلّے میں وہ جمو کے نام سے مشہور تھا۔ جمو کی ہر رات اسی نالی کے کنارے پیشاب کرنے سے شروع ہوتی اور دروازے کی کنڈی لگا کر اکیلی چارپائی سے لپٹ کر سو جانے پر ختم ہو جاتی۔

صبح پانچ بجے ہی سے میدان کے دھوبیوں کا گلی میں آنا جانا شروع ہو جاتا تھا۔ جوہی کے گھر کی ڈیوڑھی جو کھڑکی کی طرف کھلتی تھی ہمیشہ کی طرح اس روز بھی کھلی تھی اور اس کا شوہر ڈیوڑھی میں ایک میلا کچیلا مونڈھا جو ہر طرف سے دب دبا کر چپٹا سا ہو گیا تھا بچھائے لیٹا تھا۔ اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔ اور وہ کچھ عجیب

کھوئے کھوئے انداز کے ساتھ گلی میں سے گزرنے والے ہر راہ گیر کو ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا ——

تھوڑی دیر کے بعد حسبِ معمول چنن دھوبی ہاتھ میں پانی سے بھرا لوٹا لئے پاخانے جاتے ہوئے گذرا تو اس کی نظر جمو پر گئی۔ جمو کو دیکھ کر وہ رک گیا اور بڑے اعتماد کے ساتھ بولا: "ابھی آئی نہیں؟"

"نا!" جمو نے گردن جھکا کر آہستہ سے جواب دیا۔

"کے بجے گئی تھی؟"

"ایک بجے!" جمو نے پھر سپاٹ آواز میں جواب دیا۔

"ابے میں پوچھتا ہوں تو کیسا مرد ہے؟ آئیں" چنن قدرے جھنجلاہٹ کے ساتھ بولا۔ اور پھر اس نے لوٹے کو اپنے پاس زمین پر رکھ لیا اور جیب سے بیڑی کا بنڈل نکال کر ایک بیڑی جمو کو دی اور دوسری خود سلگائی پھر اُسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

"میں کہتا ہوں حرامزادی کو دو ٹھوکریں مار کر نکال کیوں نہیں دیتا؟"

جمو چپ رہا۔

"ابے کچھ شرم عزت ہے یا نہیں"

وہ خاموش رہا۔

"اگر اس کی عزت مر گئی ہے تو تو کیوں بے حیائی لا رہا ہے"

جمو اب بھی چپ تھا۔

"جب تیری عورت تیرے قابو میں نہیں تو چوٹی میں بل دے کر نکال دے گھر سے"

جمّو نے پھر کچھ نہیں کہا۔
"میری عورت سالی اگر ایسا کرتی تو دانتوں سے ناک کاٹ کر گھر سے باہر نکال دیتا۔"
لیکن جمّو خاموش ہی رہا۔
پھر چنن بڑبڑانے لگا۔ "سارے محلّے میں اودھم مچا ہوا ہے جدھر جاتی ہے لونڈے تالیاں بجاتے ہیں۔ مکڑ پر جو میں گھنٹے لگے لفنگے لوگوں کا جھمگٹ لگا رکھتی ہے۔ شریفوں کے چلنے کو راستہ نہیں ملتا ہے۔ کبڑیے کا لونڈا دیکھ کر دُور ہی سے ہانک لگاتا ہے "گندیری گلاب ہے" جہاں کھڑی ہو گی چار لونڈے جمع ہو جائیں گے اور آوازے کسیں گے۔ ابے کچھ کر نہیں سکتا تو یہ محلّہ ہی چھوڑ دے کہیں اور جا کر منھ کالا کر۔"
جمّو چپ رہا۔ وہ اپنے الٹے ہاتھ کی ہتھیلی کو انگوٹھے سے رگڑ رگڑ کر اس کا میل چھڑا رہا تھا۔
"چنن نے پھر اپنے چہرے پر بزرگانہ تاثرات لا کر سوال کیا۔
"کوئی کام ملا تجھے؟"
"نا"، جمّو پھر ہلکی سی نا کر کے رہ گیا چنن کو پھر غصّہ آ گیا۔ تنک کر بولا۔
"ابے تیرا گھوڑا کیا مر گیا کر تو ہی مر گیا۔ ابھی کون سی تیری عمر گئی ہے۔ جو یوں بیٹھ گیا ہے۔ ہاتھی ایسا ڈیل ہے۔ محنت مزدوری ہی کر۔ جھولا لے کر صبح صبح رکاب گنج چلا جایا کر روپیہ بیس آنے مل ہی جایا کریں گے۔"
جمّو نے کوئی جواب نہ دیا۔ چنن نے یہ بات نہ جانے کس بھول پن میں کہہ

دی لیکن یکبارگی وہ اپنی ہی بات پر چونک پڑا۔ اس کی آنکھیں تیزی کے ساتھ جمّو کے پیروں سے ہوتی ہوئی پیٹ اور ران اور سینہ سے گزرتی ہوئی آنکھوں سے ٹکرا کر رک گئیں۔ اس نے دیکھا جمّو کے پیروں میں پمپ کا کالا جوتا چمک رہا تھا۔ چھے لٹھے کا کورا پاجامہ، پاپلین کی بالکل نئی قمیص جس کے کاجوں میں حیدرآبادی بٹن لگے تھے۔ پٹّوں میں چپڑا ہوا تیل۔ وہ اس طرح سجا بنا بیٹھا تھا جیسے تھوڑی دیر میں عید کی نماز پڑھنے جا رہا ہو۔ چھنن سے نہ رہا گیا۔ دل ہی دل میں کڑھ کے بڑے تیکھے انداز میں بولا "ابے آنکھوں میں سرمہ بھی لگا لیا ہوتا"۔

جمّو پہلے تو کچھ شرمایا اور پھر بے شرمی کے ساتھ ہنس پڑا۔ اور پھر جو ہنسا ہے تو اللہ دے اور بندہ لے "ہی ہی ہی" "کھی" ہو ہو ہو" بے تکی بے ہنگم اور بے تکان ہنسی۔ جیسے اسے کوئی رہ رہ کر گدگدا رہا ہو۔ وہ مونڈھے پر ہنستے ہنستے بے دم ہو گیا۔ وہ ہلتا جاتا تھا اور اپنی موٹی موٹی رانوں پر دوہتڑ مارتا جاتا۔ یہ گھٹی گھٹی سی کھی کھی جس میں کوئی زندگی اور کوئی پھوٹ پڑنے والی خوشی نہ تھی جو یہ کلیجے کی اتاہ گہرائیوں کے بجائے گلے کی پھولی ہوئی نسوں سے اچھل اچھل کر بہہ رہی تھی۔ چھنن کے لیے یہ ہنسی نئی نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی وہ اپنا سا منھ لے کر رہ گیا۔ اس نے کھسیا کر اپنا لوٹا اٹھایا اور جمو کی طرف تیوریاں چڑھا کر اس طرح دیکھنے لگا جیسے اس کا بس چلے تو وہ اس کی کھلی ہوئی ہنسی پر تھوک دے۔ ایک لمحہ وہ اسے گھورتا رہا پھر چلایا "...وہ بے ٹھنگڑی کی اولاد۔ ڈوب مر چلّو بھر پانی میں" یہ کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ لیکن وہ ابھی کچھ دور ہی گیا ہوگا کہ اسے جمّو کی آواز سنائی دی وہ کہہ رہا تھا۔

"واہ چنن واہ، گھنٹہ بھر چیکچکاے اور چونا لگایا گھاتے ہیں۔"

چنن نے سنی ان سنی کر دی۔ اور چپ چاپ چلا گیا۔

گلی میں پھر سناٹا چھا گیا۔

جمو نے جیب سے بھنگ کی پڑیا نکال کر ایک پھنکا مارا اور پھر جمو پر بھی ایک سناٹا چھا گیا۔ اس کی ہنسی ختم ہو گئی تھی۔ وہ گم سم کھویا کھویا سا ہاتھ پر ہاتھ دھرے، منہ لٹکائے پھر اپنے مونڈھے پر بیٹھا تھا اور آنے جانے والوں کو بڑی مسکین نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ اس چہرے سے بہت کچھ ملتا تھا جو بہت دیر تک رونے کے بعد بھبھک اٹھتا ہے۔ آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے سے گال تمتمائے ہوئے۔

کچھ دیر کے بعد گلی کے موڑ پر اونچی ایڑی والی سینڈلوں کی کھٹا کھٹ کی آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ یہ آواز سنتے ہی جمو جیسے چونک پڑا۔ وہ یکبارگی مونڈھے سے اٹھ کھڑا ہوا ایک لات مونڈھے پر ماری جسے اندر کی طرف لڑھکا دیا اور پھر جلدی سے دروازے کے پٹ بھیڑ کے اندر سے کنڈی لگالی۔

جو ہی کے پکارنے پر وہ دروازہ کھول کر الگ کھڑا ہو گیا۔ جو ہی بجلی کی سی سرعت کے ساتھ انگنائی میں آئی ــــــ کپڑے جلدی جلدی اتار کر بوسیدہ سے برآمدے میں بچھے ہوئے پیال پر ڈالے اور لوٹا لے کر پیخانے میں گھس گئی۔

جمو نے بغیر کسی توقف کے پوچھا۔

"اے کیسی رات بھر آرے چلواتی رہی؟"

"ہاں" جو ہی نے اندر ہی سے کہا۔ جمو پھر بولا۔

اپنی قسم کوئی دن جا رہا ہے۔ چھاتی پہ چڑھ کر نٹنی کا خون پی لوں گا۔"

جو ہی جیسے الٹے پاؤں پچھا نے سے نکل آئی۔ اور پیٹی کوٹ کو دونوں ہاتھوں سے گھٹنوں کے اوپر تک چڑھاتے ہوئے ماتھے پر کئی بل ڈال کر بولی۔

"بہت کھا گئے ہو کیا؟"

جمو چیخ کر بولا۔ "میں پوچھتا ہوں کہاں تھی؟"

"تھی کہیں تجھ سے مطلب۔" جو ہی کرختگی سے بولی۔ اور پھر اس نے اپنے پیٹی کوٹ کے نیفے سے ایک رومال کھینچ کر باہر نکالا اور اس میں مڑے تڑے رکھے پانچ پانچ اور ایک ایک کے نوٹوں کو گننے لگی۔ جمو نے ایک بار غور سے نوٹوں کی طرف دیکھا پھر بولا۔

"حرام زادی کون سی نیک کمائی کر کے لائی ہے جو مجھے دکھا رہی ہے۔ میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتی؟"

جو ہی یک بارگی بپھر اٹھی۔ "اے زبان سنبھال کر بول۔ حرام زادی ہو گی تیری اماں سمجھا کہ نہیں۔ بڑا نیک کمائی والا بنا ہے۔" یہ کہہ کر وہ تنتناتی ہوئی برآمدے سے ملحق ایک چھوٹی سی تاریک کوٹھری میں گھس گئی۔

جمو نے انگنائی میں پڑا ہوا ایک ڈنڈا اٹھایا۔ ایک نظر ڈنڈے کی طرف ڈالی اور دوسری نظر اس کوٹھری کی طرف جس میں جو ہی گئی تھی۔ پھر یک بارگی وہ کوٹھری کی طرف بڑھا لیکن بیچ آنگن میں پہنچ کر وہ رک گیا۔ ڈنڈا ہاتھ میں لئے وہ سوچتا رہا اور پھر ڈنڈے کو ایک کونے میں ڈال کر بیچ آنگن میں گردن جھکائے بے وقوفوں کی طرح سے کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جو ہی کوٹھری سے نکلی تو

جمّو بولا ــــــــ

" ادھر آ۔ میری بات سُن "

" بول " جو ہی اسکے قریب آگئی۔

" یہ پیسہ تجھے کیسے ملا ؟"

" تجھ سے مطلب ؟"

" جمو نے لپک کر اس کی چوٹی پکڑ لی اور بولا " بتا حرامزادی کہاں سے ملا۔

ورنہ تیری ناک کاٹے بنا نہیں چھوڑوں گا "

" کہیں سے ملا۔ پھر تیرے باپ کا اجارہ۔ چھوڑ میری چٹیا " جو ہی بری طرح اس سے لپٹ گئی۔ جمّو نے تیزی کے ساتھ اس کی گدّی پر ایک ہاتھ رسید کیا اور بولا۔

" نہیں بتائے گی "

جو ہی منھ کے بل زمین پر آرہی۔ لیکن ایک لمحہ کے بعد اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور جمو کی ٹانگوں میں لپٹ کر اس کی داہنی پنڈلی پر اس زور سے کاٹا کہ جمو بلبلا کر زمین پر آرہا۔ یہ لپاڈگی آنگن میں ہو رہی تھی۔ انگنائی کے ایک کونے میں چولہا تھا۔ جمو کا سر چولھے کے پاس جا گرا۔ قبل اس کے کہ جمّو سنبھل کر کھڑا ہو جو ہی اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھی اور اپنے ایک ہاتھ کے ناخن اس کے دونوں گالوں میں گڑا دیئے اور دوسرے ہاتھ سے چولھے پر رکھی ہوئی ترکاری کاٹنے کی چھری اٹھا کر بولی۔

" میری ناک تو تیرے فرشتے بھی نہ کاٹ سکیں گے۔ لا میں ہی تیری ناک

اڑائے دیتی ہوں۔"

"کیا کرتی ہے۔ ارے کیا کرتی ہے۔" جمو چیخا ۔ اور جو ہی کے بوجھ کے نیچے تڑپ کر رہ گیا۔ اور گھگھیا کر بولا" اری نیک بخت تو تو مذاق ہی مذاق میں برا مان گئی۔ اپنی جوانی کی قسم میں تو کھیل کر رہا تھا۔"

"ہونہہ کھیل کر رہا تھا۔"

"اپنی قسم میں تو کھیل کر رہا تھا۔"

جمو نے قدرے گھگھیا کر کہا۔ دنیا کا کیا ہے وہ تو جس کو جی چاہے کہہ دیتی ہے ۔ پر مجھے تو تجھ پر بھروسہ ہے ۔ تو تو بس بات ہی بات میں چاقو چھری چلانے بیٹھ گئی ۔ ہٹ سینے پر سے۔"

جو ہی کے منہ سے گالیوں کا ایک فوارہ سا پھوٹ پڑا۔ اس نے چاقو کو چولھے پر پھینک دیا اور جمو کے سینے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جمو نے گرفت سے آزاد ہوتے ہی چھری کو اپنے ہاتھ میں لیا اور بولا۔

"آگئی نا سلطانہ ڈاکو والے جھانسے میں اب بتا کدھر سے کاٹوں تیری ناک۔"

"ارے جا جا۔" جو ہی انتہائی حقارت کے ساتھ بولی۔ اور پھر اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ جمو کی طرف کوئی توجہ دیئے بغیر نوٹوں کی تہوں میں سے پانچ روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس کے سامنے ڈال دیا اور بولی۔

"اپنی بھنگ کا سبیتا کر لے اس میں سے۔ میں قیمہ لینے جا رہی ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے تام چینی کا کٹورا اٹھایا اور رغڑاتے ہوئے باہر والی گلی میں سما گئی۔

جمو اس کے پیچھے نہیں گیا ۔ اس کے ہاتھ سے چھری گر پڑی اور اس نے

زیتنا بڑے نوٹ اٹھایا ۔ یہ واقعہ پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ جب بھی کبھی جو کو چھری اور نوٹ میں سے کوئی ایک چیز منتخب کرنا ہوتی تو اس کے ہاتھ سے چھری گر پڑتی۔

اب سے سات سال پہلے کی بات ہے جب جو ہی جو کے ساتھ بھاگ کر آئی تھی۔ اس وقت جو ہی کی عمر بیس سال کی تھی۔ سلیم پورہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جہاں جو ہی کی ماں بھیک مانگتی تھی۔ ان دنوں بستی میں دن دہاڑے چوروں لٹیروں کا راج ہوتا۔ جو کچھ ملتا باندھ لیتے، عورتوں کی آبرو ریزی کرتے اور ایک آدھ لاش گندے نالے میں پھینک کر چلتے بنتے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ بستی عام طور سے مردوں سے خالی رہتی۔ مرد دور دراز شہروں میں محنت مزدوری کرنے نکل پڑتے اور عید بقر عید ایک بار گھروں کو آتے۔ عورتیں پاس پڑوس کی بستیوں میں مانگنے نکل جاتیں۔ جوان لڑکیاں اور بچے ہی باقی رہ جاتے۔ بنا مردوں کی یہ بستی کچی عمروں کی لڑکیوں کی نگہبانی پر چھوڑ دی جاتیں اور آئے دن ڈاکوؤں کا نشانہ بنتی۔

ایسے ہی ایک دن جب سلیم پورہ ڈاکوؤں نے ہلہ بول دیا تھا تو جو ہی کو لے بھاگا۔ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ جمو جو ہی کے ساتھ بھاگ آیا۔ جو ہی اس سے پہلے کبھی قصبے سے نہ نکلی تھی۔ چڑھتی جوانی تھی۔ گانجا پینے والے جوان جہاں فقیروں کے ساتھ خوب گھل کھیل چکی تھی۔ پر لگا کر اڑنے کی تمنا نئی دنیا کو دیکھنے کی آرزو، وہ خوشی خوشی جمو کے ساتھ آئی۔ جمو اس پر جان دیتا تھا۔ ان دنوں قریب جوار کے گاؤں میں ہیضا آئی ہوئی تھی پر جمو اسے کندھے پر بٹھا کر نکال لایا۔ جمو کی عمر بھی اس وقت تیس سال سے کیا کم ہوگی۔ شہر لا کر اس نے جو ہی کو بڑے پیار سے

رکھا جو روپیہ پیسہ لے کر آیا تھا۔ اس سے ایک تانگہ خریدا اور جوہی کے ساتھ شادی کر لی۔ اس نے جوہی سے بیاہ تو کر لیا لیکن وہ جوہی کو اپنی عورت نہ بنا سکا۔ پچاس ساٹھ روپے اس نے کمائے۔ اور سب جوہی پر نچھاور کر دئے۔ جوہی اینڈا ینڈ کر رہتی تھی۔۔۔ تین ڈبیاں روز قینچی کی سگریٹ پیتی۔ اور جب شام ہوتی تو وہ کپڑے وپڑے بدل کر طاق سے سارے روپے نکال گھر سے چلی جاتی پھر وہ رات گئے گھر واپس آتی۔ منہ لٹکائے چپ چپ سی، فلاش کھیلتی اور سب پھر سے اڑا دیتی۔

تین سال بعد جمّو کا گھوڑا مر گیا۔ گھوڑے کے مرنے کا رنج اور جوہی کی بے اعتنائی جمّو جیسے مفلوج ہو کر رہ گیا۔ اس نے جو کچھ جس طرح جا رہا تھا جانے دیا۔ اپنے کو ایک بے آسرا اور بے مددگار کی طرح جوہی کو حوالے کر دیا۔۔۔ بھنگ پیتا اور جوہی کے رحم و کرم پر پڑا رہتا۔ جوہی اسے کھانا پکا کر کھلاتی، اس کے کپڑے لتے بناتی، اس کی بھنگ کا بوجھ اپنے سر لیتی اور جب وہ بیمار پڑتا تو ہسپتال میں بھرتی کرا دیتی۔ جمّو جانتا تھا کہ اس کی عورت غیر مردوں کے ہاتھ اپنی آبرو بیچ کر روپیہ کماتی ہے اور اس روپے سے وہ روزانہ چکنا قیمہ کھاتا ہے اچھے کپڑے پہنتا ہے اور بھنگ کا نشہ کرتا ہے۔

رات کو جب کوئی جوہی کو بلانے آتا اور جب وہ کپڑے پہن کر اور سج کر گھر سے باہر نکلنے لگتی تو جمّو اس کی کلائی ایک بار ضرور پکڑ لیتا۔ دونوں میں ہلکی سی دھینگا مشتی ضرور ہوتی مگر ایسا لگتا جیسے جمّو اپنی طاقت استعمال نہیں کر رہا ہو۔ جیسے وہ اندر سے خائف ہو، جیسے اس کی یہ لڑائی جوہی سے نہیں کسی اور سے ہے جو اس سے بہت زیادہ طاقت ور ہے جو ابھی اس کے سامنے نہیں لیکن کسی وقت بھی نمو

ٹھونک کر سامنے آ سکتا ہے۔ وہ اندر ہی اندر تڑپ تڑپ کر رہ جاتا۔ گھٹ کر رہ جاتا۔ وہ جوہی سے کئی بار اپنے خیال کا اظہار اس طرح کر چکا تھا۔ وہ جوہی سے اکثر کہا کرتا تھا۔

"جوہی جی تو یہ کرتا ہے کہ دونوں ہاتھوں سے تیرا گلا گھونٹ دوں۔"

"جوہی تنک کر کہتی "گھونٹ کے دیکھ۔"

"کیا کروں تیری صورت دیکھ کر جی کچھ لوں کرتا ہے۔"

"ہائے ہائے۔ بڑا میری صورت پر مٹنے والا ہے۔"

"اپنی قسم۔" وہ کہتا۔" اگر تیرے منھ پر چادر لپٹی ہو تو میں بڑے مزے میں تیری آنتیں باہر نکال سکتا ہوں۔"

"میری آنتیں نکالے گا تو کیا تیری آنتیں بچی رہیں گی۔ بڑا چیا لا بنتا ہے تو نکال کر دیکھ۔ آج رات میں تیرے پاس چادر لپیٹ کر سو جاؤں گی۔" جوہی جانتی تھی کہ جمو بکواس کرتا ہے۔ وہ اسے نہیں مار سکتا۔

جمو کی پیشانی، اس کے ابرو، اس کی آنکھیں اور لانبی لانبی پلکیں، اور ہونٹ اگر چادر سے ڈھک جانے والے ہوتے تو جمو اس کو کب کا ختم کر چکا ہوتا۔ وہ دماغ کا پردہ کہ جس پر یہ تصویریں ناچتی تھیں کہ جس پر ایک ایک عکس چپک کر رہ گیا تھا کہ جو سات سال سے ان ابروؤں اور نگاہوں کی اداؤں کو جذب کر رہا تھا۔ اس پردے کو پھاڑ دینا جمو کے بس کی بات نہ تھی۔ جب کبھی اس نے جوہی کو مار ڈالنے کا ارادہ کیا۔ لیکن ارادے کے دوران کچھ ہی لمحوں بعد اسے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس کے پیروں کے نیچے کی زمین اندر دھنستی چلی جا رہی ہے اور پھر اس کے ذہن کے

پردے پر سارے کے سارے نقوش ایک ساتھ ابھر آئے، تنے ہوئے باریک سے ابرو، چمکتی ہوئی آنکھیں، کپکپاتی پلکیں اور بھینچے بھینچے سے ہونٹ، سرخ سرخ چہرہ۔ اور پھر اسکے ہاتھ بہکنے لگتے تھے۔

دن اسی طرح گزرتے رہے۔

لیکن ایک دن کچھ عجیب بات ہوئی۔ یہ دن ویسے تو عام دنوں جیسا تھا لیکن اس کا وجود باقی تمام دنوں سے الگ تھا۔ یہ ان دنوں کا نتیجہ تھا جو پچھلے سات برسوں سے جوہی اور جمو کے درمیان گزر رہے تھے۔ گھٹے گھٹے سے، تھکے تھکے اور کاہل سے اچاٹ اچاٹ اور گھبرائے گھبرائے سے دن۔ جمو اس دن نہ جانے کس کے پیچھے چڑھا کر تاڑی خانہ جا پہنچا۔ آدھا گھڑا چڑھا کر گھر آیا تو دیکھا کہ جوہی کپڑوں کی گٹھڑی سنبھال رہی ہے۔

"یہ گٹھڑیا کیوں باندھ رہی ہے ری؟" جمو نے اس سے سوال کیا۔

"گاؤں جانا ہے!"

"گاؤں؟"

"ہاں!"

"کون سے گاؤں؟" جمو نے حیرت ظاہر کی۔

"اپنے۔" جوہی نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "ماں بیمار ہے۔"

"کون سی گاڑی سے؟"

"اسی گاڑی سے۔"

"اچھا!" جمو کچھ دیر کے لیے چپ ہو گیا۔ پھر بولا۔ "ماں بیمار ہے..... تو یہ

بات ہے۔" پھر وہ جوہی کے قریب آکر بولا۔

"سات برس کے بعد کیا اب یہ بھی کرے گی؟"

"کیا؟" جوہی نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

جمو بڑی حسرت کے ساتھ بولا "مجھے چھوڑ کر چلی جائے گی۔"

جوہی کچھ نہ بولی۔

جمو پھر بڑے یاس سے بولا۔

"ایسا تو تو نے کبھی نہیں سوچا تھا۔" پھر اس نے گردن جھکا لی اور آہستہ سے بولا "کون مل گیا ہے تجھے، ذرا مجھے تو بتا دے۔"

"تیرا باپ مل گیا ہے۔" جوہی بجلی کی طرح کوند گئی۔

"اری سیدھی طرح بات کر کمینی۔ باپ دادا کیوں کرتی ہے۔" جمو غصہ سے اسکی طرف بڑھا۔ جوہی کے کھلے ہوئے ہاتھ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سے اس کے گال پر ایک تھپڑ جڑ دیا۔ چٹاخ سے ایک آواز آئی۔ اور جمو جیسے جہاں تھا وہیں رک گیا ایک لمحہ کے لیے جیسے جو کچھ جہاں تھا وہیں رک گیا۔ اور پھر جمو نے اپنا منھ پھیر لیا۔ اور دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر خوب رویا۔ یہاں تک کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

ایسا لگتا تھا کہ سات برسوں کی ساری کسک اور گھٹن لاوے کی طرح پھوٹ پڑی ہو۔ جیسے جوہی کے اس ایک تھپڑ سے پروائی چل گئی ہو۔ اور پچھلے سات برسوں کی ساری چوٹیں ایک ساتھ چمک اٹھی ہوں۔ جیسے وہ یہ تھپڑ ہو جو کسی خوددار بچے کے پہلی بار پڑتا ہے۔ شائد یہ وہ تھپڑ تھا جس نے جمو کی مردانگی کو پہلی بار جھنجوڑ

کر رکھ دیا تھا۔ جوہی نے اتنی دیر میں گٹھری سنبھالی اور چھلاوے کی طرح گھر کے آنگن سے نکل گئی۔

شام ہونے کو آرہی تھی۔ وہ دروازہ جس سے ابھی جوہی ہو کر گئی تھی پاٹوپاٹ کھلا تھا ایک بارگی جمو جیسے چونک پڑا۔ اس نے اپنے ماتھے پر بکھرے ہوئے بالوں کو جھٹکے سے پیچھے ڈالا۔ برآمدے کے کونے میں کھڑی ہوئی لاٹھی ہاتھ میں لے کر اور پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ دروازے میں تالہ ڈال کر خود بھی ایک سمت چل دیا ــــ

جمو سیدھا اسٹیشن پہنچا۔ اسٹیشن پر اس نے جوہی کو سوار ہوتے ہوئے دیکھا تو خود بھی ایک ڈبے میں سوار ہوگیا۔ اور گاڑی جب سلیم پورے کے پلیٹ فارم پر رکی تو جمو نے اپنے ڈبے سے باہر جھانک کر بہت غور سے اترنے والوں کو دیکھا۔ اپنے برابر والے ڈبے سے جوہی کو اترتے دیکھ کر جمو بھی چپ چاپ اتر پڑا۔ اور پھر مسافروں کی بھیڑ سے ہوتا ہوا وہ ایک فاصلے پر جوہی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

رات کا وقت تھا۔ اسٹیشن سے باہر نکل کر جوہی اپنے گاؤں کی سمت مڑ گئی۔ سلیم پورے سے اس کا گاؤں تقریباً دو میل تھا۔ اور اس دو میل کے فاصلے پر نہ کوئی سڑک تھی اور نہ آبادی جھاڑ جھنکاڑ اور ویران پگڈنڈیوں سے ہو کر یہ راستہ گذرتا تھا۔ جوہی بے جھجک قدم اٹھائے اندھیرے میں آگے بڑھتی جارہی تھی۔ تقریباً گیارہ بجے ہوں گے۔ دور پر گاؤں کے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آرہی تھیں ــــ تا حدّ نظر پھیلے ہوئے میدان اور جھاڑیاں اندھیرے کی چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ تقریباً ایک میل چل کر جب راستہ ایک گنجان جھاڑی سے ہو کر گذر رہا

تھا تو جمو نے تیز تیز قدموں سے چل کر جوہی کو جا لیا اور منھ سے کچھ کہے بغیر اپنی لاٹھی کو جوہی پر برسانے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے آٹھ دس لاٹھیاں جوہی کے جسم پر برسا دیں جوہی چیخی چلائی اور پھر زمین پر ڈھیر ہو کر سسکنے لگی۔ اسکے پیر، گھٹنے، رانیں، کاندھے اور ہاتھ بری طرح زخمی ہوئے تھے۔ لاٹھیاں برسانے کے بعد جمو نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھا، اپنی سانسوں کو قابو میں کیا پھر بولا۔

"وہاں تو اپنے چاہنے والوں پر پھولتی تھی، اب یہاں بلا اپنے یاروں کو۔"

جوہی بے دم ہو چکی تھی۔ وہ پھر بولا۔

"اب مار مجھے کٹیز۔"

جوہی کی ہڈیاں جیسے چیخ رہی تھیں۔ اس کے منھ سے دبی دبی کراہیں نکل رہی تھیں۔ جمو بولا "حرامزادی سمجھتی تھی کہ میں زنانہ ہوں۔ اپنے یاروں پر پھولتی تھی لے اب بلا یہاں اپنے یاروں کو۔"

یہ کہہ کر جمو نے زمین پر تھوکا اور الٹے پاؤں چل دیا، جوہی کو سسکتا چھوڑ کر۔ اس ویرانے اور رات کے اندھیرے میں۔ لیکن وہ ابھی آدھا فرلانگ گیا ہوگا کہ چلتے چلتے رک گیا اس نے گھوم کر ایک بار اپنے چھوڑے ہوئے راستہ کی طرف دیکھا۔ دور دور تک سائیں سائیں کرتا ہوا اندھیرا تھا جھینگروں کی آوازیں، اور اس ویرانے میں آدھ فرلانگ دور زخم خوردہ جوہی زمین پر پڑی سسک رہی تھی۔

جمو ایک لمحہ گردن جھکائے سوچتا رہا اور پھر نہ جانے کیا سوچ کر پلٹ پڑا۔

وہ جوہی کے قریب پہنچ کر رک گیا کچھ دیر کھڑا اسے یونہی دیکھتا رہا۔ پھر جھک کر جوہی کو اپنے کندھے پر لاد ا اور چپ چاپ گاؤں کی طرف چل دیا۔ جب وہ گاؤں سے چند گز کے فاصلے پر رہ گیا تو اس نے جوہی کو ایک کھیت کی مینڈ پر ڈال دیا اور اپنی لاٹھی کندھے پر رکھ کر اسٹیشن کی طرف جس راستے سے آیا تھا تیز قدموں کے ساتھ لوٹ گیا۔

وہ رات گزر گئی۔

اور کبھی راتیں گزر گئیں۔

اکیلی ویران اور یاس وحرماں کی سنسان راتیں۔ لیکن جوہی نہ لوٹ کر آئی۔ جمو دن رات گھر پر اکیلا پڑا رہتا۔ شروع کے کچھ دن بڑے کرب اور بےچینی سے اس نے کاٹے تھے اس درمیان اس نے کئی برتن بیچے اور کھائے۔

رات آتی تو ایک، دو بجے کے قریب اس کی آنکھ کھل جاتی اسے ایسا لگتا جیسے کوئی جوہی کو پکار رہا ہو۔ وہ دروازہ کھول کر باہر آجاتا۔ جماہی لے کر گلی میں ادھر ادھر دیکھتا اور پھر پائنچہ اٹھا کر نالی میں پیشاب کرنے بیٹھ جاتا۔ دن کو وہ برآمدے میں پیال کے اوپر پڑا رہتا۔ ڈیوڑھی میں مونڈھا بچھا کر نہ بیٹھتا۔ ایک رات جمو نے خواب میں دیکھا کہ جوہی اس کے پاس آئی ہے۔ وہ چپکے سے سرہانے بیٹھ گئی اور جمو کے سر کو اپنے زانو پر رکھ لیا ہو۔ جمو نے بڑے کرب کے ساتھ اس سے کہا۔

"ایک بات پوچھوں۔ بتائے گی؟"

"پوچھ!" وہ بولی۔

"کیا میں نے تجھے کبھی دل سے نہیں چاہا جوہی؟"

"چاہا" وہ آہستہ سے بولی۔
"کیا میں نے محنت مزدوری کر کے تجھے دودھ ربڑی نہیں کھلائی۔؟"
"کھلائی۔"
"کیا میں تجھے دکھی دیکھ کر رو نہیں دیتا تھا۔؟"
"جو ہی نے اقرار میں گردن ہلا دی۔
"تو بیچاسوں بار میری محنت کی کمائی ہاری۔ میں نے کبھی تجھ سے کچھ کہا۔؟"
"نہیں۔"
"تو نے جو چاہا تجھ کو ملا نا؟"
"ہاں" وہ چپکے سے گردن جھکا کر بولی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ آنکھوں کے پپوٹے بوجھل ہو گئے اور ہونٹوں کے کونے پھڑ پھڑا رہے تھے کہ جمو نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔
تو پھر بتا۔ جو ہی تو غیر مردوں کے ساتھ کیوں سوتی تھی؟"
وہ گھٹے ہوئے انداز میں بولی" میرے گھر سیانی لڑکیاں بھیک نہیں مانگتی ہیں رے۔ اس عمر میں میری ماں بھی بھیک نہیں مانگتی تھی۔"
"پھر کیا کرتی تھی۔"
"یہی" وہ آہستہ سے بولی۔
"کھلم کھلا" جمو نے حیرت سے پوچھا۔
"چل" وہ قدرے خفگی کے ساتھ بولی"
"پھر کیسے؟"

"برادری میں جانتے سب ہیں۔ پر سب ایک دوسرے سے چھپاتے ہیں۔"

"لیکن تو نے تو مجھ سے شادی کی ہے۔"

"تو کیا ہوا؟" وہ کہنے لگی۔ "ایسی شادیاں تو میری تجھ سے پہلے اور بھی ہو چکی تھیں۔" اور یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔

وہ رو رہی تھی کہ سوتے میں جمو کو ایسا لگا کہ جیسے کوئی کنڈی کھٹکھٹا رہا ہے اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ ساری رات اس نے پیال پر کروٹ بدل بدل کر کاٹی۔ سویرا ہوا تو اسے بھوک لگی تھی وہ اٹھا اور دروازے میں تالہ ڈال کر نکل کھڑا ہوا۔

دوسرے دن لوگوں نے دیکھا جمو بسکٹوں کا جھوا اپنے سر پر رکھ کر صبح سویرے نکل کھڑا ہوتا اور رات کو واپس آتا۔ وہ پھیری میں بسکٹ بیچتا تھا۔ لیکن جمو کو جیسے چپ لگ گئی تھی۔ ایک ایسی خاموشی جو اس کے اندر تک اتر گئی تھی۔ اس خاموشی اور گھٹن میں تین مہینے کا عرصہ گزر گیا تھا۔ یہ تین مہینے کٹ تو گئے لیکن جمو کا راتوں کا اٹھنا ختم نہ ہوا۔

ایک رات جمو بے خبر سو رہا تھا کہ اس کے کانوں میں کنڈی کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ یہ آواز اسے کتنے ہی دنوں سے دھوکہ دے رہی تھی۔ وہ آنکھیں کھولے دروازے کی طرف کان لگائے خاموش لیٹا رہا کہ کنڈی پھر ہلی۔ اس بار وہ آواز پر قدرے چونک پڑا۔ وہ اپنے وہم کی تائید چاہنے کے لیے پھر غور سے دروازے کی طرف کان لگا کر آواز سننے کی کوشش کرنے لگا۔ کھٹ کھٹ کنڈی کی آواز اس بار قدرے زور سے آئی۔

وہ اپنے بستر پر سے اچھل پڑا۔ اس کے ہاتھ پیر پھول گئے دل زوروں

کے ساتھ دھڑکنے لگا۔ وہ پنجوں کے بل انگنائی سے گذر کر دروازے کے قریب آیا۔ شکستہ دروازے کی درازوں پر آنکھیں لگا کر باہر کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔ باہر گلی کے اندھیرے میں اس کے دروازے کے قریب ایک سایہ حرکت کرتے محسوس ہوا۔ مبہم سا ایک سایہ، اس کے آگے وہ کچھ نہ دیکھ سکا۔ اس نے دھیرے سے کمزور آواز میں پوچھا۔

"کون ہے۔؟"

جواب میں خاموشی رہی۔

اس نے دروازہ کھولنے کے لیے جب ہاتھ بڑھایا تو اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ ایک انجانا سا خوف اس پر طاری تھا۔ اس نے کنڈی کھولی اور دروازے کے دونوں پٹ ایک دم سے کھول دیئے اور بیچ دروازے میں ستون کی طرح سینہ تان کر بدن اکڑا کر کھڑا ہو گیا۔ اسے نہ معلوم کیوں ایسا یقین ہو رہا تھا کہ یہ رات اس کی زندگی کی آخری رات ہے۔ موت اس کے سامنے کھڑی ہے۔ وہ اس سے بچ کر کہیں نہیں جا سکے گا۔

وہ دروازہ کھولے کھڑا رہا۔ جمّو کے دل میں جیسے دھونکنی لگی ہوئی تھی۔ ماتھے پر پسینہ ابھر آیا تھا۔ وہ بار بار سائے کی طرف اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد اس کی آنکھوں نے اندھیرے کو قبول کرنا شروع کیا تو اس کے سامنے کھڑے ہوئے سائے کے خدوخال ابھرنے شروع ہو گئے، سر کندھے، بازو، کمر کا خم۔ اور پھر وہ ایک لمبی سی سانس لے کر رہ گیا اس نے اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیری اور دروازے سے ایک قدم اس طرح ہٹ

گیا جیسے آنے والے کو راستہ دینا چاہتا تھا۔ کیونکہ اب اس نے پہچان لیا تھا۔ وہ جوہی تھی۔ جوہی کچھ بولے بغیر اندر آگئی۔ اور چپ چاپ پیال پر بیٹھ گئی۔

طاق میں چھوٹا سا چراغ روشن تھا۔ جمو اسکے قریب ہی بیٹھ گیا۔ دونوں خاموش تھے۔ لیکن یہ خاموشی بہت دیر قائم نہ رہ سکی۔ جمو کو ایسا لگا جیسے اس کا دل اس کے سینے میں پھٹ جائے گی۔ وہ سارے بدن سے کانپ رہا تھا۔ یک بارگی وہ وہ اٹھا اور اس نے اپنا سر جوہی کے قدموں پر رکھ دیا۔ اور اسکے دونوں پیروں کو ٹخنے سے پکڑ لیا۔ وہ بری طرح رو رہا تھا آنسوؤں کے ساتھ، بلک بلک کر، جوہی چپ سادھے بیٹھی رہی۔ بالکل بے حس و حرکت، ایک بے جان مجسمے کی طرح۔ جمو کے آنسو جوہی کے پیروں کو دھو رہے تھے۔ آخر کار ہچکیوں کے درمیان جوہی کو یہ آواز آئی۔

"تو چپ نہ رہ جوہی، تو مجھے مار، خوب مار۔ میں بڑا پاپی ہوں"

جوہی ساکت رہی۔ جمو دہاڑا۔

"تو مجھے مار ڈال جوہی پر مجھے چھوڑ کر مت جا۔ میں تیرے بغیر مر جاؤں گا"

جوہی میں کوئی حرکت نہ ہوئی، جمو پھر بولا۔

"تین مہینے سے جیسے تندور کی بھوبل پر سو رہا ہوں"

یہ کہہ کر وہ سسکنے لگا جوہی میں اب جیسے حرکت ہوئی۔ اس کے چہرے پر شدید اضطرابی کیفیت طاری تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہونٹ بھینچ لئے اور اپنی مٹھی میں جمو کے بال پکڑ کر اس کے سر کو اپنے قدموں سے اٹھایا جمو کی آنکھیں بالکل ٹھنڈی پڑی تھیں ان میں کوئی جذبہ تھا کوئی احساس نہ تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے آنکھوں کے حلقہ میں دو سفید پتھر رکھ دئے گئے ہوں۔ جوہی نے اس کے بالوں کو چھوڑ دیا

اور جمو کا سر پھر جوہی کے قدموں پر جا گرا۔

چند لمحہ سنّاٹا رہا اور پھر جمو آہستہ سے بولا۔

"پھیری کے بہانے تجھے تین مہینے سے سارے شہر میں تلاش کر رہا تھا، خدا قسم پیر میں زخم پڑ گئے ہیں"۔ جوہی نے اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں کے نیچے دبا لیا جیسے وہ کسی اذیت ناک کیفیت سے دوچار ہو۔ جمو پھر بولا۔

"یہ اکیلی دیواریں مجھے کھائے جاتی تھیں جوہی۔ تو کیسی بھی ہو تو میری تھی"۔ یہ کہہ کر وہ پھر بلک بلک کر رونے لگ گیا جوہی نے ہلکے سے منہ گھمایا اور دھیمے سے بولی۔

"اٹھ پیروں پر سے"۔

"نہیں"۔ جمو نے گرفت اور بھی مضبوط کر لی اور تڑپ کر بولا "تو وعدہ کر کہ مجھے چھوڑ کر نہیں جائے گی"۔

"سر تو اوپر اٹھا"۔ جوہی بولی۔

جمو نے پھر بھی سر نہ اٹھایا اور بولا "مجھے اپنے قدموں میں پڑا رہنے دے"۔ پھر کچھ دیر کے لیے سنّاٹا چھا گیا۔ یہ سناٹا جمو کے لیے شائد بہت اہم تھا۔ اسی سنّاٹے میں اس کے ذہن نے ایک سوال بار بار کئی ہتھوڑے مارے تھے۔ جمو نے اپنی ساری طاقت کو ایک جا کیا اور بڑی ہمّت کر کے بولا۔

ایک وعدہ اور کر جوہی، پھر میں تیرا غلام ہو کر رہوں گا"۔

"کیا؟" جوہی بولی۔

"وعدہ کر جوہی کہ اب تو غیر مردوں کے ساتھ نہیں سوئے گی"۔

یہ سنتے ہی جوہی نے تیزی کے ساتھ اپنے پیر جمّو کے سر کے نیچے سے کھینچ لئے۔ جمّو کی پیشانی زمین پر آرہی۔ جمّو نے سر اٹھا کر جوہی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس اثنا میں پہلی بار اس نے جوہی کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ سُتا ہوا اُداس اور تھکا ہوا سا چہرہ جس کی سادگی شگفتگی اور تازگی مرچکی تھی۔ ویران سی آنکھیں، مرجھائے مرجھائے سے ہونٹ، اُلجھے اُلجھے سے پریشان بال، جمّو نے بڑے پیار سے کہا۔

"بول جوہی کرتی ہے وعدہ؟"

"جانتا ہے میں تیرے پاس کیوں آئی ہوں؟" جوہی بہت سپاٹ لہجہ میں بولی۔

"نہیں؟" جمّو سہم گیا۔

"مجھے تجھ سے ایک بات طے کرنی ہے؟"

"کون سی بات؟"

"مجھے طلاق چاہیئے؟"

"جوہی ---!" جمّو جیسے تڑپ اٹھا۔ جوہی اسی سپاٹ لہجہ میں پھر بولی۔

"دو دن کے اندر اندر بس؟"

جمّو پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ جوہی اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

"میرے کپڑے لتے کہاں ہیں؟"

"سب رکھے ہیں جیسے تو چھوڑ گئی تھی؟"

"میں کل آکر لے جاؤں گی؟" یہ کہہ کر جوہی اٹھ کھڑی ہوئی کہ جمّو نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔

"مجھے ایسے نہ مارو جوہی میرا دم گھٹ جائے گا؟"

جوہی نے ایک بار اس کی طرف دیکھا اور پھر ہاتھ چھڑا کر بولی "میرے کپڑے الگ نکال کر رکھ دینا" اور یہ کہہ کر وہ چلدی۔ مگر دروازے پر پہنچ کر اسے دروازے کے پٹ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ اسے چکر آگیا تھا۔ جب وہ دروازے سے نکل کر گلی کے نکڑ پر پہنچی تو اس نے دوپٹے کے آنچل سے ان آنسوؤں کو آہستہ سے پونچھ لیا جو اس کی آنکھوں سے دہلیز پار کرتے ہوئے باہر نکل آئے تھے۔

رات خاموش گذر گئی۔ اور جب صبح ہوئی تو جمو کو جیسے چپ لگ گئی۔ شام کو جوہی پھر آئی تھی۔ جمو دروازہ کھولے پیال پر بیٹھا تھا اور جوہی کا انتظار کر رہا تھا۔

جوہی نے آتے ہی پوچھا "میرے کپڑے نکال لیئے نا؟"

جمو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جوہی کوٹھری میں گھس گئی اور ایک بوسیدہ سی کالے رنگ کی پیٹی نکال لائی۔ اور کپڑوں کو الٹ پلٹ کر کے باہر نکال کر ایک چھوٹی سی چادر میں رکھنے لگی اور بولی۔

" تیری پیٹی خالی کر کے چھوڑے جا رہی ہوں "

جمو نے کوئی جواب نہ دیا، یکبارگی وہ پھر چونکی۔

" سامنے جو تانبے کا گگرا رکھا تھا کیا ہوا۔؟"

وہ میرا تھا.... میری کمائی کا " جمو چپکے سے بولا۔

" میں کب کہتی ہوں کہ وہ میری کمائی کا تھا۔ پر ہوا کیا؟" جوہی تنک کر بولی۔

" میں نے بیچ ڈالا " جمو نے چپکے سے کہا۔

جوہی نے سُنا اور سن کر چپ ہو گئی۔ کپڑے نکالتے میں جیسے اسے کچھ یاد آگیا۔ انگنائی سے اٹھی اور اٹھ کر کوٹھری کی طرف لپکی۔ لیکن برآمدے میں پہنچ کر اس نے

دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ اور جمو لپک کر اگر اسے روک نہ لیتا تو وہ
اتنی زور سے چکرائی تھی کہ کھڑے قد سے زمین پر آرہتی۔ جمو نے اسے گود میں لے کر
پیال پر لٹا دیا اور بولا "کیا ہوا جوہی۔ کیا بات ہو گئی ہے جوہی"
جوہی کا دماغ ابھی قابو میں نہیں آیا تھا۔ جمو اس پر جھک کر بولا "تیرا جی ٹھیک
نہیں دکھائی دیتا تو لیٹ جا میں باندھے دیتا ہوں تیرا سامان" جوہی کچھ نہ بولی۔
جمو اس کو غور سے دیکھنے لگا۔ جوہی چپ چاپ لیٹی تھی۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹے
بند تھے اور اس کی پلکیں اس کی آنکھوں کے حلقوں پر جھکی ہوئی تھیں۔ یہ وہ جوہی
نہیں تھی جو چاندنی راتوں میں کھلی چھت پر آڑی ترچھی انگڑائیاں لیتی ہو۔ جو ہونٹوں
کے کونوں میں سگریٹ دبا کر تاش کے باون پتوں کو پھینٹتی ہو اور جس کی جانگ کے نیچے
سے کتنے ہی مرد پھل پھلا کر نکل گئے ہوں۔ جمو نے دیکھا کہ اس وقت وہ ایک ناتواں
اور بیمار چیل کے مانند تھی جو اپنے گھونسلے میں پر ڈالے حسرت سے کھلے ہوئے آسمان کی
طرف تکتی ہے۔ یک بارگی جوہی نے اپنے ہونٹ سکوڑے اور بولی "میرا سر درد سے
پھٹا جا رہا ہے"
جمو جو اسکے چہرے کو حسرت سے تک رہا تھا چونک پڑا۔ منھ سے کچھ نہ بولا۔
لیکن اس نے دھیرے سے اپنے دونوں ہاتھ بڑھا کر جوہی کے ماتھے پر رکھ دیئے۔
جوہی کچھ نہ بولی تو اس نے دھیرے دھیرے جوہی کا سر دبانا شروع کر دیا۔ وہ سر دباتا
رہا کہ اس درمیان نہ جانے کب جوہی کو نیند آ گئی۔ لیکن جمو جوہی کے سرہانے بیٹھا رہا۔
گم سم جوہی کے سوئے ہوئے چہرے پر آنکھیں گڑوئے رات بڑی تھکی تھکی سی گذرتی
رہی۔ اور جمو کی آنکھوں سے دھیرے دھیرے جیسے شبنم گرتی ہے آنسو ٹپکتے رہے لیکن

رات کو کوئی دو بجے ہوں گے کہ جوہی کی آنکھ کھل گئی۔ جمّو نے پھر اس کا سر دبانا شروع کر دیا، جوہی کچھ دیر چپ رہی اور پھر بولی۔

"جمو!"

"کیا ہے؟"

"مجھے طلاق دے دے گا نا؟"

جمّو نے یہ سن کر اپنا سر پیچھے کی طرف گھما لیا۔ اور دونوں آنکھیں کس کے بھینچ لیں ــــ

جوہی بولی: "جوئے کے اڈے پر ایک دلال سے معاملہ طے ہو گیا ہے رے۔ میری بھی آرام سے گزر جائے گی اور تو بھی روز روز کی ہائے ہائے سے چھوٹ جائے گا۔"

جمو چپ رہا۔

جوہی نے گردن کر اوپر کی طرف ذرا سی جنبش دے کر جمو کی آنکھوں میں دیکھا دونوں چپ تھے۔ جو دھیرے دھیرے اب بھی جوہی کا سر دبا رہا تھا کہ یک بارگی جوہی نے جلدی سے جمو کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بول مان لے گا میری بات؟"

"مان لوں گا۔" جمو کہیں بہت دور سے بولا: "پر خود ندی میں کبھی پھاند پڑوں گا۔"

اور پھر کچھ دیر کے لیے سنّاٹا چھا گیا۔

دونوں چپ تھے۔ جمو دھیرے دھیرے اب بھی جوہی کا سر دبا رہا تھا۔ جوہی نے یکایک اپنے ہاتھ آہستہ سے بڑھائے اور جمو کے دونوں ہاتھوں کو بڑی نرمی

کے ساتھ کلائی سے پکڑ لیا رات کا چھایا ہوا سکوت جیسے کمنا کر رہ گیا۔ جوہی نے آہستہ آہستہ اس کے ہاتھوں کو اپنے سینہ کی طرف کھینچا۔ اور پھر جیسے رات کی خاموشی کے لبوں پر ایک ارتعاش سا پیدا ہو گیا۔ ارتعاش جو بولا گیا۔ ایک تارہ کی طرح مدھم مدھم ہولے ہولے۔ جوہی پھر بولی۔

"جمو۔"

"ہاں" جمو نے منہ سے بڑی کرب انگیز آواز نکالی۔ جوہی نے اس کے ہاتھوں کو نہیں چھوڑا بلکہ کچھ اور اپنی طرف کھینچ کر بولی۔

"تو نے نشہ کرنا چھوڑ دیا کیا۔ ؟"

"چھوڑ دیا" جمو نے ٹھہرے ہوئے لہجہ میں کہا۔

"میں نے بھی چھوڑ دیا" یہ کہہ کر اس نے بڑی عجیب نگاہوں سے جمو کی طرف دیکھا اور ہنس پڑی۔

"تو نے" جمو نے بھولے پن سے کہا "تو کون نشہ کرتی تھی ؟"

"میرا نشہ بڑا مہنگا تھا رے" وہ مسکرائی "بہت دیر بعد اترا ہے" پھر اس نے جمو کی دونوں ہتھیلیوں کو اپنے ہونٹوں پر رکھ لیا۔ جوہی کی دونوں آنکھیں شدت جذبات سے بھیگ گئی تھیں۔ وہ بولی۔

اب جب نشہ اترنے پر جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے تو......" یہ کہہ کر وہ رک گئی۔ اس نے اپنے چہرے کو جمو کے دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور بولی "تو کیا تو ایسی گھڑی میں مجھے طلاق دے دے گا"

"تو ہی تو کہہ رہی تھی" جمو نے حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تو تو پگلا ہے رے" وہ تڑپ کر بولی۔

"تجھ سے ملنے کو من کرتا تھا۔ اس سے یہ بہانہ کر کے چلی آئی"

اور پھر جوہی نے جمّو کو اپنے سینہ سے چمٹا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پتھر کی رگ پھٹ گئی تھی۔ اور اس سے پانی کا فوّارہ چھوٹ رہا تھا"

■ ■

میرے بعد

سامنے جس مکان کی چھت پر کائی جم گئی تھی اور گھاس اُگ آئی تھی، وہاں سے زار و قطار رونے کی صدائیں آرہی تھیں۔ کمرے کے باہری بیٹھک میں جو بوسیدہ ہو چکی تھی پرسہ دینے والے گردن جھکائے آتے اور بیٹھ جاتے۔ ابھی جنازے میں کافی دیر تھی۔ میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی جو اس سمت کھلتی تھی بند کر لی۔ صبح کی ڈاک سے ایک نیا رسالہ آیا تھا۔ یونہی الٹ پلٹ کر میں اُسے دیکھنے لگا۔ کہانی جس نے لکھی تھی اس کے نام نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا اور میں نے کہانی کو پڑھنا شروع کر دیا۔

یوں شروع ہوتی ہے وہ کہانی:
یہ آنکھیں کبھی ریگستان کی طرح تپتی تھیں۔
میں سمجھتا تھا کہ یہ آنکھیں اب اس طرح بہیں گی جیسے ندی نالوں میں باڑھ

آجائے۔

مگر یہ آنکھیں اب بھی ریگستان ہی کی طرح تپ رہی ہیں۔

رات کے اندھیرے گہرے ہو گئے تھے اور جاڑا بڑا سرد پڑ رہا تھا۔ میں بابا میاں کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ پاس ہی مسہری پر لحاف میں لپٹے ہوئے بیٹھے تھے۔ کچھ دیر سکوت رہا۔ آخرکار ان میں حرکت ہوئی اور پھر وہ بولے۔

"احمد وقت بھی عجیب چیز ہے اگر تم میرے زمانے میں پیدا ہوئے ہوتے تو تمہیں یہی لکھنؤ شاید پہچاننے میں نہ آتا۔ حسین آباد کے قریب مرزا علی خاں کے احاطہ میں ہم رہتے تھے۔ وہ در و دیوار جو آج سربزانو کھڑے ہیں، ان ہی کی ڈیوڑھیوں میں نوبتیں بجا کرتی تھیں۔ کسی دن فلاں نواب صاحب کی بیگم کی چھٹی کا نہان ہے اس لئے نوبت بج رہی ہے کسی دن بڑے نواب کے پوتے کا عقیقہ ہے اس لئے شہنائیاں سُر ملا رہی ہیں کبھی کسی نواب کے اٹھارہ برس کے دودھ پیتے بچے کی بسم اللہ ہے، اس لئے نگاڑہ پٹ رہا ہے۔ غرضکہ ایک نہ ایک بہانہ یار لوگوں کو مل ہی جاتا تھا۔" مجھے ہنسی آگئی۔ لیکن بابا میاں کچھ اور سنجیدہ ہو گئے، کہنے لگے

"میرے باپ بھی نواب شجاعت مرزا کے یہاں ملازم تھے۔ نواب بڑے بلے وثیقہ دار تھے۔ میرے باپ نے میری ماں کے ہوتے ہوئے دو شادیاں کر لیں۔ ایک مہینہ ایک کے یہاں گذارتے، دوسرا مہینہ دوسرے کے یہاں شاید اسی کوفت میں آخرکار میری ماں گھل گھل کر مر گئیں۔"

یہ کہہ کر بابا میاں جیسے کسی سوچ میں پڑ گئے۔ مجھے معلوم تھا کہ بابا میاں نے اپنا بچپن کس طرح گذارا، تعلیم کیا ملی۔ ان کے زمانے میں تعلیم کا چلن ہی نہ تھا۔ ان

کے باپ نے انھیں پیرا کی سکھائی، اکھاڑے میں کشتی لڑنے بھیجا، بنوٹ سکھائی، مکتب میں بٹھایا، عربی فارسی کی تعلیم ہی شرفا میں رائج تھی۔ پاپا میاں کچھ توقف کے بعد پھر بولے۔

"احمد، میرے والد۔ مجھے جس راستے پر لگانا چاہتے تھے مجھے اس سے ازلی نفرت تھی۔ غضب خدا کا، ابھی میری عمر بیس ہی سال کی ہوئی تھی اور میری مسیں ہی بھیگی تھیں کہ ایک عجیب حادثہ ہوا۔"

اور یہ کہہ کر پاپا میاں بہت مزے لے لے کر وہ حادثہ بیان کرنے لگے۔

"ہوا یہ کہ ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں ذرا قاعدے سے کپڑے ویڑے پہن کر تیار ہو جاؤں۔ مجھے ان کے ساتھ ایک جگہ ضروری کام سے چلنا ہوگا۔ میں تیار ہو گیا۔ نواب شجاعت علی کا ان دنوں بڑا چرچا تھا۔ ہر وقت باہر دیوان خانے میں مسند لگی رہتی، اور نواب صاحب اپنا دربار لگائے بیٹھے رہتے۔ جو جاتا اشرفیوں کی نذر پیش کرتا، اور ان اشرفیوں میں نواب صاحب کی طرف سے کچھ اور اشرفیاں ملا کر وہ نذر واپس کر دی جاتی۔"

"میرے والد نے مجھے ایک کونے میں بٹھا دیا۔ میں مؤدب بیٹھا رہا، اور جب خاصہ لگایا گیا تو والد صاحب نے مجھے اپنے قریب بٹھایا اور میرے کان میں کہا "ذرا ہاتھ روک کر کھانا۔"

خدا جانے کتنے رنگ کے کھانے تھے، اور کتنے رنگ کے مزے۔ میں نے لقمہ کو منھ تک لے جانے میں بڑے تکلف کا اظہار کیا کھانے کے بعد مجھے ایک خاص کمرے میں لے جایا گیا، جہاں میں بہت دیر تک اکیلا بیٹھا رہا۔ وہاں مجھے احساس ہوا کہ نواب

صاحب کے زنان خانے کی سمت پڑی ہوئی چلمن کے پیچھے ایک اتھل پتھل سی مچی ہوئی ہو۔ میں نے دھیمی دھیمی آوازیں سنیں، کپڑوں کی سرسراہٹیں، چوڑیوں کی آوازیں، کبھی کبھی چلمن اس طرح ہلتی جیسے کوئی ہجوم ہے جو اس کے پیچھے ٹوٹا پڑ رہا ہے۔ میں معاملے کو تاڑ گیا۔" یہ کہہ کر پاپا میاں مسکرائے اور بولے۔

"جانتے ہو میرے والد مجھے وہاں کیوں لے گئے تھے!"

"بر دکھوے کے لیے۔" میں نے یقین سے کہا۔ اور پاپا ہنسنے لگے۔ بولے۔

"میں تو خیر اس چکر سے صاف نکل گیا اور میری اس نافرمانی پر میرے باپ نے مجھے گھر سے نکال دیا۔ مگر ایک دارو غہ جی اس چکر میں آ گئے، اور نواب صاحب کی لڑکی سے ان کی شادی ہو گئی۔ کچھ دنوں بعد ان داروغہ سے میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھ سے کہا۔

"ارے بھئی بڑے خوش قسمت ہو بچ گئے۔ خدا کی قسم بڑی سرد مار عورت نکلی۔ جوتے پیزار سے بھی باز نہیں آتی۔" یہ کہہ کر پاپا میاں نے میری طرف دیکھا، اور پھر سلسلہ شروع کر دیا۔

"میرے دو بھائی تو پہلے ہی آوارہ آواراؤں کی طرح مارے مارے گھومتے تھے، باپ نے مجھے بھی نکال دیا۔ کئی کئی وقت کے فاقے کیے مگر کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ بڑے ڈاک خانے کی فٹ پاتھ پر قلم دوات لے کر بیٹھتا تھا۔

"اس زمانہ میں ایک لالہ نے اپنے لڑکے کو پڑھانے کے لیے ۵ روپیہ مہینہ پر مقرر کر لیا، لیکن وہ لالہ بھی عجیب تھا۔ میں نے کئی بار دیکھا کہ کوٹھے کے جس کمرے میں میں لڑکے کو پڑھاتا تھا اس کی دیواروں کی کھونٹیوں پر سونے کے توڑے اور چھاگلیں

لٹکی ہوتیں۔ جب میں پڑھا کر نیچے آتا تو لالہ کچھ دیر کے لیے مجھے اپنے پاس بٹھا لیتا، اور ایک آدمی کو اشارہ کر کے پھر اوپر والے کمرے میں بھیج دیتا۔ جب وہ آدمی واپس آجاتا تو لالہ مجھے مسکراتے ہوئے چہرے سے واپس کر دیتا۔

ایک دن مجھے لڑکے نے بتایا کہ ماسٹر صاحب، جب آپ پڑھا کر نیچے چلے جاتے ہیں تو ماما جی آکر یہ سارے زیورات گنتے ہیں۔ یہ سن کر مجھے بڑا غصہ آیا اور میں نے ایک دن لالہ سے کہہ دیا،

"لالہ جی میں غریب آدمی ہوں۔ جس دن لڑکے کے ماما جی گنتی بھول گئے میں جیل میں نظر آؤں گا۔" بس اس دن سے میں نے لالہ جی کے گھر کی صورت نہ دیکھی۔ غرضکہ احمد، شب و روز ایک ہی جستجو رہتی۔ آخر کار سرکاری دفتر میں دس روپے مہینے کی مزدوری مل گئی۔ محنت اور ایمانداری سے گزارا کیا۔

"ڈیپارٹمنٹل امتحانات پاس کیے، کلکتہ وغیرہ میں ٹریننگ لی۔ ترقی ہوتی رہی، غرضکہ ساڑھے تین سو تک پہنچ گیا۔"

اور پھر پاپا میاں کی زندگی کے بہترین سال جیسے ایک لمحہ کے لیے میری نگاہوں کے سامنے سے ناچتے ہوئے گزر گئے۔

یہ نیلا تالاب کے کنول گٹے، اونچے چبوترے پر کھڑا ہوا آسمانی رنگ کا وہ بنگلہ جس کے دائیں اور بائیں اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کی خوبصورت عمارتیں تھیں، بنگلے کے پہلو میں لیٹی ہوئی وہ صاف شفاف سڑک جس پر روز صبح سنگرام پور کے مہاراج گھوڑے پر سوار ہو کر گزرتے تھے۔ وہ بوڑھا خانساماں امامی جو کڑکڑاتے جاڑے میں صبح سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر گاؤں سے آنے والی بکری کی سے لدی بیل گاڑی

کا انتظار کرتا۔

گرمی کی وہ شامیں جب باہر چبوترے پر چھڑکاؤ کرکے کرسیاں ڈالی جاتیں اور میں پاپا میاں کے مہمانوں کو شرارتاً مٹھائی کی سگریٹ پیش کرتا۔ مجھے اپنے ماسٹر سے بڑی نفرت تھی جو روز صبح مجھے پڑھانے کے لیے آتا اور مجھے میرا سبق دے کر خود پندرہ منٹ کے لیے ایک کونے میں الٹے کھڑے ہو کر شیش آسن کیا کرتا۔ اور بڑے گھیر کا لہنگا پہننے والی کالی بھجنگ پٹھانی کیسا مٹک مٹک کر آتی تھی۔

"چلیے میاں دسترخوان لگ گیا ہے۔"

ہم سب دسترخوان پر جا کر بیٹھ گئے تھے۔ پاپا میاں آخر میرے بغیر کھانا کیوں نہیں کھاتے تھے۔ خود ہی تو سر پر چڑھا رکھا تھا۔ اب جو میں نے ڈونگے میں مکھی پڑی دیکھی تو سالن سے بھرا ڈونگہ اٹھایا اور پاپا میاں سے کہا

"دیکھئے تو پٹھانی بالکل گندی ہے۔" پاپا میاں چراغ پا ہو گئے، بولے۔

"مار دو حرامزادی کے منھ پر۔" میں نے ڈونگہ منھ پر تو نہیں مارا، ہاں اٹھایا اور چھن سے آنگن میں پھینک دیا۔ ڈنر کا خوبصورت سیٹ ایک ڈونگے کے ٹوٹ جانے پر بیکار ہو گیا تو کیا ہوا مجھے نفاست کی ترتیب ٹوٹ گئی۔ لیکن ابھی ایک صدی بھی نہیں گزری۔ اگر سالن میں ذرا سا نمک تیز ہو جاتا ہے تو پاپا میاں اپنی بیٹی پر بگڑتے کیوں ہیں اتنا۔ بیوہ عورت کا دل کتنا نازک ہوتا ہے یہ بھی نہیں سوچتے۔

نعیمہ باجی کو ڈانٹنے کو تو پاپا میاں نے ڈانٹ دیا، مگر ریگستان کی طرح تپتی ہوئی وہ آنکھیں کچھ نم بھی ہو گئیں۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا یہ منظر اپنی آنکھوں سے پہلی بار دیکھا تھا۔ پاپا میاں جیسا اصول پرست آدمی کون ہو گا۔ ان

کے چھوٹے بھائی بالکل جاہل کھیّڈ تھے۔ زندگی بھر تیرے میرے گھر کے لوٹے برتن چرا کر مدک پیتے رہے۔ آخر وقتوں میں بیمار پڑے تو میڈیکل کالج میں بھرتی ہوئے۔ جس دن وہاں سے چھٹی ملی تو وہاں کی لٹیا چرا لائے۔ ایک دن پاپا میاں سے کچھ پیسے مانگنے آئے تو پاپا میاں نے ڈانٹ کر بھگا دیا۔ لیکن ان آنکھوں میں اس دن بھی ایک آنسو نہ تھا۔

چالیس انچ کا سینہ، سات فٹ کا قد، کبابوں کا قیمہ تو سِل پر پیسنے کے بجائے ران میں جھٹکے مار مار کر اڑا جاتے تھے، لیکن اب بخار کے ایک ہی جھٹکے میں ہڈیاں نکل آئی ہیں۔

پہلے تو ایک سگے بھائی کو ٹھوکریں مار کر بھگا دیا تھا مگر اب مرزا کو اپنے گلے لگائے بیٹھے ہیں۔ مرزا کے ساتھ ان کا پورا کنبہ ہے۔ پاپا کو اس کا احساس تھا اسی لیے تو انہوں نے کہا تھا:

"مرزا کو اپنے قریب رکھنے کو میرا دل تو نہیں چاہتا احمد۔ اسی محلّے میں جس میں میں نے اپنی عزت بنائی ہے یہ میرا نام اچھال رہے ہیں۔ ایک بھائی کو میں نے ٹھوکریں مار کر بھگا دیا۔ خدا جانے وہ کہاں مر کھپ گیا۔ اب ذرا غور کرو، ساری جوانی تو ان حضرت نے جیل میں کاٹی، سانڈ کی طرح آوارگی کی۔ ایک نٹنی ہاتھ آ گئی تو بھگا لائے۔ اب اس بڑھاپے میں رات بھر کھانستے ہیں، اور اس سے بچے جنواتے ہیں۔ نہ کوئی کام نہ کاج، عورت حرامزادی میری ہی ملاقاتنوں کے یہاں برتن مانجھتی رہتی ہے۔ اور مزے کی بات تو یہ ہو کہ اپنے مالکوں سے مجھ کو اپنا عزیز داد بتاتی رہے۔"

"میں معاملے کی نزاکت کو نہ جانتا تھا۔ جوش میں آکر کہہ بیٹھا "یہ کمزوری خود آپ کی ہے۔ کہہ کیوں نہیں دیتے کہ جہاں جی میں آئے اپنی بیوی بچّوں کو لے کر چلے جاؤ۔"

انھوں نے میری بات سُنی، کچھ دیر خاموش رہے پھر آہستہ سے بولے "اب بیس سال ہوئے اگر میں اس بڑھاپے میں مرزا کو بے سہارا چھوڑ دوں اور وہ پھر کوئی حماقت کر بیٹھے تو بیس سال کا پرانا ریکارڈ اسے جیل میں بند کر دے گا۔ کل کا مرتا آج مر جائے گا۔"

"بس تو پھر بھگتیے، ۷۰ روپے کی پنشن میں اقربا پروری کہاں سے کیجیے گا۔" جی میں آیا کہہ دوں، مگر خاموش رہا۔ مرزا جی اکیلے تو تھے نہیں، بیوی تھی، اور بچے بھی اور پھر دس ایک منٹ کو کون بیٹھ کر کھاتا اور سب پانی راتوں کو سوتے دیکھ سکتا تھا۔

ایک دن کی بات ہو تو کوئی منھ پھیر لے، وہاں تو آئے دن یہی رہتا ہے۔ جب کام بھی نہ لگے تو پیسہ کہاں سے آئے۔ دن بھر برابر والے کھنڈر میں پڑے رہتے۔ آخر کار نعیمہ باجی نے سالن کے پیالے پر چپاتیاں ڈھک کر کھڑکی کے راستے کھنڈر میں بھیجنا شروع کر دیں۔

اور پھر یہ معمول بن گیا۔ مگر مہینہ بھر کا خرچ ۱۵ ہی دن میں نپٹ گیا۔ نعیمہ باجی خرچ کے پیسے پاپا میاں کے پاس گئیں تو وہ انھیں کھانے کو دوڑ پڑے۔ مجبوراً نعیمہ باجی نے چاندی کا خاصدان گروی رکھ دیا۔ کب واپس آئے گا۔ کیا پتہ؟

پاپا میاں کے ساتھ ایک میرا اپنا وجود بھی تھا۔ ایک جیتا جاگتا وجود جو سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ ایک آگ تھی جو آہستہ آہستہ سلگ رہی تھی، ایک دھواں تھا جو میرے سینے میں گھُٹ رہا تھا۔ اب اسی دن کی بات ہے اب جو گھر میں داخل ہوا تو جیسے سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ پاپا میاں کے کمرے میں گیا تو وہ مجھ پہ برس پڑے۔ صبح بجلی کا

بل آیا تھا۔ بائیس یونٹ بجلی خرچ ہوئی تھی ۔ مجھ سے بولے۔

"کہاں سے ادا ہوگا یہ پیسہ ؟"

میں نے بل دیکھا اور چپ ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد اخبار والا اخبار کے پیسے مانگنے آیا۔ پاپا میاں نے پیسے دے دیئے ۔ مگر آئندہ اخبار لانے کو منع کر دیا۔ میں خاموش دیکھتا رہا۔ نجمہ کو بھی یہی وقت رہ گیا تھا۔ منھ پر آکر کھڑی ہوگئی۔ پاپا میاں کچھ دیر تو جیسے مراقبے میں رہے مگر پھر گردن اٹھا کر اس سے بولے

"کیا بات ہے جی ؟"

"فیس نہیں دیجیے گا ؟ آج پندرہ تاریخ ہے ۔"

"فیس ؟" پاپا میاں چونکے۔" میں کہتا ہوں تم لوگ عین وقت پر نادر شاہی حکم لگا دیتے ہو۔ سو بار کہا کہ پہلے سے مانگا کرو ۔" پھر وہ بڑبڑانے لگے۔

" اسکول کیا ہے ڈاکوؤں کا اڈہ ہے ۔ پچھلے مہینہ دس روپے کا نوٹ دیا۔ سب لے کر بیٹھ رہے۔ خدا جانے کون کون سے فنڈ کھول رکھے ہیں۔ امدادی فنڈ، بلڈنگ فنڈ ۔" پھر ایک دم تنک کر بولے۔

"جاؤ جی نہیں دوں گا فیس ویس ۔" نجمہ چلی گئی منھ لٹکائے ، لیکن وہ دروازے تک گئی ہوگی کہ پاپا میاں نے آواز دی۔ دراز سے روپے نکالے اور بولے

"جمع کر دو، مگر رسید لیتی آنا ۔"

میری جان جل بھن کر رہ گئی ۔ جب اسکول کھلا تھا اور لڑکیاں فیس معاف کروانے کے فارم لا رہی تھیں تو نجمہ بھی ایک فارم لائی تھی۔ مگر خود ہی حضرت نے اس پر غصہ کرکے فارم واپس کروا دیا تھا۔

"کیا ضرورت ہے فیس معاف کروانے کی؟ اسکول میں تم سے بھی زیادہ مستحق لڑکیاں ہوں گی۔ ان کا حق چھینتی ہو" اسی بات پر اگر بول اٹھتا تو سینکڑوں باتیں سننے کو ملتیں۔

میرا دم جیسے اب گھٹنے لگا تھا۔ پاپا میاں سب کو گلے لگائے تھے۔ مرزاجی، ان کی بیوی بچے، نعیمہ باجی ان کے بچے اور ایک میں تھا جو اپنی تعلیم کے بعد بیکاری کے طویل اندھیروں میں بھٹک رہا تھا۔ بی۔ اے کے بعد پاپا میاں نے لاکھ چاہا کہ میں ایم۔ اے میں داخلہ لے لوں، مگر ان کی یہ چاہت کس قدر بناوٹی تھی یہ بات مجھ سے کچھ زیادہ ہی وہ جانتے تھے۔ وہ مجھے نہیں پڑھا سکتے تھے۔ ریٹائر ہو جانے کے بعد آمدنی کا واحد سوتا خشک ہو چکا تھا۔ آخر انھوں نے کہہ دیا۔

"تو پھر نوکری ہی کر لو"

"کہاں نوکری کر لوں؟"

میری اس "کہاں" نے ایک لمحہ کے لیے پاپا میاں کو چونکا دیا۔ کم سے کم میرے لیے تو یہ سوال ایک نسل کا سوال تھا۔ اس سوال نے تو کتنی ہی بھری پڑی انجمنیں اجاڑ کر رکھ دی تھیں اس سوال نے مجھ سے میرے کتنے ہی بچپن کے ساتھی چھین لیے تھے۔ امیر کے سامنے بھی یہی سوال تھا۔ آخر کو باپ سے لڑ جھگڑ کر چلا گیا۔ کلیم ابتدائی اسکول کا پرانا ساتھی جاتے وقت جب پلیٹ فارم پر آخری بار مجھ سے گلے ملا تو کہہ اٹھا،

"احمد ایسا لگتا ہے۔ جیسے میں دیوالیہ ہو گیا ہوں۔ میرا سب کچھ نہیں رہا جا رہا ہے" میں نے جل کر کہا، "سب کہنے کی باتیں ہیں۔ وقت ایک مرہم بھی ہے"

"کیا کروں؟" اس نے جواب دیا تھا "یہاں رہ کر نہ اپنے کام آؤں گا اور نہ

دوسرے کے۔ قطرہ سمندر سے الگ ہو کر اگر دریا بن سکتا ہے تو اس کا سمندر سے الگ ہو جانا ہی اچھا ہے۔"

میرے چھوٹے سے ساگر کے کتنے ہی قطرے دریا بننے کے شوق میں ساگر سے بچھڑ چکے تھے اور وہ ساگر دیکھتے ہی دیکھتے ریگستان بنتا جا رہا تھا۔ لیکن میرے پاپا میاں جیسے بے خبر تھے۔ میں پاپا میاں سے کیسے کہتا کہ جس لنڈ منڈ درخت کے نیچے میں کھڑا ہوں اس میں خزاں کا ایک پتّہ بھی نہیں، سائے کا نام نہیں، چلچلاتی دھوپ ہے جو چنگاریوں کی پھوار کی طرح برس رہی ہے۔ قبل اس کے کہ میں کچھ کہتا پاپا میاں کی کانپتی ہوئی آواز آئی:

"احمد تمہارا یہ سوال میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"اور کیا۔" میں نے کہا "مجھے نوکری یہاں نہیں مل سکتی۔"

"کیوں؟" وہ حیرت سے بولے۔

"اس لیے کہ میں . . . ." میں کہتے کہتے رک گیا۔ اور بولا، "آپ خود ہی جانتے ہوں گے۔"

"کیا؟" پاپا میاں پھر اسی حیرت اور تعجّب کے ساتھ بولے۔

"یہی کہ میں مسلمان ہوں۔" میں نے یہ کہہ تو دیا مگر اب جو پاپا میاں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تو جیسے ان پر ایک سکتہ سا طاری تھا۔ وہ خالی خالی آنکھوں سے مجھے بہت دیر تک دیکھتے رہے۔ دن بھر انہوں نے مجھ سے کچھ نہ کہا۔ مگر شام کو اپنے پاس بلایا اور دھیرے سے بولے۔

"ایک بات کا جواب دو گے؟"

"کہیئے" میں گردن جھکائے بولا۔

"کیا ہندستان کے سارے ہندو روزگار سے لگے ہوئے ہیں؟" انہوں نے بڑے اطمینان کے ساتھ پوچھا، اور میں ان کے سوال پر سٹپٹا گیا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" میں نے پوچھا۔

"یہی" پاپا میاں بولے۔ "صرف مسلمان ہی نہیں، ہندو بھی تو بیکار ہیں — بے روزگاری تو ہر اس بڑے ملک کے حصے میں آتی ہے جو ترقی کی ابتدائی منزلوں میں ہو"

"بہرحال، میں اب بہت جلد چلا جاؤں گا"

"کہاں؟" پاپا میاں بولے۔

"پاکستان!" میں نے ان سے آنکھیں ملائے بغیر کہا۔

"پاکستان؟" پاپا میاں کی آواز گلے میں پھنس کر رہ گئی۔

"وہاں تمہارا کون ہے؟"

"وہاں میرا مستقبل ہے"

"میرا کیا ہوگا، تمہاری بیوہ بہن کا کیا ہوگا؟"

"جب کام مل جائے گا تو آپ سب کو لے جاؤں گا"

"اور میرے اس گھر کو، جسے میں نے اپنے خون سے سینچا ہے، اسے کس کے حوالے کر دگے؟"

"وہاں اور بن جائے گا۔ اسے بیچا جا سکتا ہے" میں نے جل کر کہہ دیا۔

"اور میرے عزیزوں کی قبریں، انھیں کون دیکھے گا؟"

"جی" میں نے ایک بار نظر اٹھا کر پاپا میاں کی طرف دیکھا اور پھر ایک سناٹا

تھا جو فضا میں تیر گیا اور اس بار پاپا میاں کی گردن جھک گئی۔ وہ آہستہ سے بڑے کرب کے ساتھ بولے۔

"کیا کیا لے کر جاؤ گے احمد یہاں سے؟" پھر وہ چپ ہو کر آسمان کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگے، اور پھر ان کی آواز نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔

"کیا پنشن کے ۷۰ روپے میری اکیلی جان کے لیے ناکافی ہیں؟ لیکن اپنی بیوہ بہن کو کہاں پھونک دوں، اس کے یتیم بچوں کو کس پر ڈال دوں؟ مرزا بھی نادار ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ساتھ عزت کے دال روٹی کھا لیتے ہیں۔" پھر پاپا میاں نے مجھے اپنے گلے سے لگا لیا اور بولے

میں جانتا ہوں بہت الجھتے ہو گے، لیکن ہمت سے کام لو۔ یہ زندگی کا ایک دور ہے، یہ ہر ایک پر آتا ہے۔ مجھ پر بھی آیا تھا۔ پاکستان اس کی دوا نہیں ہے۔ اس کی دوا محنت اور مستقل جد و جہد ہے۔ میری آنکھوں سے اوجھل ہو جاؤ گے تو میرے حوصلے پست ہو جائیں گے۔"

میں نے پاپا میاں کی طرف دیکھا۔ پاپا میاں کی شفقت سے بھری ہوئی آنکھیں مجھے ایک پُر درد حسرت سے تکے جا رہی تھیں۔ ان آنکھوں سے مجھے پاپا میاں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ جی میں آیا کہ ان کی گود سے لپٹ کر خوب روؤں اور کہوں مجھے بھی اپنے آغوش کے اس پُر بہار اور ٹھنڈے جزیرے میں چھپا لیجئے، میرا سارا جسم پھنکا جا رہا ہے۔

لیکن میرے جذبات میرے سینے میں گھٹ کر رہ گئے۔ سب کچھ خس و خاشاک کی طرح اُڑا جا رہا تھا۔ ہر وہ بات جس کے لیے پاپا میاں کبھی روادار نہ تھے، ہو رہی تھی۔ سُبحانی آیا تھا۔ تقریباً ۳۵ سیر دودھ کی رقم چڑھی ہوئی تھی۔ کوئی اور دودھ والا ہوتا تو

راستہ چلنا بند کر دیتا۔ مگر کب تک وہ بھی خاموش رہتا۔ ایک دن دروازے پر آکر کھڑا ہو گیا۔ پاپا میاں نے اسے کمرے میں بلایا تو بولا

"میاں، میری ایک بھینس مر گئی ہے۔ تین سو روپے ڈوب گئے، ورنہ کبھی نہ مانگتا۔" پاپا میاں پہلے تو خاموشی سے سنتے رہے پھر بولے

"کتنے روپے آتے ہیں حساب میں؟"

"بیس روپے دے دیجئے۔"

پاپا میاں نے روپے دے دیئے۔ یہ روپے کہاں سے دیئے گئے تھے۔ مہینہ کی آخری تاریخیں تھیں اور پنشن میں کیا بھلا کچھ بچ بھی جاتا تھا۔ سبحانی روپے لیکر چلا گیا تو پاپا میاں سوچ میں پڑ گئے۔ دھوبی کے حساب کی کاپی اٹھائی۔ کچھ دیر تک اس کے صفحے الٹتے رہے، پھر نعیمہ باجی کو بلا کر بولے،

"یہ لادی کے لادی کپڑے بھیجنا بند کر دو۔ چھوٹے کپڑے تو گھر میں بھی دھوئے جا سکتے ہیں۔"

دوسرے دن بہ جنّن دھوبی کو بھی ضرورت آن پڑی۔ چھ مہینہ کا حساب چڑھا ہوا تھا۔ پاپا میاں نے اسے بھی روپے دے دیئے۔ یہ حساب کیسے ادا ہو رہا ہے۔ اس کا حال شامی کو معلوم ہو گیا۔ پڑوس میں ایک نادن رہتی تھی۔ اسے اپنی لڑکی کی شادی کرنا تھی۔ اس لیے جو کچھ اِدھر اُدھر کے گھروں سے کما کر لاتی پاپا میاں کے پاس رکھ دیتی۔ اب شاید ڈیڑھ سو روپے کی رقم اس کے حساب میں پاپا میاں کے پاس جمع تھی۔ اس شام جیسے ہی اس نے انگنائی میں قدم رکھا، پاپا میاں کے پیروں کے نیچے سے جیسے زمین نکل گئی۔

ناؤن اٹھلا کر بولی۔

"میاں روپے دے دیجیے۔ گہنے وغیرہ دیکھ آئی ہوں۔"

"کتنے روپے؟" انھوں نے منھ پھیر کر سوال کیا۔

"سب۔"

"سب!" پاپا میاں اچھل پڑے۔ پھر یکبارگی سمجھ کر بولے۔

"بھئی تمہارے روپے تو میں نے بینک میں رکھ دیے ہیں۔ میں سمجھا کچھ روپوں کی ضرورت ہے تو میں اپنے پاس سے دے دوں گا۔ اب ان کے نکلنے میں دو روز سے کم کیا لگیں گے۔ پھر آکر لے جانا۔"

پاپا میاں نے غلط بات کہی تھی۔ ایک ناؤن سے جھوٹ بولا تھا، اس لیے کہ اس کی رقم میں چالیس پچاس روپے کم تھے اور جنھیں پاپا میاں نے قرض کی ادائیگی میں صرف کر دیا تھا۔

مجھے راتوں کو سونے میں جیسے کوئی جھنجھوڑ دیتا ہے۔ یہ اتنا بڑا گھر، یہ پوری عمارت، یہ کنبہ، سارا کا سارا ڈھانچہ ستر روپوں پر کھڑا ہے۔ میرے نتھنوں میں آگ لگی ہے۔ کھانا میرے آگے لگا دیا جاتا ہے تو کھا لیتا ہوں۔ کس منھ سے مانگوں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ جب گھر سے نکلتا ہوں تو نعیمہ باجی خدا حافظ کہتی ہیں، بچے دبی دبی مچھلی کہہ کر پکارتے ہیں۔ جب گھر میں گھستا ہوں تو گھر کے ہر کونے سے کچھ آنکھیں میرے اوپر گڑ جاتی ہیں۔ مجھ سے کچھ مانگتی ہیں، جیسے میں ان سب کا قرض دار ہوں اور پھر سب کو چپ لگ جاتی ہے۔ نعیمہ باجی کو اپنی آنکھوں پر اعتبار ہے، بیٹھ کر رو لیتی ہیں۔ یہ رونا دھونا یونہی لگا رہے گا۔ میرے سامنے پوری زندگی اپنا دامن پھیلائے کھڑی تھی ____

میرے پر پھڑپھڑا رہے تھے۔ میں پاپا میاں سے کہہ دوں گا کہ میں جا رہا ہوں۔ وہاں بڑے امکانات ہیں۔ میرے کئی دوستوں نے لکھا ہے کہ وہاں نوکری تین سو روپے سے کم کی نہیں ملے گی۔

جس دن میں پاسپورٹ بنوا کر گھر میں داخل ہوا تو گھر کا چولھا بند پڑا تھا۔ پاپا میاں اپنے کمرے میں خاموش بیٹھے تھے۔ میں چپکے سے ان کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں پسینہ پسینہ ہو رہا تھا جیسے کوئی بہت بڑے جرم کا ارتکاب کر کے آیا ہوں۔ میں نے بڑی مدھم آواز میں کہا۔

"پاپا میاں میرا پاسپورٹ تیار ہو چکا ہے۔ میں تین چار روز کے اندر چلا جاؤں گا"

تھوڑی دیر تک ایک گھمبیر سکوت طاری رہا۔ ایک دم گھٹا دینے والا سناٹا۔ پھر پاپا میاں کی مدھم سی آواز آئی،

"کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟"

"جی!" میں نے اپنی ساری قوت اس 'جی' کے ادا کرنے میں صرف کر دی۔ پاپا میاں کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا، اس پر کوئی بھی تاثر نہ تھا۔ اور وہ دو بڑی بڑی آنکھیں وہ آنکھیں اس وقت بھی ریگستان کی طرح تپ رہی تھیں۔

"یہ چھوٹا سا قافلہ" انھوں نے گردن جھکائے کہنا شروع کیا" اس کے میرِ کارواں اب تم ہی تھے۔ یہ قافلہ بغیر قافلہ سالار کے کیا اپنی منزل تک پہنچ سکے گا؟"

"اللہ آپ کے دم کو رکھے" میں نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"میں تو ایک اپاہج ہوں، اسلم" انھوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "میرے اونٹ کی مہار بھی تمہارے ہی ہاتھوں میں تھی"

"بہت مجبور ہو کر میں یہ سب کر رہا ہوں، پاپا میاں" میں قدرے روہانسا ہو کر بولا۔

"مجبوری کیا ہے؟" وہ تڑپ کر بولے، "تمھاری زبان میں فرار کو مجبوری کہتے ہیں۔ بہر حال خدا حافظ، جاؤ، میری دعائیں تمھارے ساتھ ہیں۔" اور پھر انھوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"سچ سچ بتاؤ احمد کیا اس ملک کے ہر مسلمان نوجوان کے مستقبل کا یہی ایک حل ہے؟"

میں نے گردن جھکا لی۔ میرے ہر طرف اندھیرا تھا، اور میری آنکھوں کے سامنے چنگاریاں سی چھوٹ رہی تھیں۔ اور پھر پاپا میاں کو ایک چپ سی لگ گئی۔ میں اپنے اس چھوٹے سے کنبے کو اس اندھیرے قبرستان میں چھوڑ کر اجنبی دیس کو سدھار گیا۔

کہانی ختم ہو گئی تھی۔ میں نے رسالہ بند کر دیا۔

یک بارگی سامنے کے بوسیدہ مکان سے ماتم کا تیز شور وغل برپا ہونے لگا۔

یہ مکان احمد کا مکان تھا۔

احمد کو اب پاکستان گئے دو سال ہو چکے ہیں۔

یک بارگی احمد کے مکان سے جنازہ باہر نکالا گیا۔ اس جنازے میں سب ہی لوگ تھے لیکن اس ہجوم میں میری آنکھیں احمد کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ احمد جو میرا بچپن کا دوست تھا۔ احمد جو اپنے پاپا میاں کے سینے پر ایک بڑا پتھر رکھ کر انھیں اکیلا چھوڑ گیا تھا اور جس کے پاپا میاں آج دودھ ایسا کفن پہنے چار آدمیوں کے سہارے دفنانے کے لئے گھر سے باہر نکالے جا رہے تھے۔ ابھی دو ماہ ہوئے احمد نے مجھے پاکستان سے لکھا تھا۔

"یہ جگہ سانپ کے منھ کی چھچھوندر ہو کر رہ گئی ہے۔ نہ اگلتے بنتا ہے نہ نگلتے۔ تم آتو رہے ہو، مگر یہاں بھی چین نہ ملا تو کہاں جاؤ گے؟"

جب جنازہ گلی سے باہر نکلا تو میں بھی اپنے گریبان کے بٹن لگاتا ہوا گھر سے باہر نکل آیا۔ اور جب ہجوم میرے پہلو سے گذرا تو میں تعظیماً اس طرح ساکت و جامد کھڑا رہا جیسے کسی عظیم سپہ سالار کی لاش جا رہی تھی جو میدانِ جنگ میں لڑتے لڑتے کام آ گیا ہو۔

■ ■

جھوٹے کونپلے

برابر والے کمرے میں صبح چار بجے سے روشنی ہو رہی تھی۔ کمرے میں لگے ہوئے نیلے نیلے شیشوں کے اس پار ساٹھ پاور کا بلب جل رہا تھا۔ سلطنت بی بی نے شیشوں کی طرف دیکھا، لمبی سی سانس لی اور آہستہ آہستہ کوئی دعا پڑھنے لگی، جب وہ جائے نماز سے اٹھی تو احمد علی نے ان سے فکر مند لہجے میں پوچھا۔

"سلیم میاں سے کیا کہا آپ نے؟"

"وہ دو ایک روز میں چلا جائے گا۔" سلطنت بی بی نے گردن جھکا کر کہا۔

احمد علی نے ایک لمبی سی سانس لی۔ بالکل اپنی بیوی کی طرح اور چپکے سے بولے، "اسکے علاوہ اور چارہ ہی نہیں۔ کل اگر کوئی اور بات نکل آئے تو کسے کسے جواب دینی پھرو گی۔"

پھر وہ کچھ سوچنے لگے اور فکر مند لہجے میں بولے "کیا کہہ رہا تھا؟"

"کچھ نہیں۔" سلطنت بی بی نے ویسے ہی گردن جھکائے جواب دیا۔ کہتا کیا؟ سُن کر چپ ہوگیا۔" اور پھر دونوں خاموش ہو گئے۔

آٹھ بجے کے قریب شہناز کا کمرہ کھُلا اور جب وہ کمرے سے باہر نکلی تو سلطنت بی بی نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اُلجھے اُلجھے سے بال، آنکھوں کے بھاری پپوٹے، آنکھوں کے ڈورے رات بھر تکئے میں منھ دے کر رونے سے سرخ ہو گئے تھے۔ ناک کی نوک پر ہلکی سی سرخی، چہرہ پژمردہ سا اس پر تھکن سی طاری تھی۔ وہ چپکے سے باورچی خانے میں گئی اور وہیں پائنچے سنبھال کر پیڑے پر بیٹھ گئی اور چائے پینے لگی۔

سلطنت بی بی تو کچھ دیر خاموش رہیں پھر بولیں "سلیم نے ابھی چائے نہیں پی ہے، ایک پیالی اس کو بھی بنا کر دے آؤ۔"

شہناز نے سُنا اور چپ چاپ گردن جھکائے چائے پیتی رہی، چائے ختم کر کے اس نے جلدی جلدی ایک پیالی میں چائے بنائی اور کوٹھے کے زینے پر چڑھنے لگی۔ زینہ چڑھ کر اس نے دیکھا کمرے کے دروازے کھلے تھے، وہ خاموشی کے ساتھ کمرے کے اندر چلی گئی۔ چائے میز پر رکھی اور ایک نظر پلنگ کی طرف ڈالی جہاں سلیم پڑا ہوا کسی کتاب کے صفحے الٹ رہا تھا۔

"چائے رکھی ہے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ یہ کہہ کر وہ واپس ہو رہی تھی کہ سلیم کی یہ آواز آئی۔

"سُنو۔"

وہ رک گئی۔ اس نے گھوم کر سلیم کی طرف دیکھا، ایسی نظروں سے، جیسے کہہ رہی ہو "کہو ——"

"میرے پاس آؤ" سلیم نے سر سے اشارہ کر کے کہا۔
شہناز اس کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ سلیم نے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا:
سوئی سوئی سی، تھکی تھکی سی آنکھیں۔ سلیم کچھ دیر اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا، پھر دھیمے
سے بولا: "جس زمانہ میں تمھیں ایک جھلک دیکھنے کو ترستا تھا اسے مدتیں گذر گئیں۔ وقت
نے بہت کچھ دیا اور بہت کچھ چھین لیا —— یہ زمانہ جب تم کو چھوڑ کر جا رہا ہوں، یہ زمانہ
بھی گذر ہی جائے گا" یہ کہ کر وہ اس کی طرف بڑھا اور قریب آ کر بولا۔
"سوچتا ہوں کل چلا جاؤں"
شہناز خاموش کھڑی رہی، نظریں نیچی کیے، کہ اتنے میں نیچے سے آواز آئی "شہناز۔!"
"جی" شہناز جیسے چونک پڑی۔
"ذرا یہاں تو آنا بیٹی!" سلطنت بی بی اسے پکار رہی تھیں۔ ادھر کچھ دنوں سے
وہ شہناز کو سلیم کے کمرے میں چند لمحوں سے زیادہ نہ رہنے دیتی تھیں۔ سلیم بھی یہ بات
جانتا تھا اور شہناز بھی۔
جب وہ جانے لگی تو سلیم کی آواز آئی "آج لائبریری میں ایک بجے ملنا"
شہناز چلی گئی۔
سلطنت بی بی کو تو بس ایک ہی فکر تھی، یہی کہ لڑکی کی عمر گذر رہی ہے آندھی طوفان
کی طرح۔ انھوں نے زندگی کی ساری متاع داؤں پر لگا کر شہناز کو تعلیم دلوائی تھی۔ یہ اس کا
ایم۔ اے کا آخری سال تھا۔ وہ یہی سوچتیں کہ لڑکی ہاتھ سے بے ہاتھ ہو گئی تو کیا ہوگا۔
انھوں نے ہمیشہ اسے مرغی کی طرح اپنے پروں میں چھپا کر رکھا تھا اور جب وہ جوان ہوئی
تو انھوں نے ایک ایک کر کے سارے رشتہ داروں کو آزما لیا۔ مگر جسے دیکھو اس کے دماغ

عرش معلّیٰ پر تھے۔ عزیز یہاں تھے اور لڑکے پاکستان میں کوئی چار سو کا نوکر تھا اور کوئی چھ سو کا۔ سلطنت بی بی کے پلّے کیا دھرا تھا۔ رہ گئے حشمت میاں وہی کبھی کبھی گھر کے چکر کاٹتے تھے۔ باہر آکر بیٹھک میں بیٹھتے۔ سلامت بی بی سے چکنی چپڑی باتیں کرتے۔ مغرب کے وقت برابر والی مسجد میں جاکر نماز پڑھتے اور پھر سلطنت بی بی کے پاس بس فی الحال یہی ایک آخری داؤں تھا۔

شام کو جب احمد علی منظر باغ سے واپس آئے تو قدرے بشاش تھے۔ سلطنت بی بی پنکھا لے کر ان کے پاس بیٹھ گئیں۔ وہ بے چین تھیں کہ احمد علی بغیر کسی تمہید کے بات چیت کا انجام بیان کر دیں۔

احمد علی سمجھ گئے۔ سانس بھر کر بولے "کل شام کو پانچ بجے شہناز کے ساتھ تمھیں بلایا تھا" پھر قدرے اعتماد کے ساتھ بولے "سلامت میاں کی اہلیہ کہہ رہی تھیں کہ رشتہ منظور ہی سمجھیے!"

سلطنت بی بی کا چہرہ یہ سُن کر جیسے بھڑک اٹھا۔ شدّت جذبات سے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انھوں نے شوہر کی طرف سے منھ پھیر لیا اور دوپٹّے کے پلّو سے آنسو پونچھنے لگیں۔ سلطنت بی بی جانتی تھیں کہ سلامت میاں کا بڑا سا کاروبار تھا، پیسے کی کمی نہیں تھی، حشمت ان کے بڑے لڑکے تھے۔ وکالت کی ڈگری تھی۔ گھرانا بھی اچھا تھا۔ کٹّر مذہبی ہونا کوئی بات نہیں تھی، سارا گھر روزے نماز کا پابند تھا۔ خود حشمت میاں کا بھی رجحان یہی تھا۔ لمبی سی داڑھی، شہناز سے پردہ کرائیں گے تو کرائیں۔ لڑکی سسرال جاکر اپنی من مانی کب کرتی ہے۔ شہناز وہی کرے گی جو اس کا شوہر چاہے گا۔ ایسے حالات میں اس سے اچھا لڑکا ملنا بھی تو ناممکن ہے۔

دوپہر کو حسب وعدہ وہ دونوں یونیورسٹی لائبریری میں ملے تھے اور پھر وہاں سے ٹہلتے ہوئے کیبن میں آکر بیٹھ گئے۔ وہ سناٹا جو ان کے درمیان پچھلے کئی دنوں سے قائم تھا، اسے بہرحال کسی نہ کسی وقت ٹوٹنا تھا۔ سلیم بہت نپے تلے لہجے میں اس طرح گویا ہوا۔

"تم نے اپنا فیصلہ بدلا یا نہیں؟"

"نہیں۔" وہ ماتھے پر بل ڈال کر بولی "صرف ایک شرط پر میں بغاوت کر سکتی ہوں۔"

"کون سی؟"

"کہ تم میرا ساتھ دو۔"

"تم جانتی ہو شہناز کہ..."

"کہ تم شادی شدہ ہو۔" شہناز نے اس سے بات چھین لی "اور تم اپنی بیوی کو نہیں چھوڑ سکتے۔ کیونکہ یہ ایک غیر اخلاقی اور انسانیت سوز عمل ہے، کیونکہ تم کو مجھ سے محبت ہے اور اس میں تمھاری بیوی کا کوئی قصور نہیں، البتہ اس قصور کی سزا اس کو نہیں تم کو بھگتنا چاہیئے۔"

"میں صرف اتنا جانتا ہوں شہناز کہ میں نے تم سے پیار کیا ہے۔ لیکن بازار کے شوکیسوں میں لگی ہوئی ہر چیز تو انسان نہیں خرید سکتا۔ وہ انھیں پسند کرتا ہے، اپنانا چاہتا ہے، اپنے گھر کی زینت بنانا چاہتا ہے، لیکن ایک دن کوئی گاہک آتا ہے اور انھیں شوکیس سے نکال کر لے جاتا ہے۔"

"لیکن عورت۔" وہ کچھ جھنجھلا کر بولی "کیا وہ بھی صرف شوکیس کی گڑیا ہے؟"

"ہر وہ چیز جو اپنی نہیں، شوکیس کی چیز ہے۔"

"اگر ایسا ہی تھا تو پھر..." وہ رکی، اس نے پلکیں جھپکائیں اور بولی "تو پھر تم میرے قریب کیوں آئے؟"

اس نے التجا بھری نگاہوں سے سلیم کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر گردن جھکا کر آہستہ آہستہ کہنے لگی۔

"تم نے میری کتابوں پر شعر لکھ کر مجھے پیغام دیئے۔ تم نے مجھے خط لکھے، مجھے اشاروں میں آواز دی، گڑیا اشاروں کی زبان نہیں جانتی۔"

"لیکن میں نے تم کو دھوکہ تو نہیں دیا۔ ——" سلیم سنجیدہ تھا۔ بھرّائی ہوئی آواز میں بولا "تم جانتی تھیں کہ میں ایک شادی شدہ مرد ہوں۔ ایک طالب علم، جو تمھارے گھر صرف سال بھر کا مہمان ہے، جو آج سے کئی سال پہلے تمھیں دیکھ کر پہلی بار محبّت میں گرفتار ہوا تھا، جو تم سے کبھی قرب حاصل نہ کر سکا اور وقت کے فاصلے نے جس کے دل سے اس محبّت کے ادھورے اور کم عمر جذبہ کے نقوش مٹا کر رکھ دیئے۔"

"لیکن یہ پورا ایک سال، میں اس سال کی بات کر رہی ہوں۔"

"اس سال جو کچھ ہوا، اس میں تم سے کچھ چھپا نہیں تھا۔ تم میرے قریب آئیں لیکن جانتی تھیں کہ میں تمھیں ایک دن چھوڑ کر چلا جاؤں گا اپنی بیوی کے پاس۔ لیکن پھر بھی تم نے میرے زانوؤں پر اپنا سر رکھا۔"

"شاید اس لئے کہ مجھے تمھارے جوان جسم سے ایک لذّت ملتی تھی۔" یہ کہہ کر شہناز نے منھ پھیر لیا اور چپکے سے بولی "ایک خام، ادھوری اور ناپختہ سی لذّت۔"

سلیم نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا، اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ آنکھیں اُداس اور بھیگی تھیں، ہونٹ خشک، جب سلیم کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تو آہستہ سے بولی۔

"بولو —— میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟"

لیکن سلیم خاموش رہا تو وہ کہتی رہی" تمھارا اخلاق کتنا عجیب ہے۔ تم شادی شدہ ہو اور اپنی بیوی کے وفادار بھی ہو، لیکن مجھ سے محبت بھی کرتے ہو۔ عجیب مضحکہ خیز محبّت، اندھیروں میں بوسے لینے والی، کیونکہ تم کو میرے ہونٹوں میں میکدے کی آگ نظر آتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کے لئے خاموش ہوگئی۔ اس کی سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ وہ پھر بول اٹھی "جس وقت تمھارے ہاتھ دور ہی دور سے میرا جسم ٹٹولتے ہیں اس وقت تم کو اپنی وفاداری یاد نہیں آتی۔ اگر کسی ایسی سچائی اور کسی ایسے کنوارپن کا تصوّر کیا جا سکتا ہے تو زندگی کے کتنے لمحے تم نے سچّے اور کنوارے گذارے ہیں، یہ تم نے کبھی نہیں سوچا۔"

یہ کہہ کر شہناز تیزی سے اٹھی اور کینٹین کے باہر چلی گئی۔

سلیم ایک لمحہ کے لئے کچھ نہ سمجھ سکا، وہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اسی شام سلیم نے خاموشی کے ساتھ جلیل منزل چھوڑ دی، اور ایک ہوٹل میں قیام کر لیا۔

سلطنت بی بی کو دکھ ضرور تھا۔ انھوں نے سلیم کو اوپری منزل کا کوٹھا اس لئے دیا تھا کہ ان کو اس سے بیس روپیہ کرایہ مل جاتا تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ گھر کے اندر کا کمرہ کسی اور مرد کے ہاتھوں اس طرح کرائے پر نہیں اٹھایا جا سکتا۔ سلیم کی ماں سلطنت بی بی کی بچپن کی دوست تھیں۔ سلیم نے ان کے سامنے پیروں پر چلنا سیکھا تھا اور اب جبکہ وہ اپنے گھر سے لکھنؤ صرف ایل، ایل، بی کرنے کی غرض سے آیا تھا اور ایک سال ہوٹل میں کاٹ چکا تھا تو سلطنت بی بی کو یہ خیال ہوا کہ کیوں نہ کمرہ سلیم کو کرائے پر دے کر بیس روپیہ ماہانہ آمدنی بڑھائی جائے کیونکہ یہ سلطنت بی بی کی جوڑ توڑ کا ہی اثر تھا جو اپنے شوہر کی قلیل آمدنی پر گھر کی آن بان برقرار تھی۔ سلیم انھیں تیس روپے کھانے کے بھی دیتا تھا اور اس طرح

پچاس روپے میں کم سے کم پچیس روپے سلطنت بی بی کے نکل آتے تھے۔

سلیم کے آنے کے بعد شہناز کو شدید احساس تھا کہ کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔ سلیم کی نگاہیں، مسکراہٹیں، فقرے، اشارے، جب اس نے آج سے چار سال پہلے شہناز کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا اور وہ اسے جھٹک کر آگے بڑھ گئی تھی۔ ساری باتوں کے پیچھے ایک خاص فضا تھی، مدھم مدھم رومانی سی، جس کے اندر وہ برابر کڑھ رہی تھی ــــ ساون کی وہ بھیگی بھیگی رات جب آسمان پر نشے میں ڈوبے ہوئے بادل لڑکھڑا رہے تھے۔ بوندوں کے ہار سائبان سے فرش تک سینکڑوں لڑیوں میں پروئے ہوئے تھے اور سلیم کے کمرے کی کھڑکیوں کے شیشوں پر پانی سسک سسک کر گر رہا تھا اور وہ اس کے کھانے کے کمرے میں کھانے کی سینی لے کر گئی تھی اور سلیم نے دھڑکتے ہوئے دل سے اس سے کہا تھا۔

"آپ کو قسم ہے، ان بھیگے ہوئے بالوں کو جو پیشانی پر جھول رہے ہیں، ایک لمحے کے لیے یوں ہی رہنے دیجئے۔"

"کیوں؟" شہناز نے مسکرا کر پوچھا تھا۔

"ان بادلوں سے ٹپکتی ہوئی بوندوں پر ہزار برساتیں قربان ہیں۔" سلیم نے بڑے والہانہ انداز میں کہا تھا اور پھر اس نے آگے بڑھ کر شہناز کی بھیگی ہوئی لٹوں کو چوم لیا تھا ــــ پہلی بار ــــ شہناز نے گردن جھکالی تھی، اس کا چہرہ سپاٹ تھا، جذبات سے عاری۔ اور جب وہ واپس ہونے لگی تو سلیم نے اُسے پھر آواز دی۔

"سنیئے۔"

وہ رک گئی تو وہ بولا۔

"آپ مجھ سے خفا تو نہیں ہیں؟"

"ہونہہ" وہ مسکرائی اور بولی "جذبات کو کپڑے کیوں پہناتے ہیں آپ؟"

اس کے بعد وہ یکبارگی پلٹ پڑی تھی اور سلیم کی آنکھوں میں غور سے دیکھتی ہوئی بولی تھی "جذبات صرف دو شکلوں میں حسین ہوتے ہیں۔ ایسے جذبات جو اپنی ابتدائی شکل میں ہوں، خام اور سیدھے سادے۔ یا وہ جنھیں فن کار نے تراش خراش کر اپنی معراج تک پہنچا دیا ہو، باقی ساری شکلیں چھوری اور سطحی ہیں۔" اور یہ کہہ کر سلیم کی طرف دیکھے بغیر کمرے سے چلی گئی تھی۔

سلیم اس کے ان جملوں کا مقصد بھی نہیں سمجھ پایا تھا۔

اور اس طرح کتنی ہی راتیں گذر گئیں۔ وہ شہناز کی زلفوں، رخساروں اور ہونٹوں سے کھیلا۔ اس نے کتنی ہی بار کانپتی ہوئی آواز میں کہا تھا۔

"شہناز!"

"ہوں" وہ ہمیشہ انتہائی ٹھہری ہوئی آواز میں جواب دیتی۔

"تم کس قدر حسین ہو"

"سچ؟" وہ کچھ عجیب انداز سے پوچھتی۔

"آئینہ دیکھو شہناز تو تمھیں معلوم ہو کہ حسن کس طرح نکھرتا ہے"

"تم نے ابھی حسن کو نکھرتے نہیں دیکھا"

"کیا مطلب؟" وہ حیرت سے پوچھتا۔

اور شہناز خاموشی کے ساتھ اسے ایسی نگاہوں سے دیکھتی جیسے وہ دنیا کی کوئی حقیر ترین شے ہو۔ انتہائی ذلیل اور کمتر۔ ان سرد اور دل تک اتر جانے والی نفرت بھری نظروں کا مقصد سلیم کی سمجھ میں کبھی نہ آیا تھا۔ وہ ان نگاہوں کی تاب نہ لا پاتا تھا۔ وہ ہمیشہ ان

نگاہوں سے خائف رہنا۔ اسے ایسا لگتا جیسے وہ نگاہیں اسے کسی جرم کا مرتکب اور گناہگار ٹھہرا رہی ہوں۔ اور شہناز سے پوچھا تھا۔

ایک دن اس نے ڈرتے ڈرتے شہناز سے پوچھا تھا۔

"تم مجھے ایسی نگاہوں سے کیوں دیکھتی ہو شہناز؟"

"کیسی نگاہوں سے؟" وہ مسکرا کر بولی تھی۔

"میں انھیں بیان نہیں کر پاؤں گا۔ لیکن محسوس ضرور کرتا ہوں۔"

سلیم نے کہا۔

"ان نگاہوں کے پیچھے تم کو کیا نظر آتا ہے؟"

"نفرت!" سلیم آہستہ سے بولا۔

"الفاظ اتنی فیاضی سے استعمال نہ کیا کرو۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"جو کچھ بھی ہو، ان میں محبت نہیں ہوتی۔"

"دیکھو۔" وہ پھر سنجیدہ ہو گئی۔ "میرے عزیزوں کے جن جوان لڑکوں نے مجھے فلرٹ کیا تھا ان کو میں نے ایسی نگاہوں سے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کے لیے میری نگاہوں میں جذبات کی گرم اور پرجوش چنگاریاں ہمیشہ مچلا کرتی تھیں۔ وہ مجھے چھوتے تھے اور میں پگھل کر ان کی آغوش میں پھیل جاتی تھی۔" پھر وہ گردن جھکا کر کچھ سوچنے لگی اور پھر ایک تلخ مسکراہٹ مسکرا کر بولی "زاہد بھائی جو مجھ سے شادی کا وعدہ کرکے پاکستان چلے گئے تم نہیں جانتے انھوں نے پہلی بار میرے ہونٹوں کو چوما تھا۔ پہلی بار دو اجنبی ہونٹوں نے مجھے زندگی کی ایک کیف پرور اور پراسرار لذت سے آگاہ کیا تھا۔ میری آنکھوں میں تمھیں نفرت نہیں اکتاہٹ ملے گی۔" یہ کہہ کر اس نے سلیم کی آنکھوں میں غور سے دیکھا اور بولی۔

"تم اسی جلوے کی نقاب کشائی کرتے ہو جسے میں بار بار دیکھ چکی ہوں۔ ایک ہی کھیل کو بار بار کھیلنے سے کون نہیں اکتا جاتا"۔

اور سلیم شہناز کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا ہی رہ گیا۔

جس شام سلیم نے جلیل منزل چھوڑی اسی شام سلطنت بی بی کا منظر باغ میں بلاوا تھا۔ سلطنت بی بی نے اپنی بیٹی سے بھاری جوڑا نکال کر پہنا اور خوب سج بن کر تیار ہو گئیں۔ جب وہ شہناز کے کمرے میں داخل ہوئیں تو شہناز پلنگ پر پیٹ کے بل لیٹی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ سلطنت بی بی نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اور بولیں۔

"ابھی تک تیار نہیں ہوئیں؟"

"تیار کیا ہونا ہے"۔ شہناز نے ماں کی طرف دیکھے بغیر کتاب پر نظریں جمائے جواب دیا.....

"غرارہ اور جمپر نکال کر پہن لو"۔

"اچھا"۔ وہ بولی۔

اور سلطنت بی بی کی نگاہیں شہناز کی لمبی لمبی انگلیوں پر جم گئیں۔ گوری گوری انگلیوں کے نازک نازک ناخنوں پر کیوٹکس کی سرخ پالش لگی ہوئی تھی۔ سلطنت بی بی پہلے تو کچھ دیر سر جھکائے سوچتی رہیں پھر بولیں۔

"ناخنوں کی یہ پالش آج چھڑا دو۔ کل دل لگا لینا"۔

شہناز نے اس بار بھی کتاب پر سے نظریں نہیں ہٹائیں، مگر یہ جملہ سن کر اس کے چہرے پر ایک لمحہ کے لئے اندرونی جذبات کی پرچھائیاں جس طرح دوڑ گئیں انھیں سلطنت بی بی نے بخوبی بھانپ لیا۔ انھوں نے زیادہ ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا۔

"جلدی کرو، ساڑھے چار بجے ہمیں پہنچ جانا ہے۔" اتنا کہہ کر سلطنت بی بی کمرے کے باہر چلی گئیں۔ لیکن انھیں کمرے کے باہر نکل کر پھر کچھ یاد آ گیا۔ وہ دروازے تک آئیں اور لہجے میں قدرے نرمی لا کر بولیں۔

"کنگھی سیدھی سیدھی کرنا، اور آج ڈھائی گز والا دوپٹہ نکال کر سر اوڑھنا ہوگا۔"

سلطنت بی بی چلی گئیں تو شہناز نے کتاب کو ایک کونے میں پھینک کر تکیہ میں اپنا منھ چھپا لیا۔ اس کے بدن کا خون بڑی تیزی سے حرکت کر رہا تھا اور وہ اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"یہ سب جھوٹ ہے، ہم سب جھوٹے جذبات اور دوغلے کردار کے مالک ہیں۔"

پھر وہ یکبارگی اٹھی اور تیزی سے اپنے آپ کو پنکھے کی ہوا دینے لگی، جیسے اسے بہت گرمی لگ رہی ہو۔ چاروں طرف فضا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ یہ پنکھے کا موسم قطعی نہیں تھا۔

شام کے ٹھیک ساڑھے چار بجے سلطنت بی بی شہناز کو لے کر سلامت میاں کے گھر پہنچ گئیں۔ سلامت میاں کی بیوی، لڑکیوں اور بچوں نے اپنے نئے مہمان کو گھیر لیا۔ سلطنت بی بی کی جیسے باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ سلامت میاں کی بیوی شہناز کو ایک ایک پور کو اپنی یادداشت میں چھپا کر رکھ لینا چاہتی تھیں۔

سلطنت بی بی موقع کی گھات میں تھیں۔ چائے پر ادھر ادھر کی باتیں شروع ہو گئیں "بہن اللہ اگر صورت شکل دے تو پھر سیرت بھی دے۔" اور پھر انھوں نے نمک مرچ لگایا "بہن، میری لڑکی عام گھرانوں کی لڑکیوں میں سے نہیں ہے۔ جہاں انگریزی کے دو چار درجے پاس کیے کہ زمین پر پیر رکھنا ہی چھوڑ دیئے۔ خدا اور رسول کو بھول گئیں اور بے حیائی لاد لی۔"

سلطنت بی بی جتنی دیر وہاں رہیں شہناز پر انھوں نے کڑی نظر رکھی۔ جب کبھی اس کے سر سے دوپٹے کا پلّو گرتا وہ کہنی مار کر اسے پلّو ٹھیک کرنے کا اشارہ کرتیں۔"

عصر کے وقت جب سلامت صاحب کی بیوی اور لڑکیوں نے نماز کے لئے مصلّے بچھائے تو سلطنت بی بی نے شہناز سے بھی وضو کرایا اور نماز پڑھنے لگیں۔ چائے کے بعد لڑکیوں نے شہناز سے کہا۔

"آئیے، آپ کو اپنا گھر دکھا دیں۔"

شہناز ان کے ساتھ ہولی۔

وہ اسے ایک ایک کر کے کمرہ دکھاتی رہیں۔ ایک کمرے میں جا کر وہ بولیں "حشمت بھائی کا کمرہ ہے۔" شہناز نے دیکھا کمرے کو خاص طور پر سجایا گیا تھا۔ وہ ہر ایک چیز غور سے دیکھنے لگی۔ دیواروں پر ٹنگے ہوئے نیم برہنہ عورتوں کے بڑے بڑے کیلنڈر، میز پر رکھا ہوا چھوٹا سا ریڈیو۔ صوفے والی میز پر اس نے دیکھا کچھ کتابیں بڑے سلیقہ سے رکھی ہوئی تھیں۔ وہ کتابوں کے نام غور سے پڑھنے لگی۔ ایک کتاب کا نام تھا "سائیکالوجی آف سکس"۔

سلامت صاحب کی ایک سہیلی جو اس جھنڈ میں ساتھ تھی بول اٹھی۔

"معلوم ہوتا ہے یہ کمرہ حشمت بھائی نے پھر سے سجایا ہے۔"

"چل ہٹ۔" حشمت کی بہن تیزی سے بولی۔

مگر سہیلی خاموش نہ رہی، جھٹ سے بول اٹھی "چل ہٹ کیا، سارا نقشہ ہی بدلا ہوا ہے۔ یہاں دیوار پر مدینہ منوّرہ کی تصویر تھی۔ یہاں پر صوفہ نہیں، تخت بچھا ہوا تھا' ایک جانماز رکھی رہتی تھی اور اس میز پر جہاں یہ انگریزی کی کتابیں رکھی ہیں ایک خوبصورت

رحل میں قرآن شریف رکھا ہوا تھا۔"

بات کچھ اور بڑھتی کہ دوسرے کمرے سے لڑکیوں کی پکار ہوئی۔ اور انھیں کمرہ چھوڑ کر چلنا پڑا۔ شہناز کی آنکھوں میں کچھ دیر کے لیے ایک چمک پیدا ہو کر ڈوب گئی۔

سلامت صاحب کے یہاں سے واپسی پر سلطنت بی بی بہت خوش تھیں لیکن جب شہناز کے کمرے میں گئیں اور اسے مسہری پر پژمردہ سا پڑا دیکھا تو اس کے سرہانے بیٹھ کر بالوں سے کھیلنے لگیں اور نہ معلوم کیوں ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔۔۔۔ اور پھر وقت تھکے تھکے قدموں سے گزرنے لگا۔

ایک دن شام کے ساڑھے چھ بجے تھے جب ہوٹل کے کمرے پر شہناز نے آہستہ سے دستک دی۔

"کون ہے؟ اندر آجایئے۔" کمرے کے اندر سے آواز آئی۔

شہناز کمرے کے دروازے پر پڑے ہوئے پردے کو ہٹا کر اندر داخل ہو گئی۔

"اوہ، تم ....." سلیم شہناز کو دیکھ کر پلنگ سے اچھل پڑا۔ شہناز اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اور پھر اس نے دروازے کے دونوں پٹ بند کر کے اندر کی چٹخنی چڑھا دی۔ سلیم قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چٹخنی لگا کر وہ اس کی طرف مڑی۔

"آؤ، خیریت تو ہے۔" وہ پلنگ پر سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"کیا کر رہے تھے؟"

"کچھ نہیں وہ جلدی سے بولا۔ "بیٹھو۔" اس نے پلنگ کے برابر ہی پڑی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"میں پلنگ پر بیٹھوں گی۔" شہناز بولی اور اسکے قریب پلنگ پر بیٹھ گئی۔ سلیم نے ٹکٹ

بار اس کی طرف دیکھا اور پھر اس دروازے کی طرف جسے شہناز بند کر کے آئی تھی۔ سلیم کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ شاید شہناز بھی ذہنی طور پر موجودہ صورت حالی کو برتنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ جو کچھ کر رہی تھی اس میں اس کا کوئی سمجھا بوجھا ارادہ شامل نہیں تھا۔ اس نے رات صرف اتنا سوچا تھا کہ وہ دوسرے دن سلیم سے ملے گی۔ اس کے ہوٹل کے کمرے میں، اس لیے وہ بھی اس کے پلنگ پر اپنے آئندہ ردعمل کے لیے اپنے ذہن کو کرید رہی تھی۔ اور اس طرح کمرے میں کچھ دیر کے لیے خاموشی طاری ہو گئی تھی آخر کار سلیم بولا۔

"پیر اٹھا کر آرام سے بیٹھو۔"

"ہوں" وہ بولی اور پھر یکبارگی اس نے پیر اٹھا کر اور سرہانے کی طرف کھسک کر تکیہ کو ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔

"میں لیٹ جاؤں نا؟"

"ضرور ضرور" سلیم جلدی سے بولا اور قبل اسکے کہ اس کا جملہ پورا ہوتا، شہناز تکیہ پر سر رکھے لیٹ چکی تھی۔ وہ بڑی بے نیازی سے پورے پلنگ پر پیر پھیلائے، لیٹی چھت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے بلاؤز اور ساڑھی کے گھیرے کے درمیان اس کا گورا گورا پیٹ نیچے کی آخری پسلی تک دکھائی دے رہا تھا جس پر باریک باریک سنہرے روئیں تھے۔ سلیم کو ایسا لگا جیسے اس کے ہونٹ خشک ہو رہے ہوں۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں بار بار پھیل جاتی تھیں کہ یکبارگی شہناز بولی۔

"اپنے پیر نیچے گرا دو۔"

سلیم نے خاموشی سے پیر گرا دیئے۔ شہناز نے تکیے پر سے سر ہٹا کر اس کی رانوں کے بیچ میں رکھ دیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرانے لگی۔ سلیم نے دھیرے دھیرے اپنا ہاتھ

اس کی آنکھوں پر رکھ دیا اور بولا۔

"کیا بات ہے، کچھ مجھے بھی بتاؤ" شہناز نے اس کا ہاتھ اپنی آنکھوں پر سے نہیں ہٹایا اور بولی۔

"آج میرا فیصلہ ہو گیا"

"ہوں" سلیم مسکرایا اور آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولا "حشمت میاں سے؟"

"ہوں" وہ اٹھلا کر بولی۔

"یہی خبر دینے آئی تھیں؟"

"ہاں" شہناز نے سلیم کی قمیص کے بٹن کھولتے ہوئے بولی۔ سلیم چپ چاپ اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور شہناز اس کے گریبان کے اندر ہاتھ ڈال کر اس کے سینہ کے بالوں پر اپنی انگلیاں پھیر رہی تھی کہ وہ پھر بول اٹھا۔

"کوئی تاریخ بھی مقرر ہوئی؟"

"صرف ایک ہفتہ بعد"

"اچھا" وہ حیرت سے بولا "اتنی جلدی"

"لیکن میں سوچ رہی تھی" شہناز مسکرائی "کہ جب وہ مجھے طلاق دے گا تو میں کتنے بچوں کی ماں ہوں گی"

سلیم کی آنکھیں یکبارگی جگمگا اٹھیں لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"میں ایک بات جانتی ہوں" وہ قدرے سنجیدہ ہو گئی "ہم سب دو دنیاؤں میں رہتے ہیں"

"کون سی دو دنیائیں؟"

ایک وہ جس میں ہم رہتے ہیں لیکن ہمیں جو ناپسند ہے۔ دوسری وہ جو ہمیں پسند ہے لیکن رہنے کو نہیں ملتی۔" یہ کہہ کر اس نے سلیم کی آنکھوں میں دیکھا، پھر بغیر رکے کہنے لگی۔" اگر ہم صرف اس دنیا میں رہیں جو ہمیں ناپسند ہے تب بھی کوئی بُرا نہیں لیکن جب ہم اس دنیا میں رہنے لگیں جس کا سرے سے کوئی وجود نہ ہو، اس جگہ پر پیر رکھنے لگیں جہاں زمین ہی نہ ہو تو سوچو کیسے کام چلے گا۔" یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔

سلیم دھیرے سے بولا۔" کیا میں کچھ کہہ سکتا ہوں؟"

" ابھی نہیں۔" وہ جلدی سے بولی اور پھر اس کی گود میں جیسے تڑپ اٹھی۔ اس کے چہرے پر شدّتِ جذبات سے خون سا چھلک آیا تھا اور وہ ماتھے پر بل ڈال کر بولی" حشمت کی طرح ہم سب ہی دو دنیاؤں میں رہتے ہیں۔"

" کیوں، اس نے کیا قصور کیا ہے؟" سلیم بولا۔

" وہی پرانا قصور۔" یہ کہہ کر اس نے تیوریاں بدلیں اور مسکرائی" کمرے کی دیواروں پر سے مقدّس مقامات کے کیلنڈر اتار کر ان کی جگہ ننگی تصویریں لگانا، قرآن شریف کی جگہ سائیکالوجی آف سکس کی کتاب رکھنا اگر ایک ذہنی تبدیلی اور انقلاب کا نام ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں، ناخنوں کی پالش اتار دینا، سر پر دوپٹہ اوڑھنا اور پانچوں وقت کی عبادت کرنا اگر کسی کے کردار کا جز ہو تو بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن یہ ساری باتیں اگر بہروپیوں سے کرائے پر لیے ہوئے کاسٹیوم کے سوا کچھ نہیں، تو میں یہ ضرور پوچھ سکتی ہوں کہ طلاق ملتے وقت میں کتنے بچوں کی ماں ہوں گی۔"

حشمت کا اس میں کیا قصور ہے۔" سلیم بہت گمبھیر لہجے میں بولا۔" تمھاری ماں نے دنیا دیکھی ہے، کیا وہ یہ نہیں جانتیں کہ حشمت تمھارے لائق نہیں۔"

شہناز خاموش رہی تو وہ بولا۔

"یہ تمھاری ماں کا سراسر ظلم ہے۔"

"ظلم اور بیوقوفی میں فرق ہے۔" انتہائی تلخ مسکراہٹ کے ساتھ شہناز نے جواب دیا۔ "میری ماں وہی کر سکتی ہے جو وہ جانتی ہے۔ یہ بیوقوفی جو وہ میرے ساتھ کر رہی ہے اس کو ورثے میں ملی ہے، یہ اس کے لیے عین راحت ہے۔" پھر وہ بہت ہی دھیمے دھیمے کہنے لگی۔ "میری ماں یہی چاہتی ہے کہ کسی شریف خاندان میں میری شادی ہو جائے۔ وہ کہتی ہے میری لڑکی اٹھائیس سال کی ہو چکی ہے کب تک گھر پر بیٹھی رہے گی۔ وہ کس قدر خوش ہے۔"

"تم نے یہ سوال اپنی ماں سے کیوں نہیں کیا کہ طلاق کے وقت تم کتنے بچوں کی ماں ہوگی۔" سلیم سنجیدگی سے بولا۔

"یہ سوال میں اپنی ماں سے نہیں کر سکتی۔"

"کیوں؟"

"کیوں کہ میں... میں..." یہ کہہ کر کچھ اس طرح بے چین ہو گئی، جیسے اپنے ذہن میں کچھ تلاش کر رہی ہو۔ کہ یکبارگی وہ تڑپ کر بولی۔ "کیونکہ میں اپنی ماں کو یہ نہیں سمجھا سکتی کہ حشمت سے مجھ کو جو بچے ملیں گے وہ ناجائز ہوں گے اور یہ بات میں تمھیں آسانی سے سمجھا سکتی ہوں۔" اور پھر یہ کہہ کر شہناز نے کروٹ لی اور اپنی دونوں باہیں سلیم کی گردن میں ڈال دیں، پھر مسکرا کر بولی۔

"باہر شام ڈھل رہی ہے۔ اس وقت میں گھر پر تمھارے لیے چائے لے کر آیا کرتی تھی اور تم مجھے چوم لیا کرتے تھے۔"

"ہوں" سلیم آہستہ سے بولا۔

"تو پھر" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولی۔

سلیم اس کی طرف جھکا۔

"یوں نہیں یوں!" اس کے لب تھرتھرائے اور پھر اس نے اپنی پوری طاقت سے سلیم کو گرفت میں لے لیا۔

وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا "شہناز! یہ سب کیا ہے؟"

وہ جواب میں جذبات کی شدت سے مغلوب ہو کر اس کے کانوں میں سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔

"ایک ایک پل بیتا جا رہا ہے سلیم۔ ہر وہ پل جو گذر رہا ہے، مجھے کنگال کیے دے رہا ہے۔ میری جوانی کے جھوٹے سال جھوٹے ولاسوں میں گذر رہے ہیں، زندگی کے جھوٹے ناٹکوں میں میری حیثیت جھوٹے اداکاروں کی سی ہے۔" یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئی۔ یہ خاموشی بڑی جان لیوا تھی۔ سلیم کی سانسیں پھول رہی تھیں کہ وہ بڑی مشکلوں سے اپنے پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"یہ سب کیسے ہو سکتا ہے؟"

"جیسے ہو رہا ہے" شہناز نے سرگوشی کی "مجھے زندگی کا وہ لمحہ دے دو جو مجھے آج تک نہیں ملا۔ جو مجھے حشمت کے حجلۂ عروسی میں کبھی نہیں مل سکتا۔"

"لیکن میں تمھاری پاکیزگی سے نہیں کھیل سکتا۔"

"کاہے کی پاکیزگی؟" شہناز نے تڑپ کر سوال کیا۔

"تمھارے جسم کی پاکیزگی، تمھاری روح کی..."

"پاکیزگی نام ہے مادہ کی تنظیم کا، اور یہ تنظیم ہمیشہ اپنے دور کے معاشرے کی پابند رہی ہے، اور جب معاشرہ ہی گندہ ہو تو جسم پاکیزہ نہیں رہ سکتا، کیونکہ مادہ کی تنظیم کا ایک نام جسم بھی ہے۔"

"تو تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

"اس ناجائز معاشرہ کا ایک تحفہ، ایک پھول سا ناجائز جسم۔"

"مگر مجھ سے یہ نہ ہوگا۔"

"ہوگا۔" وہ تڑپ کر بولی "یہ جذبات کی خوبصورت ترین شکل ہے۔ یہ وہ دھارا ہے جس پر ہم میں سے کوئی بھی ابھی تک کامیاب باندھ نہیں باندھ سکا ہے یہ تم نہیں کرو گے تو حشمت کرے گا۔ ایک دوسرا نام دے کر، ایک دوسری شکل میں، جو اس سے زیادہ اذیت ناک ہے۔"

"مگر یہ حیوانیت ہے۔"

"اور تم نے جو کچھ سیکھا ہے وہ غیر فطری ہے، PERVERSION ہے، کیونکہ تمہاری قدروں نے تمہیں ڈرپوک بنا دیا ہے، اس نے تمہیں جھوٹے کوئلے جلانا سکھایا ہے جنہیں بار بار کریدنا پڑتا ہے۔" پھر شہناز نے اپنی باہوں کی گرفت کو اور مضبوط کر لیا اور اس کی آنکھوں کی تہوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "سچے کوئلے جلاؤ، پھر دیکھو آنچ کس قدر تیز اور کتنی دیر تک رہتی ہے۔"

اخلاق کے بوسیدہ لبادے اوڑھے ہوئے جسموں کے جادو کنمنائے، تو شہناز سلیم کے کانوں کے قریب اپنے ہونٹ لے جا کر بڑی ہی جذباتی انداز میں سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔

"یہ شام ایک نعمت ہے سلیم، یہ شام ہم دونوں کے کپکپاتے اور لرزتے ہوئے جذبات

کی آخری شام ہے، قبل اس کے کہ پنکھڑیاں بکھر جائیں اُنھیں شبنم سے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر لینے دو، آندھیاں بہت چل چکی ہیں، گرد کے بگولے بہت اٹھ چکے ہیں۔ آج کی شام مدھم مدھم ہوائیں چلاؤ، خواب آور، مہکتی ہوئی اور لوریاں گنگناتی ہوئی، آؤ کہ یہ پل بھی بیت جائے گا۔"

اور پھر شہناز نے جسم جسم کی پیاس کو سمندر کی آخری گہرائیوں میں اتار کر رکھ دیا۔

مدھم مدھم ہوائیں چلنے لگیں، مہکتی ہوئی، لوریاں گنگناتی ہوئی ——— !

■ ■

بڑا بابو

پانچ بجے اسٹابلشمنٹ سیکشن کے بڑے سے ہال میں فائلیں پھٹا پھٹ بند ہونا شروع ہو جاتیں۔ کرسیاں پیچھے کھسکائی جاتیں، اور دن بھر کے تھکے ہارے کلرک ہڑبڑا کر اس بڑے سے کمرے کے باہر نکل پڑتے، اور پھر ان کا قافلہ دفتر کی سائیکل اسٹینڈ کی طرف رینگنا شروع کر دیتا۔ اس وقت اس وسیع کمرے میں خالی خالی میزوں اور کرسیوں کے بیچ بھن بھن کرتے ہوئے بجلی کے پنکھوں کی اکیلی اور مسلسل آوازوں کے درمیان پیپر ویٹس کے نیچے دبے ہوئے کاغذوں کی پھڑپھڑاہٹ کے پس منظر میں وہ کیکڑے کی طرح اپنے سوکھے سوکھے ہاتھ پیروں کو سکوڑے اپنی کرسی پر دونوں پیر رکھ کر بڑے انہماک سے فائل پر کچھ لکھنے میں مصروف رہتا۔

دن کے شروع حصے میں وہ اپنی کرسی پر بہت کم بیٹھتا، دفتر ہمیشہ گھبرایا گھبرایا سا پہنچتا اور پھر کھڑے ہی کھڑے فائلوں کے فیتے کھولتا، کاغذات کو الٹا سیدھا پڑھتا، بڑبڑاتا، کڑھتا، چپراسیوں کی حرام خوریوں پر جھنجھلاتا اور یہ کیفیت تقریباً لنچ ٹائم تک اس

پر طاری رہتی۔ وہ اتنی تیزی سے اس درمیان کام کرتا کہ آدھی سے زیادہ میز بالکل صاف ہو جاتی اور اس کے بعد جب وہ ذرا آرام سے کرسی پر بیٹھ کر پیٹھ لگاتا تو اس وقت اُسے یہ احساس ہوتا کہ وہ اپنے سکیشن کا بڑا بابو ہے اور ہال میں بیٹھنے والے گیارہ کلرکوں کا ہیڈ۔ وہ بادشاہوں کی متانت کے ساتھ چاروں طرف نظریں دوڑاتا اور سامنے کھڑے ہوئے چپراسی کو آواز دیتا۔

"شہزادے!"

"جی بڑے بابو!"

"دیکھو، ان لوگوں کو باہر نکالو۔ اگر کل سے یہاں بھیڑ لگی ہوئی دیکھی تو تمہاری گردن ناپوں گا۔ یہ اسٹیبلشمنٹ سکیشن ہے کہ چوراہا۔ سب یہیں مٹر گشتی کرتے ہیں۔" یہ بات وہ چپراسی سے پچاسوں بار کہہ چکا تھا۔ چپراسی بھی پچاسوں بار لوگوں کو منع کر چکا تھا... لیکن ایک دو روز امن رہتا، اور پھر وہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔

پچھلے بارہ سال سے وہ اس کمرے کی دیواروں پر طرح طرح کی کمپنیوں کے کیلنڈروں کو لٹکتے، بچھتے اور اترتے دیکھ چکا تھا۔ ایک بار لنچ کے وقت چائے کے دوران ایک کلرک نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ ملازمت کے کتنے سال گذار چکا ہے تو وہ اپنی گنجی چاند کھجاتے ہوئے مسکرایا تھا اور بولا تھا۔

"شہزادے! سال وال جان کر کیا کرو گے۔ بس یہ سمجھ لو کہ اب تک دفتر کے صرف اسی سکیشن کے کاغذوں پر آٹھ دس گیلن روشنائی اپنے قلم کی نب سے بہا چکا ہوں۔"

کلرک یہ سن کر اچھل پڑا، جس پر اسے غصہ آگیا اور وہ تیوری چڑھا کر بولا۔

"اس میں حیرت کی کون سی بات ہے۔ بھیّا دس سال اور ایک مہینہ تو ہیڈ کلرکی

کرتے ہوئے ہوگیا۔ ریکارڈ روم کے کاغذوں کی کم سے کم چالیس من ردّی میں شاید ہی کوئی ایسا کاغذ نکلے جس پر میں نے نوٹنگ نہ کی ہو۔"

"ارے واہ دادا،" کلرک رعب میں آکر بولا۔ "تب ہی تو سارا دفتر تمھیں دادا کہہ کر پکارتا ہے۔"

"ہا، سب میرے ہاتھ کے سکھائے ہوئے لونڈے ہیں۔" یکبارگی اُسے جوش آگیا میں کہتا ہوں انھوں نے سر دس بھر میں جتنے الفاظ لکھے ہوں گے اس سے زیادہ تو قلم کی بنیں گھس کر پھینک چکا ہوں۔ ایک دو نہیں، پچیس سال سے یہی چکر چل رہا ہے۔ شہزادے"

کلرک کا نام شہزادے نہیں تھا۔ دفتر میں کسی کا نام شہزادے نہیں تھا، لیکن بڑا بابو ہر ایک چپراسی اور ہر ایک کلرک کو شہزادے کہہ کر پکارتا تھا۔ جو اس کے سامنے پڑ جاتا وہ اس کو شہزادے کہہ کر پکارتا۔ اکثر اس کے اس تخاطب پر ایک وقت میں دو آدمی اس کی طرف متوجہ ہو جاتے، تو پھر وہ ان کے کپڑوں سے تفریق کرتا۔ "تمھیں نہیں، نیلی قمیض والے شہزادے کو پکار رہا ہوں۔" خدا جانے یہ لفظ شہزادہ اس کے دماغ میں کیوں گھس گیا تھا۔

لیکن جب سے نیا صاحب آیا تھا اور بڑے بابو کے ساتھ تابڑ توڑ دفتر میں افسر کی ناراضگی کے کئی واقعات ہو چکے تھے۔ تب سے وہ خاموش اور فکرمند رہنے لگا تھا۔ کئی بار اس نے لوگوں سے کہا کہ وہ اب طویل رخصت لے کر گھر پر آرام کرنا چاہتا ہے۔ ایک روز وہ صرف پانچ منٹ دیر سے پہنچا تو اس کے نام کے سامنے رجسٹر پر سرخ نشان بنا دیا گیا تھا۔ وہ اُسے دیکھ کر آگ بگولہ ہوگیا۔ نوکری میں پہلی بار اس کے نام کے سامنے یہ نشان بنا تھا۔ اس نے مارے غصّے کے اس روز کام نہیں کیا، دو مہینے کی چھٹی کی درخواست لکھی اور صاحب

کی میز پر رکھ دیا۔ پھر یہ ہوا، کہ ایک ٹائپ کیا ہوا مضمون جب صاحب کے دستخط کے لیے اس نے پیش کیا تو اس میں دو غلطیاں نکل آئیں۔ "دیکھیے اس طرح کام نہیں چلے گا۔" صاحب اس پر غرّایا: "معلوم ہوتا ہے آپ کچھ دیکھتے بھالتے نہیں۔ اسے پھر سے ٹائپ کرائیے۔" صاحب نے وہ کاغذ اس کے منھ کی طرف اچھال دیا۔ وہ خاموش رہا۔ دوسرے دن اس نے افسر سے اپنی چھٹّی کی درخواست پر بات کی اور اس کے کمرے سے نکل کر کینٹین میں آ بیٹھا۔ لوگوں نے اسے آپے سے باہر دیکھ کر پوچھ گچھ کی تو بولا۔

"کل کے لونڈے افسر بن گئے ہیں، اپنے کو کیا ہے، نوکری کرنا ہے، ایسا کرو ایسا کریں گے، ویسا کرو ویسا کریں گے۔ لیکن بھیا اس طرح بہت دنوں نہیں چلے گی۔ عورت الگ طعنے دے دے کر کھائے جا رہی ہے۔ کہتی ہے صبح شام جب دیکھو دفتر دفتر۔ تمھاری طرح کوئی نوکری کے کارن گھر میں آگ نہیں لگا دیتا۔"

اور پھر ایک دن یہی ہوا۔ بڑے بابو کی چھٹّی منظور ہو گئی اور وہ دو ماہ کی رخصت پر گھر بیٹھ رہا۔

اس کی چھٹّی کا پہلا دن اس کی بیوی بچّوں کے لیے بڑا ہنگامی دن ثابت ہوا۔ چھٹّی لے کر جب وہ رات اپنے بستر پر لیٹا تو اس نے سوچا تھا کہ وہ سویرے دن چڑھے تک سوئے گا۔ لیکن سویرے حسبِ عادت اس کی آنکھ کھل گئی۔ چائے پینے کے بعد وہ آرام سے بیٹھا۔ اس کے پاس پورے دو مہینے خالی پڑے تھے۔ وہ جس طرح چاہتا پوری آزادی کے ساتھ انھیں استعمال کر سکتا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو آواز دے کر اپنے پاس بٹھایا اس کو اپنے لمبے چوڑے پروگرام سے آگاہ کیا اور ان سارے کاموں کی ایک فہرست ترتیب دی جو فرصت نہ ہونے کے سبب التوا میں پڑے ہوئے تھے۔ اس نے

رات کو لیٹتے وقت ایک لمبا چوڑا پروگرام بنایا تھا۔

پہلے دن تو وہ ایک جانگیا اور بنیائن پہن کر گھر کے سارے کمروں کی چھتوں اور کونوں میں لگے ہوئے جالے صاف کرتا رہا۔ دن میں سوا نو بجے کے قریب اسے بھوک لگ اٹھی۔ وہ کئی برس سے دفتر جانے سے پون گھنٹہ پہلے کھانا کھا لینے کا عادی تھا۔ لہٰذا صفائی وفائی چھوڑ چھاڑ کر وہ باورچی خانے میں گھس گیا۔ اس کی بیوی نے کھانا نکال کر دیا تو وہ اس پر ٹوٹ پڑا۔ بیوی کچھ دیر اسے دیکھتی رہی۔ وہ جلتے جلتے نوالے جلدی جلدی حلق سے اتار رہا تھا۔ آخر وہ بول اٹھی۔

" اب آج کون سا دفتر کی دیر ہو رہی ہے جو ریل گاڑی چھوڑے ہوئے ہو۔ ٹھیک سے کھاؤنا " اور اسے جیسے ایک دم سے بریک لگ گیا۔ بات تو ٹھیک تھی۔ لیکن چند لمحوں بعد اس کی رفتار پھر اپنی اصلی حالت پر آگئی۔ جالے والے صاف کرنے کے بعد وہ اپنا ٹرنک اٹھا لایا اور انگنائی میں لاکر ڈال دیا۔ اپنے گرم کپڑے دھوپ میں ڈالے۔ دوسرے صندوق کو کھولا جو کاغذات سے بھرا تھا۔ دو تین گھنٹوں تک وہ ان کاغذات کو الٹتا پلٹتا رہا۔ پرانے خط، کیش میمو، بل کی رسیدیں اور ردی کاغذات پڑھ پڑھ کر پھاڑتا رہا۔ جب وہ اٹھا تو ردی کاغذوں کا ایک ڈھیر سا لگ گیا تھا۔ پھر اس نے اپنے کمرے کی چیزوں کو قرینے سے لگایا۔ سارے فرش کو پانی سے دھویا۔ گھر کی ٹوٹی کو برا سو سے، رگڑ رگڑ کر صاف کیا۔ بچوں کے کئی میلے کپڑے بھی اس نے دھو کر پھیلا دئے، حالانکہ اس کی بیوی نے کافی احتجاج کیا۔

دوسرے دن بھی وہ گھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں بے حد مشغول رہا۔ دن کا کھانا کھانے کے بعد اس نے گھر بھر کے پرانے جوتے چپلیں جمع کیں اور ان کا اچھی طرح سے جائزہ

لیا۔ بڑے لڑکے کے جوتوں کے تلے نے دانت نکال دیئے تھے۔ کسی کی چپل کا فیتہ لگ
ہو گیا تھا، کسی کی ایڑی گھس گئی تھی۔ کسی کا پٹہ اکھڑ گیا تھا۔ اس نے سب کو تھیلے میں
رکھا اور انھیں ٹکوانے چلا گیا۔ واپس آکر اس نے پالش کی ڈبیاں اور برش سنبھالے
اور ایک سرے سے سب کے جوتوں پر پالش کی۔ شام کو مطب کے وقت وہ اپنے سب
سے چھوٹے بچے کو ہومیوپیتھک کے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ جسے ایک مدت سے گھینگھے کی
شکایت تھی۔ اس ڈاکٹر نے اسے ایک دن کی خوراک دے کر آٹھ دن کی چھٹی کر دی۔

تیسرے دن وہ اپنے بیوی بچوں کو ان کے عزیزوں سے ملانے لے گیا۔ اس
کی بڑی سالی نے متعدد بار اس کے گھر نہ آنے کی شکایت کی تھی، لہٰذا وہ شام اس نے
بچوں کے ساتھ بڑی سالی کے یہاں گذاری۔ اگلے دن اس کی بیوی نے دبی زبان
سے بازار چلنے کو کہا تو وہ سب کو لے کر اس شام بڑی شان سے نکلا۔ اس نے دو ہی
بجے سے بچوں کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ سب کے بال کٹوائے گئے تھے۔ سب
کو نہلایا گیا تھا اور سب نے ہی اپنا اچھے سے اچھا جوڑا نکال کر پہنا تھا۔ اس شام اس
نے بچوں کے ساتھ قلفی ملائی کھائی اور بڑے دس کے سینما حال میں کوئی دھار مک فلم
دیکھا۔ غرضکہ شروع کا ایک ہفتہ آندھی طوفان کی طرح گذر گیا اور اسے کسی کمی کا احساس
ہی نہ ہوا۔ ان دنوں وہ بہت خوش خوش رہا، لیکن ایک ہی ہفتہ گذرا تھا کہ
اسے ایک عجیب انکشاف ہوا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق ساڑھے نو بجے کھانا
دانا کھا چکا تو پلنگ پر آکر لیٹ گیا اور ان سارے کاموں پر غور کرتا رہا جو فرصت
نہ ہونے کی وجہ سے ادھورے پڑے تھے۔ اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ سارے
کام پچھلے چار دنوں میں ہی مکمل ہو چکے تھے۔ وہ سمجھتا تھا کہ کم سے کم ایک ماہ اُسے ان

کاموں کو ختم کرنے میں لگ جائے گا۔ اس نے پچھلے چھ سال سے کوئی طویل چھٹی نہیں لی تھی، اس کی ساری چھٹیاں یونہی پڑی تھیں۔ لیکن اب افسر سے الجھنے کے بعد اُسے کئی بار یہ محسوس ہوا کہ شاید وہ بہت تھک چکا ہے۔ اسے کچھ عرصہ آرام کی ضرورت ہے لہٰذا یہ سوچ کر اسے بڑا سکون ہوا کہ چلو گھر کے کام ختم ہو گئے تو کیا ہوا، کم سے کم وہ کچھ عرصے دفتر کے جنجال سے تو بچا رہے گا۔ اگلا دن اس نے چارپائی پر پڑے پڑے گذار دیا، بغیر کسی کام کے۔ آخر کو وقت کاٹنے کے لیے اس نے ایک اور راستہ نکالا۔ وہ تار بابو کے بڑے لڑکے سے ملا۔ اور ان سے ہندی کے کچھ رسالے اور ناولیں مانگ لایا لیکن کتاب کا ایک آدھ صفحہ پڑھنے کے بعد اُسے خیال آتا کہ وہ پسینہ سے تر بہ تر ہے۔ وہ جھنجھلا کر کتاب الگ ڈال دیتا۔

"بڑی گرمی ہے" وہ بھیگے ہوئے بدن سے پسینہ صاف کرتے ہوئے کہتا۔

"دفتر میں پنکھے کے نیچے بیٹھے بیٹھے خس کی ہوا کھاتے تھے" اس کی بیوی مسکرا کر کہتی اور اسے یکبارگی اپنے کانوں میں بڑے سے ہال کے پنکھوں کی لگاتار بھن بھن کی آواز سنائی دینے لگتی۔ ایک لمحہ کے لیے ٹائپ مشینوں کی کھٹ کھٹ، کاغذوں کی کھڑکھڑاہٹ، کلرکوں کی چہلیں، چپراسیوں کے متحرک جسم اس کی آنکھوں کے سامنے پورا دفتر گھوم جاتا۔

"بڑے بابو! آپ کو صاحب بلا رہے ہیں"

"بڑے بابو۔ کیا کاغذ ابھی دستخط ہو کر نہیں لوٹے؟"

بڑے بابو، بڑے بابو۔ اس کے کانوں میں صدائیں گونجیں ـــ پھر کینٹین کا ہنگامہ اسے یاد آیا۔ گرم گرم پکوڑیاں اور گلاسوں میں جلتی ہوئی چائے، چھولے کی پلیٹیں، برفی کی قتلیاں، کلرکوں کا شور و غل۔ اس نے ان خیالوں کو جھٹک کر کروٹ لی۔ اس

نے سوچا اب اسے کچھ دن آرام کرنا ہے' اپنے گھر بار کو دیکھنا ہے۔ اس کی بیوی نے ایک بار اُسے یوں خالی خالی لیٹے دیکھا تو اس کے پاس آکر بیٹھ گئی اور بولی۔

"جب چھٹی ہی لی ہے تو ایک ڈیڑھ گھنٹہ ذرا بچوں کو ہی دیکھ لیا کرو۔ امتحان سر پر کھڑا ہے۔"

یہ بات خود اس کو بھی کھٹک رہی تھی۔ بڑے لڑکے کا ایک سال خراب بھی ہو چکا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ روزانہ چاروں بچّوں کو لے کر بیٹھا کرے گا۔ شام کو چراغ جلتے ہی اس نے ہانک لگائی۔

"چلو سب اپنے اپنے بستے لے کر میرے پاس آؤ۔"

اس کے تین بڑے لڑکے کچھ دیر بعد اپنا سامان لے کر اس کے پاس آ گئے، لیکن چوتھا جو چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا، نہیں آیا ___ وہ اس پر برس پڑا۔ لیکن وہ ماں کے کمرے میں ایک کونے میں دُبکا کھڑا رہا۔ آخر کو ماں نے آکر بتایا کہ اس کی ہندی کی کتاب کھو گئی ہے۔ اور وہ مارے ڈر کے کونے میں کھڑا ڈر رہا ہے

یہ سن کر اس نے پھر سب ہی کے بستوں کی تلاشی لینا شروع کی اور کتابوں کاپیوں کی جانچ کرنے لگا۔ کتابیں پھٹی پھٹی، کچھ صفحے موجود کچھ غائب، کاپیوں کے کور الگ، اور روشنائی کے دھبوں سے آراستہ۔ شاید اس طویل عرصہ میں پہلی بار بچوں کے بستے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اسے بےحد غصّہ آیا۔ لیکن اس نے سن رکھا تھا کہ بچوں کو غصّے سے نہیں، پیار سے سمجھانا چاہیئے۔ اس نے ان سب کو کتابیں کاپیاں رکھنے کے طریقے بتائے اور پڑھائی شروع کر دی۔ پڑھائی کا پہلا دن تو کسی نہ کسی طرح سے گزر گیا لیکن پھر پیار سے سمجھانے والی بات دھری رہ گئی۔ جب لاکھ پیار

اور محبت سے بتانے پر بھی بچوں کی سمجھ میں بات نہ آئی اور اس کے سوالوں کے خاطر خواہ جواب وہ نہ دے پاتے اور جب وہ ہزار بارسی، اے، ٹی کیٹ، کیٹ معنی بلّی بتا کر بھی کیٹ معنی چوہا سنتا تو آپے سے باہر ہو جاتا۔ انھیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ ڈالتا اور پھر وہ کہرام مچتا کہ بال سے نہ دیکھا جاتا۔ آخر کو ایک دن وہ کہہ اٹھی۔

"بس بس پڑھا چکے تم۔۔۔ ذرا میں تو جان پیٹ ڈالتے ہو، تم کیا پڑھاؤ گے۔ ان کے بھاگ میں ہوگا تو آپ پڑھ لیں گے۔"

"ارے پڑھیں سالے یا نہ پڑھیں۔ میں اپنا خون نہیں جلاؤں گا ان کے پیچھے۔ دماغ میں تو گوبر بھرا ہے، پڑھیں گے کیا خاک۔ اور پھر اس روز سے یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا لیکن ابھی تو اس کی چھٹی کے دن شروع ہی ہوئے تھے۔ ابھی تو ڈیڑھ مہینے سے زیادہ کا عرصہ خالی پڑا تھا۔ یہ خیال آتے ہی وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔

دوسرے دن وہ ٹھیک ساڑھے نو بجے کھانا وانا کھا کر اپنے کمرے میں آیا اور جلدی جلدی کپڑے پہننے لگا۔ بیوی نے پوچھا تو بولا۔

"ذرا ادا ایک دوستوں سے مل آؤں۔ تھوڑی دیر میں آجاؤں گا۔" گھر سے نکل کر وہ ٹھیک دس بجے اپنے پرانے دوست ورما کے دفتر پہنچ گیا۔ ورما بھی ہیڈ کلرک تھا اور دونوں میں خوب پٹتی تھی۔۔۔ ورما نے اسے دیکھ کر چپراسی سے کرسی منگائی اور اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔

اس نے کمرے کے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ کلرک اپنی اپنی میزوں پر بیٹھے تھے۔ ایک کونے سے ٹائپ کی آواز آ رہی تھی۔ اس کے کانوں میں ایک مانوس سی بھنبھناہٹ سنائی دی۔ اس نے اوپر دیکھا، اس کے سر پر پنکھا چل رہا تھا۔

میزوں پر پیپرویٹس کے نیچے دبے ہوئے کاغذات آہستہ آہستہ پھڑپھڑا رہے تھے۔
اس نے ایک گہری اطمینان کی سانس لی۔ ورما اپنی عینک کے نیچے سے اُسے دیکھتے
ہوئے بولا۔

"سنا ہے لمبی چھٹی لے لی ہے تم نے۔"

"ہاں یار کام کرتے کرتے تھک گیا، سوچا کچھ دنوں آرام کرلوں۔"

"بڑے بابو نمستے!" کسی کونے سے کوئی مخاطب ہوا۔

"نمستے، نمستے!" اس نے خوش ہو کر جواب دیا۔

کسی نے کہا۔ "کہیے بڑے بابو، سب آنند ہے۔"

"ہاں بھیا، سب مہربانی ہے۔" اس نے کھلی ہوئی باچھوں سے جواب دیا۔

بڑے بابو، بڑے بابو ___ کتنے دنوں بعد اُسے اس نام سے مخاطب کیا گیا
تھا اور اب اسے احساس ہوا جیسے اس مخاطبہ نے کسی خلا کو پُر کر دیا۔ کوئی انجان
کمی تھی جو پوری ہو گئی۔ وہ مسرّت سے جھوم کر بولا۔

"لیجیے، آپ لوگ پان کھائیے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے پانوں کی ڈبیا
اور بٹوا بڑھا دیا۔ بٹوے نے ساری میزوں پر گشت کرنا شروع کر دیا۔ بٹوے
کو اس طرح گھومتے دیکھ کر اُسے ایک سکون سا محسوس ہوا۔ ایک اندرونی آسودگی۔

"اور سناؤ ورما۔ کام دام تو ٹھیک چل رہا ہے۔" وہ اپنے دوست سے
مخاطب ہوا۔

"ہاں ٹھیک ہی کیا۔ بس چل رہا ہے۔ کئی دنوں سے کچھ ریمائنڈر پڑے
ہیں۔ ابھی تک جواب لکھنے کی نوبت نہ آئی۔ آج کل بڑی سستی سوار ہے۔ یہ دیکھو،

آتے ہی لے کر بیٹھ گیا۔

"لاؤ، ایک آدھ میں ہی پار لگا دوں۔" وہ بڑے اطمینان سے بولا۔ ورما نے انکار کیا لیکن وہ نہیں مانا۔ اس نے ورما سے کاغذ قلم لے لیا، مجبوراً ورما کو خط کا متن اُسے سمجھانا پڑا۔ اس نے دس منٹ کے اندر خط ڈرافٹ کر دیا۔ کس وقت ایک بجا، اس کو احساس ہی نہ ہوا، ڈیڑھ بجے کے قریب وہ سب لوگ پاس ہی کے ایک چائے خانے میں اُسے لے کر چلے گئے۔ چائے خانے میں بیٹھا وہ ان لوگوں سے اپنی ملازمت کے تجربے بیان کرتا رہا۔ مختلف افسروں کے مزاج، عادتیں اور ان سے لڑے جانے والے مورچے بیان کرتا رہا۔ چائے خانے سے واپسی پر وہ پھر ورما کے ساتھ اس کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

یہ سلسلہ، یعنی گھر سے دس بجے نکل جانا اور شام پانچ بجے تک واپس آنا کئی دنوں تک جاری رہا۔ وہ اس بیچ اپنے کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا رہا۔ قدرے خوش بھی رہا۔ لیکن اس کی بیوی یہ سب دیکھ دیکھ کر آخر کڑھنے لگی۔ ایک دن اس نے پوچھا۔

"تم سارا سارا دن غائب رہتے ہو — جانے کہاں چلے جاتے ہو، ایسی چھٹی سے کیا فائدہ —"

"پھر گھر پر پڑے پڑے کیا کروں۔" وہ تیوریوں پر بل ڈال کر بولا۔

"تو چھٹی لیے کیوں پڑے ہو، اپنے دفتر جاؤ نا۔"

"— اپنے دفتر جاؤ نا —" جیسے ایک زوردار ہوا کا تھپیڑا اس کے آگے لگا۔ — اپنے دفتر — وہ سپٹا گیا۔ اس کی بیوی نے تو ایک بات کہی تھی۔ معمولی سی۔ لیکن اس نے دل میں کئی بار اس کے جملے پر غور کیا۔ اپنے دفتر — اپنے دفتر

تو کیا اس کی بیوی کو معلوم ہے کہ وہ دن بھر دوسروں کے دفتر میں بیٹھا رہتا ہے۔
رات کو جب وہ لیٹتا، تو بہت دیر تک چھت کو تکتا رہا۔ اسے بڑا عجیب سا لگا۔ وقت! اس میں کتنی قوت ہے پریشان کرنے کی، تھکا دینے کی، الجھا دینے کی۔

پورا وقت اس کا اپنا ہے، اُسے پوری آزادی ہے جو جی چاہے کرے، جہاں چاہے جائے، جس مشغلے کو چاہے اپنائے۔ برسوں سے ایک ہی ڈگر پر چل رہا تھا۔ وہی سڑک، وہی راستے، وہی دفتر کا کمرہ، وہی جانے پہچانے چہرے۔ وہ ان سب سے اکتا چکا تھا، ان سے بھاگنا چاہتا تھا، اس کا جی آرام کرنے کو چاہتا تھا۔ اور جب وہ چھٹی لے کر گھر بیٹھا تو وقت — یہ فرصت — یہ آزادی کتنی جلدی وہ ایک تھکن، ایک بیزاری سی محسوس کر رہا ہے — اس نے اپنے سے سوال کیا۔

"میں ورما کے دفتر کیوں جاتا ہوں — میں کسی اور مشغلے کو کیوں نہیں اپناتا"
اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ ایک میٹھا میٹھا سا درد اُسے اپنے اندر محسوس ہوا ایک ایسی کوفت جو انسان کو اس وقت محسوس ہوتی ہے، جب اس کا ذہن صاف نہ ہو۔ جب وہ کسی بات کی حقیقت کو سمجھنا چاہے اور سمجھ نہ پائے۔

دوسرے دن اس نے کھانا کھایا، کپڑے پہنے اور اپنے دفتر پہنچ گیا۔ سیدھا اپنی کرسی پر جا کر بیٹھا اور دراز سے کاغذ نکال کر اس نے چھٹی کے منسوخ کرنے کی (Application) لکھ کر صاحب کے کمرے میں بھیج دی۔

اس کی ناک میں خس کی ٹٹیوں کی بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی کانوں میں پنکھوں کی بھِن بھِن ـــ اس نے دیکھا، سبزوں پر پیپر ویٹس کے نیچے دبے ہوئے کاغذ دھیرے دھیرے پھڑ پھڑا رہے ہیں۔ وہ چول جو ادھر کئی دنوں سے اکھڑی اکھڑی سی تھی، یکبارگی کھٹ سے اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ اس نے اطمینان کی ایک لمبی سی سانس لی ـــ اور سوچنے لگا۔

ریٹائرڈ ہونے کے بعد بس کتنے دن جی سکوں گا، کیونکہ پھر چھٹی منسوخ کرنے کا کوئی سوال ہی نہ ہوگا۔

■ ■

شوکیس

کبھی کبھی جب دل کے کنول کسی طرح کھلنے کو ہی نہیں آتے تو مجھ جیسے بیقرار دل نوجوان ایسا ہی کچھ کر گذرتے ہیں۔

ایک دن میرے ذہن میں ایک عجیب ہی خیال آیا، اور سچّی بات تو یہ ہو کہ میں نے ایسا صرف سوچا ہی نہیں بلکہ مکمل ارادہ کر لیا تھا کہ اگر موقعہ ملا تو یقیناً میں ایسا کر گذروں گا۔ یہ فیصلہ میں نے ایک طویل مدّت کے بعد کیا تھا۔ اور اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ کیونکہ میری کوئی آمدنی نہیں تھی۔ ابھی تو میں بی، اے کا صرف ایک طالب علم تھا جو ایک خوبصورت فاونٹن پن بہترین سائیکل اور قیمتی گھڑی رکھ کر اپنے اوپر فخر محسوس کرتا ہے۔ جہاں تک میرے باپ کا تعلق ہے تو شاید میں ان کی پوری تنخواہ کے بدلے میں بھی اپنی اس آرزو کی تکمیل نہ کر سکتا تھا اس لیے میں نے جو کچھ سوچا تھا بس وہی ایک راستہ تھا۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان جگمگاتی ہوئی دوکانوں کی دو رویہ

قطاروں کے درمیان سے مجھے روز ہی گذرنا پڑتا تھا اور میرا خیال ہے کہ اگر دکانوں میں شوکیس نہ ہوں تو انسان اور زیادہ سکون کے ساتھ زندہ رہ سکتا ہے ورنہ ایسا کیوں ہوتا تھا کہ جب بھی کبھی "اسٹینڈرڈ ٹائم" کی دوکان قریب آتی میرے قدم جیسے یکبارگی رک جاتے، دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی کہ کم سے کم ایک بار چل کر اسے دیکھ ہی لوں۔ اور پھر غیر ارادی طور پر میں دوکان کے اندر چلا جاتا ــــ میری نظریں کچھ دیر کے لیے اس پر ٹھہر جاتیں، دل میں ایک ہوک سی اٹھتی اور میں کسی نامراد عاشق کی طرح ایک ٹھنڈی سانس لے کر دوکان کے باہر چلا آتا ــــ باہر نکل کر مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے ہزاروں محرومیوں نے ایک ساتھ سر اٹھا دیا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے اپنی محرومی کا احساس اس وقت اور زیادہ ہوتا جب کافی ہاؤس کی میزوں پر بیٹھ کر بحث کرتے وقت میرے دوستوں کی آستینیں ذرا سا سرک جاتیں۔ اس وقت مجھے احساس ہوتا جیسے میری کلائی پر گھڑی نہیں بلکہ سانپ کا بچہ لپٹا ہوا ہے۔ کیونکہ ان آستینوں سے جھانکتی ہوئی گھڑیوں میں کوئی بھی سو روپے سے نیچے کی نہ تھی۔ ابراہیم صاحب جو بیمہ ایجنٹ تھے ان کی گھڑی کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ وہ کلینڈر واچ باندھتے تھے جس کے ڈائل کے ایک کونے میں سرخ رنگ میں لکھی ہوئی تاریخ بھی دیکھی جا سکتی تھی۔ کلیم کی گھڑی کا فریم سونے کا تھا اور ڈائل پر نمبروں کی جگہ چمکیلے موتی جڑے ہوئے تھے ــــ اور پھر جس دن میں نے سب کو یہ کہتے سنا تھا کہ "گھڑی اگر باندھی جائے تو قیمتی ورنہ کوئی ضرورت نہیں۔" اس دن سے مجھے اپنی گھڑی سے نفرت ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ گھٹیا مال پھر بھی گھٹیا ہوتا ہے ــــ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ چار کا چھ اور چھ کا تین بجاتی۔ دوست وقت پوچھتے تو سو

سامنے بنا کر کہنا پڑتا "میری گھڑی ابھی بند ہوگئی"۔ ٹھیک اسی زمانہ میں جب میں اپنی پچاس روپے کی معمولی گھڑی سے مکمل طور پر نفرت کرنے لگا تھا ایک دن "اسٹینڈرڈ ٹائم" کی دوکان پر میرا جانا ہوا تھا۔ اسی دن پہلی بار میں نے وہ گھڑی دیکھی تھی۔ دوکان کے بیچ میں شیشوں کے خوبصورت شوکیسوں میں سیکڑوں قسم کی مختلف گھڑیاں رکھی ہوئی تھیں۔ لیکن اس گھڑی کو ایک خاص اہتمام کیساتھ ایک کونے کی میز پر رنگین شیشے کی ایک چپٹی طشتری پر رکھا گیا تھا اور وہ گول طشتری آہستہ آہستہ اوپر سے نیچے کی طرف دائرہ بناتے بناتے ہوئے چکر لگا رہی تھی۔ شاید بجلی کی مدد سے اسے حرکت میں لایا گیا تھا۔ میں اس گھومتی ہوئی پلیٹ کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا تھا اور بہت دیر تک اس گھڑی کو دیکھتا رہا تھا۔ گھڑی کے فیتے کے ساتھ ریشم کی ڈوری میں ایک چھوٹا سا لیبل لٹک رہا تھا جس پر گھڑی کی قیمت لکھی ہوئی تھی۔ میں نے کچھ اور قریب ہو کر قیمت کو غور سے پڑھا تھا جس پر RS 375/- لکھے تھے۔ بس اس دن سے وہ گھڑی آنکھوں میں کھپ کر رہ گئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ گھڑی میری اپنی گھڑی کے مقابلے میں شکل وصورت میں بالکل ایک تھی۔ ڈائل کے نمبروں کا رنگ اور ڈیزائن وہی تھا، ویسی ہی نازک سی سوئیاں، کیس کا وہی سنہرا رنگ اور ویسا ہی کالا فیتہ، لیکن قیمت کے اعتبار سے ان دونوں کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ کہاں صرف ۵۰ روپے اور کہاں ۳۷۵۔

بہر حال وہ دن تو گذر ہی چکے تھے اور وہ آرزو اب پل بڑھ کر جوان ہو چکی تھی۔ لہٰذا میں نے ایک دن اپنی گھڑی نکالی اور ہاتھ میں لگانے کے

بجائے اسے جیب میں ڈال کر بازار پہونچا۔ "اسٹینڈرڈ ٹائم" کی دوکان میں جب
میں نے پہلا قدم رکھا تو میرا دل تیزی کے ساتھ دھڑک رہا تھا اور ماتھے پر پسینہ
اُبھر آیا تھا۔ اپنی حالت پر قابو پانے کے لئے پہلے تو میں دوکان کے شوکیسوں پر
جھک کر مختلف گھڑیوں کو دیکھتا رہا، لیکن بہت دیر تک میں اپنی اصلی حالت
پر واپس نہ آسکا۔ میرا حلق تقریباً سوکھ چکا تھا۔ اور ایسا لگ رہا تھا جیسے میری
ٹانگوں میں کھڑے رہنے کی طاقت نہیں رہ گئی ہے۔ مجھے ان شوکیسوں پر مصروف
دیکھ کر ایک خوش پوش نوجوان جو کاؤنٹر پر کھڑا کچھ حساب کتاب کر رہا تھا۔ میری
طرف مسکراتا ہوا بڑھا اور قریب آکر انتہائی نرم لہجے میں بولا۔

"فرمائیے آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"جی شکریہ۔" میں نے جلدی سے اپنی آواز میں وقار پیدا کرتے ہوئے کہا۔
"ذرا کلائی کی گھڑیاں دیکھ رہا تھا۔"

"شوق سے دیکھئے آپ ہی کی دوکان ہے۔" وہ میٹھے انداز میں مسکرایا۔
"کیسی گھڑی چاہیئے آپ کو؟"

"جی کوئی عمدہ گھڑی دیکھنا تھی، مضبوط بھی اور خوشنما بھی۔" میں نے اپنے
لہجے میں اعتماد پیدا کیا۔

"کسی خاص میکر کی گھڑی دیکھنا تو نہیں چاہتے آپ؟"

"نہیں کوئی ضروری نہیں۔" میں نے کہا۔ "کسی بھی کمپنی کی ہو ـــــ" یہ کہہ کر
میں نے اپنی نظریں چاروں طرف دوڑائیں۔ اور میری نظر اس میز پر جا کر رُک گئی جہاں
وہ خوبصورت گھڑی رکھی ہوئی تھی۔ جو میری سب سے بڑی آرزو بن کر رہ گئی تھی اور جسکی

خاطر میں وہ سب کچھ کرنے جارہا تھا جو میں نے ابھی تک نہیں کیا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوا!

"اگر آپ کو میرا مشورہ قبول ہو تو عرض کر دوں"۔

"ضرور۔ مجھے خوشی ہو گی۔" میں نے شکر گزار ہوتے ہوئے کہا۔

"میری رائے میں تو آپ ایسی کمپنی کی گھڑی لیجئے جس پر اعتماد کیا جا سکے، ایسی گھڑیاں مہنگی تو ضرور ہوں گی لیکن آپ کو ان سے کبھی شکایت نہ ہو گی۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" میں نے تائید میں سر ہلا دیا۔ یہ سن کر اس نے جلدی جلدی میرے سامنے مختلف کمپنیوں کی قیمتی گھڑیاں دکھانا شروع کر دیں۔ سنہری روپہلی، چپٹی، گول چوکور وہ مجھے گھڑیاں دکھاتا جاتا تھا اور ان کے بارے میں قصیدے پڑھتا جاتا تھا۔

"یہ دیکھیے یہ گھڑی واٹر پروف ہے۔ ANTIMAGNETIC ہے، جو بلیس کی اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کی یہ سنہری پالش نقلی نہیں، بڑی شاندار گھڑی ہے۔ یہ کمپنی تو آج کی بازار میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔"

میں گھڑیوں کو دیکھتا تھا ان کی قیمتیں پوچھتا تھا اور مسکرا کر گردن ہلا دیتا تھا اور پھر میری نظر ایک لمحے میں پھسل کر اس کونے میں چلی جاتی جہاں وہ گھڑی شیشے کی طشتری پر آہستہ آہستہ رقص کناں تھی۔ اب میں اس نوجوان دکاندار کی عنایتوں سے کچھ اکتا گیا تھا۔ آخر کار اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے میں نے نرمی سے کہا۔

"بہت کافی گھڑیاں دکھا دیں آپ نے مجھے، بہت بہت شکریہ آپ کا۔"

"کوئی بات نہیں۔ وہ اسی نرمی سے بولا۔" ویسے کون سی گھڑی آپ کو پسند آئی۔"

"کچھ گھڑیاں اس میں واقعی خوب ہیں۔" میں نے کہا۔ "میں فی الحال خرید لے کی نیت سے نہیں آیا تھا۔ ابھی تو میں ایک نظر جائزہ لینا چاہتا تھا تاکہ میں کوئی رائے قائم کر سکوں۔ جلد ہی میں آپ کے یہاں سے ایک گھڑی لے جاؤں گا۔"

"اوہ بہت شوق سے دوکان آپ کی ہے۔"

"نہیں مجھے شرمندگی ہے کہ میں نے آپ کو زحمت دی۔"

وہ بولا۔ "جب کبھی ضرورت ہو آپ تشریف لا سکتے ہیں۔" اور یہ کہہ کر اُس نے گرمجوشی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میں نے اپنی پتلون کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈال کر سیٹی بجانا شروع کر دی اور دکان کے چاروں طرف اٹھتی ہوئی نظر ڈال کر آہستہ آہستہ اس کونے کی طرف بڑھنے لگا جدھر وہ گھڑی ناچ رہی تھی۔

مجھے صرف اس لمحے کا انتظار تھا جب وہ نوجوان غافل ہو جائے صرف اتنی دیر کے لئے کہ میں طشتری میں رکھی ہوئی اس گھڑی کو اٹھا سکوں اور صرف اٹھا ہی نہ سکوں بلکہ ٹھیک اُسی جگہ اپنی گھڑی اسی انداز سے رکھ سکوں۔ کیونکہ اس کے بغیر شاید میں کامیاب نہ ہو پاتا۔ میرے جانے کے فوراً بعد اگر اس نوجوان کی نظر اس شوکیس پر پڑتی اور وہ اُسے خالی دیکھتا تو یقیناً اس کا شک مجھ پر ہوتا۔ اور میں وہاں اتنی بار آچکا تھا کہ وہ مجھے کسی جگہ بھی پہچان لیتا۔ اپنی بچت کے لئے اس سے اچھی ترکیب اور کوئی نہ تھی کیونکہ میری گھڑی اور اس گھڑی کی ظاہری شکل و صورت میں کوئی فرق نہ تھا اور مجھے یقین تھا کہ اس تبدیلی کے بعد وہ شخص کبھی بھی اصل حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا تھا یہاں تک کہ وہ اسے غور سے نہ دیکھتا۔

غرضیکہ اس لمحے کے انتظار میں میں اس میز کے چاروں طرف آہستہ آہستہ طواف

کرتا رہا - میرا ہاتھ پتلون کی جیب میں تھا اور مٹھی میں گھڑی، میرے دوسرے ہاتھ کی انگلیاں اپنا کام کرنے کے لئے بےچین تھیں - لیکن مجھے ایسا لگا جیسے اس میز کے چاروں طرف گھومتے ہوئے میری ایک ایک حرکت بالکل بناوٹی اور بھونڈی ہے میرے چہرے کی گھبراہٹ، میری آنکھوں کی وحشت، میری بے ہنگم سیٹی کی دھن، میری چال کی غیر اعتمادی، غرضکہ ایک ایک چیز جیسے پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ میں وہ نہیں ہوں جو ظاہر کر رہا ہوں کبھی میں اس گھڑی دیکھتا تھا اور کبھی اس نوجوان کی طرف جو کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے ہو کر پھر اپنے کاغذات میں مصروف ہو گیا تھا میرے دل نے تیزی کے ساتھ دھڑکنا شروع کر دیا تھا اور میرے ذہن میں بس ایک ہی سوال بار بار ہتھوڑے مار رہا تھا۔

" اگر گھڑی اٹھا کے یار کھنے کے دوران میں اس کی جھکی ہوئی آنکھیں ادھر اٹھ گئیں تو کیا ہو گا ــــ ؟"

میری ہمت جواب دے گئی - مجھے ایسا لگا جیسے میں بے ہوش ہو جاؤں گا۔ آخر کو میں نے رومال نکال کر اپنے چہرہ کا پسینہ پونچھا اور سوکھے ہوئے ہونٹوں پر زبردستی مسکراہٹ لا کر بولا۔

"کیوں جناب یہ گھڑی جو باہر اس شوکیس پر رکھی ہے اس کی کیا قیمت ہے۔"

اس نے لاپرواہی کے ساتھ کاؤنٹر پر سے ہی جواب دیا۔

" یہ گھڑیاں تو اب نایاب ہیں جناب، کیوں کیا آپ کو پسند ہے۔ اس کی قیمت ۳۷۵ روپیہ ہے۔"

اوہ ـــــ میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا اور پھر میرے قدم ڈگمگانے لگے۔ آخر کار میں نے اسے الوداعی نظر سے دیکھا اور بولا۔ اچھا جناب آداب عرض۔

"آداب عرض ـــ" اس نے کاؤنٹر پر ہی سے مسکرا کر جواب دیا۔ اور میں اس سے آنکھیں ملائے بغیر دوکان کے باہر چلا گیا ـــــــــ میرے ارادے ڈگمگا گئے تھے اور میرے سارے عزائم پسپا ہو گئے تھے دوکان کے باہر نکل کر جب ہوا کا ایک جھونکا لگا تو مجھے محسوس ہوا میرا سارا جسم پسینے سے شرابور تھا۔

اس واقعہ کو کئی دن گزر گئے۔ لیکن اسے کیا کیا جائے کہ اس ناکامی کے کچھ ہی روز بعد میں نے دوبارہ اعتماد پیدا کر لیا جو یقیناً پہلے سے زیادہ طاقتور اور نڈر تھا کیونکہ ایک ہفتہ بعد میں پھر اس دوکان کے اندر داخل ہوا۔ ایک بات کا خیال میں نے پہلے ہی رکھا تھا کہ اس بار دوکان میں وہ سیلس مین موجود نہ ہو جس نے ایک بار مجھے گھڑیاں دکھائی تھیں۔ اس بار میں نے محسوس کیا کہ میں بغیر کسی خوف اور گھبراہٹ کے دوکان کے اندر داخل ہوا تھا۔ زیادہ اعتماد اور گمبھیرتا کے ساتھ دوکاندار سے بات چیت کی تھی اور میں اپنی اس حرکت میں پہلے سے زیادہ چست و چالاک نظر آرہا تھا۔ اس بار جب میں نے اس میز کے چاروں طرف طواف کیا۔ اور اس آدمی کی نظر بچی پائی تو میں نے پہلے ہی موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اور مجھے اپنے ہاتھوں میں ایک مشاق اور رواں اٹھائی گیرے کی سی تیزی محسوس ہوئی۔ میں نے ایک ہاتھ سے وہ خوبصورت گھڑی اٹھائی اور دوسرے ہاتھ سے اپنی گھڑی کو اس جگہ رکھدیا۔ اور کسی قسم کا ہلکا سا کھٹکا بھی نہ ہونے پایا۔ گھڑی مٹھی میں آتے ہی میں نے دوکاندار کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور اپنے کام پر لگا ہوا تھا۔ دوکان سے نکلتے وقت یقیناً میرے جسم میں ایک جھرجھری سی آگئی۔ دوکان سے نکلتے ہی میں تیز تیز قدموں سے سڑک پر پھیلے ہوئے ہجوم میں ڈوب گیا۔ اور پھر بازار سے ایک میل نکل جانے کے بعد میں نے ایک پارک میں قیام کیا۔

اب میری کلائی پر بھی ۳۵، روپیہ کی گھڑی بندھی تھی۔ کلائی پر قیمتی گھڑی ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا جب تک کہ وہ آستین سے جھانک کر ایک لمحے کے دوسروں کو اپنی جھلک نہ دکھا دے اور جب تک چند آنکھیں اسے حیرت سے دیکھ کر کچھ تعریفی جملے نہ کہیں۔ جب گھڑی مل گئی تو اُس کے پیچھے چھپے ہوئے اس جذبے نے سر اُٹھایا اور میں غیر ارادی طور پر اپنے شناساؤں کو تلاش کرنے کے لئے اس چائے خانے کی طرف بڑھنے لگا جہاں عموماً بیٹھا کرتا تھا۔

راستے میں جب میں نے گھڑی نکال کر کلاک ٹاور سے وقت ملانے کے لئے چابی گھمائی میری چٹکی میں پھنسی ہوئی، ننھی سی چابی گھوم رہی تھی لیکن سوئیاں اپنی جگہ پر ساکت تھیں دو تین بار میں نے توجہ کے ساتھ چابی گھمائی، لیکن بے سود ثابت ہوا میں نے گھڑی میں کوک دینا چاہی لیکن یہ بھی نہ ہو سکا۔ شائد گھڑی کی کمانی ٹوٹ گئی تھی اور چابی نے اپنی گرفت چھوڑ دی تھی، جب میں بار بار کوششوں پر بھی کامیاب نہ ہوسکا تو مجبوراً مجھے قریب کی ایک گھڑی کی مرمت کرنے والے دوکاندار کے پاس جانا پڑا میں اسے گھڑی دیتے ہوئے بولا۔

"جناب ذرا اسے دیکھ لیجئے۔" ابھی حال ہی میں خریدی تھی اس کی چابی کام نہیں کرتی"۔
گھڑی ساز نے میرے ہاتھ سے گھڑی لی۔ اس کے کیس کو ایک باریک سی چمٹی کے ذریعہ کھولا۔ اور پھر ایک لمحے کے لئے جیسے وہ گھبرا گیا۔ اس نے کچھ بڑبڑاتے ہوئے میری طرف دیکھا اور جھنجھلا کر بولا۔

"یہ کیا مذاق ہے صاحب؟"
"کیا مطلب؟" میں چونک پڑا۔ میں نے غور سے گھڑی کی طرف دیکھا اس کیس کے اندر

کچھ نہیں تھا۔ صرف ڈائل کے اوپر سوئیاں لگی ہوئی تھیں اور مشین غائب تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ میں ایک بے جان مجسمے کی طرح گھڑی ساز کی طرف دیکھتا رہا بالکل بے حس و حرکت اور پھر میری آنکھوں کے سامنے چھوٹی چھوٹی چنگاریاں سی اُڑنے لگیں۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے جھپٹ کر گھڑی ساز کے ہاتھ سے گھڑی لے لی اور تیز رفتاری کے ساتھ اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ بہت دیر تک مجھے یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ میں کس سمت جا رہا ہوں سڑکوں پر دوڑتی ہوئی موٹریں، گزرتے ہوئے چہرے، بجلی کے قمقمے، سب کچھ جیسے اس گھڑی کے خول میں سمٹ آئے تھے۔ میری پیٹھ پر جیسے کسی نے پوری طاقت سے ایک تازیانہ مار دیا تھا اور جس کے درد سے میں تڑپ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک وقت میں میں نے دو بازیاں ہاری تھیں۔ ایک بازی میں اپنی پچاس روپیہ کی گھڑی اور دوسری بازی میں اس آرزو کی شکست ہوئی تھی جس کو میں ایک مدت سے پال پوس رہا تھا۔ غصے سے میرے دانت بھنچے ہوئے تھے۔ اور میں بغیر کچھ سوچے سمجھے تیز تیز قدموں سے ایک طرف بڑھتا جا رہا تھا کہ ایک بار میرے قدم لڑکھڑا گئے۔ سامنے اسٹینڈرڈ ٹائم کا برقی بورڈ جلتا تھا اور بجھ جاتا تھا۔ میری سانس جیسے تیز تیز چلنے لگی۔ اور میں سڑک کے کنارے مبہوت کھڑا اس دوکان کی طرف دیکھنے لگا جس سے ایک گھنٹہ پیشتر میں فتح اور کامرانی کا علم بلند کئے نکلا تھا۔ اتنی بڑی شکست نے مجھ سے میرے ہوش و حواس چھین لیئے تھے اور میں شاید اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا تھا۔ یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا تھا کہ ایک بار پھر میں نے ایک نئے ارادے کو جنم دیا یہ فیصلہ کیا کہ اسی وقت اس دوکان سے اپنی گھڑی واپس لاؤں گا خواہ مجھے کتنا ہی ذلیل کیوں نہ ہونا پڑے۔ خواہ مجھے دوکان سے دھکے دے کر نکال ہی کیوں نہ دیا جائے لیکن میں اتنی بڑی چوٹ نہیں سہہ سکتا۔ اس طرح خاموش نہیں رہ سکتا کیونکہ

میرا یہ فیصلہ قطعی جذباتی تھا اور جذباتی فیصلے اُس بارود کے گولے کی طرح ہوتے ہیں جو ذرا سی چنگاری کی مدد سے ایک پل میں پھٹ جاتے ہیں۔ اس لئے میں بھی اس خیال کے آتے ہی بغیر سوچے سمجھے دوکان کے اندر گھس گیا۔ ایک گھنٹہ پیشتر میں اس دوکان میں آیا تھا۔ ایک گھنٹہ پیشتر مجھے کاؤنٹر پر کھڑے ہوئے آدمی نے دیکھا تھا۔ اور اب ایک بار پھر میں اس کے روبرو تھا۔ بغیر کسی حیلے یا بہانے کے دوکان میں آکر مجھے مصلحتاً اپنے آپ کو سنبھالنا پڑا۔ اگر کام اسی خاموشی کے ساتھ ہو جائے تو کیا حرج ہے۔ اسی خیال سے میں نے منتشر ذہن کو یکجا کیا اور اس سے مخاطب ہوا۔

"میں خود ہی شوکیس میں لگی ہوئی گھڑیاں دیکھ لوں گا، آپ زحمت نہ کیجئے گا۔"

"شوق سے۔" وہ مُسکرایا۔ اور ایک بار تجسّس کے ساتھ میری طرف دیکھ کر پھر اپنی کنپٹیوں کا لچھا گھماتا ہوا دکان کے آخری در میں جاکر کھڑا ہو گیا۔ جہاں سے وہ سڑک پر پھیلی ہوئی رونق کا نظارہ کرنے لگا۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی اور یہ میرے لئے ایک سنہری موقعہ تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر تیزی کے ساتھ دیکھا۔ اور پلک جھپکتے میں زخمی شیر کی طرح اپنے شکار کے قریب پہونچ گیا۔ میں نے دیکھا میری گھڑی اسی طرح رکھی تھی۔ ابھی تک دوکاندار کو میری حرکت کا علم نہ ہوا تھا۔ مجھے قدرے اطمینان ہوا۔ میں نے پھر گردن گھما کر دوکاندار کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور نظارے بازی میں مصروف تھا۔ میں نے جلدی سے اپنی نمائشی گھڑی کو اسی جگہ پر رکھ دیا۔ جیسے ہی میری گھڑی میری جیب میں پہونچ گئی مجھے ایسا لگا جیسے میرے انتقام کی آگ ٹھنڈی ہو گئی جیسے پہلے کے بجائے اب مجھے ۵،۱۳ روپے کی گھڑی مل گئی ہو۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس گھڑی کے لئے میں برسوں سے تڑپ رہا تھا۔ اور اسی کی آرزو میں میں نے یہ سارے معرکے طے کئے تھے۔ میں بہت اطمینان سے ٹہلتا ہوا اسی در تک پہونچا جہاں وہ شخص

کھڑا ہوا اب بھی اطمینان کے ساتھ کنجی کا چھلا گھما رہا تھا میں نے ایک بار اس کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔ میں نے اُس کی بغل سے نکل کر باہر نکلنے کے لئے دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا کہ مجھے اپنے شانے پر ایک بوجھ محسوس ہوا میں نے گھوم کر دیکھا۔ وہ نوجوان میرے شانے پر ہاتھ رکھے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ وہ لاپرواہی کے سے انداز سے میں کہنے لگا۔

"جن دوکانوں میں بہت سے آئینے ہوں وہاں بڑی مشکل پڑ جاتی ہے۔"

"جی جی" میں جیسے کانپ اٹھا۔ "کیا بات ہے میرے حلق سے مری ہوئی آواز نکلی۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑی تلخ مسکراہٹ مسکرایا اور انتہائی سرگوشی کے انداز میں بولا۔

"باہر جانے سے پہلے ایک بار گھڑی کا کیس کھول کر دیکھ لینا ورنہ پھر دھوکا کھا جاؤ گے۔"

--

ایک رات، ایک دن

"پہاڑوں کی وہ اندھیری راتیں تھیں، یاد ہیں نا؟"

میں دھیرے سے بولا۔

اُس نے میرا سوال سن لیا اور ایک لمبی سی سانس لی۔ پھر اپنا منھ تکیئے میں چھپالیا۔
جاڑے کی وہ برفیلی راتیں، گھر کی بڑی سی انگنائی کا اندھیرا اور انگنائی کے اُس پار اسکا
کمرہ اور اس کمرے کی اکیلی روشنی اور میرے خیالات   وہ سوئی ہوئی ہے۔ صندل کی
طرح مہکتا ہوا، لچکتی شاخ سا جوان جسم گرم گرم لحاف میں لپٹا ہوا۔ کاش میں اس کے
جسم کے لمس کو محسوس کر سکتا۔

"ریشماں! میں تو کبھی اُن راتوں کو نہیں بھول سکتا۔" میں نے پھر کہا۔

وہ چپ رہی اور میرے پائتانے پڑی ہوئی چادر میرے اوپر ڈال دی۔ کچھ دیر تک
ہم دونوں چپ رہے لیکن اُس کا دماغ کام کر رہا تھا۔ گذرے دنوں میں بھٹک رہا تھا۔
آخر کو وہ بولی۔

"تم کو کیا ہو جاتا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"تم کو ڈر نہیں لگتا۔" وہ بولی اور پھر آپ ہی آپ سوچ کر اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانے لگی "جب تم اس سوئی ہوئی رات کے سناٹے میں اس سردی میں ننگے پاؤں ساری انگنائی پار کر کے میرے کمرے کے دروازے سے لگ کر کھڑے ہو کر مجھے دیکھتے رہتے تو مجھے ایسا لگتا کہ جیسے میرے سینہ میں کوئی دھان کوٹ رہا ہو۔"

"تم کو تو بس ایک ہی سبق یاد تھا؟" میں جل کر بولا۔

"کیا؟ وہ ہنسی

"کوئی دیکھ نہ لے"

"اور کیا۔" وہ شرارت سے بولی۔ "تمھیں کوئی کچھ نہ کہتا۔ سب میرا ہی نام رکھتے۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے اپنی انگلیاں میرے بالوں میں الجھا دیں۔ میری آنکھوں کے سامنے ماضی کا پھیلا ہوا آسمان تھا جن پر ابر کے کچھ ٹکڑے تھے جو بھٹکا کئے تھے۔ ایسے ٹکڑے جو میری تپتی اور جھلستی ہوئی زندگی پر دھیرے دھیرے برسے تھے اور جنھوں نے میری زندگی کے آنگن میں جل تھل کر دیا تھا۔

انھیں بھٹکتے ہوئے خیالات میں میں نے اپنے ہونٹ اس کی گردن پر رکھ دیئے۔ میں جانتا تھا کہ میری اس حرکت پر وہ لاکھ ضبط کے باوجود اپنی ہنسی نہ روک پائے گی۔ وہ ہنسی اور بے تحاشا ہنسی اور بڑی مشکل سے اپنی سانسوں پر قابو پا کر کہہ سکی۔

"میری جان کی قسم یہ نہ کیجئے۔ مجھ سے گدگدی برداشت نہیں ہوتی۔" ماضی کے آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا آیا اور گزر گیا۔ اس کی گردن نہ معلوم کیوں اس معاملہ میں

بڑی چھچھوری تھی۔ وہ کبھی میرے ہونٹوں کے بوجھ کو برداشت نہیں کر پائی۔ اور میرے ہونٹ تھے کہ اس نازک سی گردن کی شفاف سی جلد پر سینہ اور گردن کے ٹھیک جوڑ پر رکھے ہوئے کالے سے تل کو دیکھ کر تلملا اٹھتے۔

میں نے گرفت ڈھیلی کر دی اور سفید چادر کو پیر سے لے کر سر تک، اوڑھ لیا اور اپنی دونوں ہتھیلیاں سینہ پر رکھ لیں اور دونوں پیر ملا کر بالکل سیدھے تان لیے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے پلنگ پر مردہ پڑا ہو۔ وہ کچھ دیر دیکھتی رہی۔ پھر اس نے یکبارگی چادر کو میرے اوپر سے نوچ کر پھینک دیا ــــــ اور جھنجھلا کر بولی۔ "پچاس بار منع کر چکی ہوں، ایسے چادر مت اوڑھا کیجیے۔"

"کیوں؟" میں جان کر انجان بن کر بولا۔

"مجھے وہم آتا ہے۔" وہ کھسیانی سی ہو گئی۔

"ہونہہ!" میں قدرے تھیٹر کے انداز میں بولا۔ "ہزار آفریں ہے ایسے مرنے پر جب کی لاش پر تم جیسا خوبصورت رونے والا موجود ہو۔" اور میں نے دیکھا سچ مچ اسکی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے اسکی گود میں اپنا سر رکھ دیا۔ میں جانتا تھا کہ اُسے دکھ ہوگا۔ اب میرے سامنے ایک ہی ذریعہ تھا میرے ہونٹ اور اس کی گردن ــــــ اور بہر حال کامیابی مجھے ہی ہوئی۔ میرے ہونٹ رینگے نہیں کہ اُسے ہنسی آ گئی۔ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"یشماں! آرزو تو میری یہی تھی کہ میں تمھارے سامنے مروں۔"

اُس نے جلدی سے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولی۔ "خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کرو۔"

ہم دونوں پھر تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئے کہ بھورے بادل کا ایک ٹکڑا
میرے سامنے آ گیا۔

میں نے اس سے پوچھا۔

"تمھیں وہ چاندرات یاد ہے؟"

"یاد ہے۔" وہ دھیرے سے بولی۔

میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر گھوم گیا اور میں ہنس کر بولا "تم تو ہائے اللہ کر کے اچھل پڑی تھیں جیسے پیروں کے نیچے سانپ آ گیا ہو۔"

"شریر کہیں کے۔" اس نے دھیرے سے مسکرا کر میری ناک کو چٹکی سے دبا دیا۔
وہ میرے نتھنوں کو اپنی چٹکی میں دبائے تھی۔ میں نے بھی منھ کھول کر سانس نہیں لی۔
اور دم سادھے پڑا رہا۔ اسے اس کا احساس ہو گیا۔ وہ دلچسپی سے میرے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ دھیرے دھیرے میرا دم پھولنے لگا۔ چہرہ لال ہو گیا اور آنکھوں میں پانی سا آ گیا۔ اس نے گھبرا کر میری ناک چھوڑ دی۔ میں ہنس دیا تو وہ بھی ہنس کر بولی۔

"ابھی تک شرارتیں نہیں گئیں۔"

ہم دونوں پھر خاموش ہو گئے۔ رات بھیگتی جا رہی تھی۔ اور اب جملوں کے ہاتھ پیر سیدھے نہیں پڑ رہے تھے۔

"فرض کرو۔" میں نے پھر شروع کیا۔ "جو ہم نے سوچا تھا اگر اس کا الٹا ہوتا تو سوچو آج کیا ہوتا؟"

"میں پاگل ہو جاتی۔"

"جھوٹ۔"

"سچ میں ایک سیکنڈ بھی تمہارے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔"

"اور میں؟"

"تم تو رہ سکتے تھے۔" وہ مسکرائی۔ مسکراتے ہوئے ہونٹوں کے کونوں سے صاف شرارت جھانک رہی تھی۔

"سچ کہہ رہی ہو؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"نہیں۔" اور یہ کہہ کر اس نے مجھے اپنی باہوں میں لے لیا۔

اُس نے دھیرے سے کہا،

"تم نے کیا دیکھ لیا تھا آخر؟"

"خدا جانے۔۔۔ میں سنجیدہ ہو گیا" لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ میں نے تمھاری جُدائی کا ایک ۔۔۔ ایک لمحہ ایسی اذیت کے ساتھ کاٹا ہے، جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ کبھی کبھی سوچتا تھا تم کو کھو کر کیا رہ جائے گا مجھ میں۔"

ہلوں۔" وہ شرارت سے بولی۔

"ہوں۔" میں نے بھی اُسی طرح جواب دیا۔

اور پھر مجھے یاد آ گیا کہ میں تھکا ہوا ہوں۔ رات کا وقت ہے۔ ریشماں میرے بستر پر میرے پہلو میں لیٹی ہے۔ میں نے اسکو اپنی طرف کھینچ لیا، اور پھر باتیں بہت دور چلی گئیں۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ خاموشی جو وہ سب کچھ کہنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے، جسے الفاظ ادا نہیں کر سکتے ۔۔۔ اور پھر ہم سو چکے تھے۔

یکبارگی مجھے ایسا لگا جیسے میرے کان کے اندر تیز قسم کی نفیری بج رہی ہو ۔۔۔ اور میری آنکھ کھل گئی۔ پپو نے مجھے پر پیشاب کر دیا تھا۔ اس کے پیشاب میں بدبوؤں کے

پیشاب کی سی کھراہند تھی۔ ریشماں مجھ سے کئی بار ڈاکٹر سے ملنے کے لئے کہہ چکی تھی۔ پپّو حلق پھاڑ پھاڑ کر رو رہا تھا۔ میں نے انتہائی کڑواہٹ کے ساتھ چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھا۔ دیواروں پر دھوپ اُتر آئی تھی۔ اچھّا خاصہ دن نکل آیا تھا۔ میں نے پپّو کی طرف دیکھا۔ وہ ہوا میں پیر اُچھال اُچھال کر چیخ رہا تھا۔

"ارے بھئی، کہاں چلی گئیں۔ کیا سُنائی نہیں دے رہا ہے۔" میں کچھ جاگتے اور کچھ سوتے ہوئے بولا۔

"آتی ہوں۔" ریشماں کے باورچی خانے کی آواز آئی۔ میں نے تکئے پر سر رکھ کر پھر آنکھیں بند کر لیں۔ پپّو کی چیخوں کی آوازیں میرے دماغ کے اندر تک اُترتی چلی جا رہی تھیں۔

"ہے تو اتنی سی جان، مگر حلق کس طرح پھاڑتا ہے۔" میں نے پلٹ کر اُسے خاموش کرانے کے اُلٹے سیدھے جتن کیے۔ مگر اس کی رفتار تیز ہو گئی ______

"اری، سنتی کیوں نہیں ہو تم؟" میں نے پھر جھنجھلا کر ریشماں کو آواز دی۔ وہ اپنا کام ادھورا چھوڑ کر چلی آئی۔ "بھئی نیند بھر سونے کو کبھی نہیں ملتا۔ بڑی مشکل ہے۔" میں نے قدرے تیوریاں چڑھا کر کہا، اور پھر کروٹ لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن پھر میں سو نہ سکا۔ پندرہ بیس منٹ بعد ریشماں کی آواز باورچی خانے سے آئی۔

"اب اُٹھیے، ہاتھ مُنہ دھوئیے نا۔ چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

لیکن جب چائے کا گھونٹ لیا تو باوجود اندر سے روکنے کے میرا مُنہ چڑھ کر رہ گیا۔ میں دھیرے سے بولا۔

"چائے بڑی نازک چیز ہے۔ تم اس کو بھی توجہ دے کر نہیں بنا سکتیں۔"

"کیا ہوا؟" وہ قدرے ڈرتے ہوئے بولی۔

"ہوتا کیا؟" ایسا لگتا ہے جیسے گرم پانی میں دھواں گھول لائی ہو۔"

" اکیلی جان ہوں، کیا کیا دیکھوں۔" وہ بولی۔ "پپّو کو سنبھالنے آئی تو لکڑیاں بجھ گئی ہوں گی۔"

" وجہ تو ہر بات کی کوئی نہ کوئی ہوتی ہی ہے۔" میں بگڑ پڑا۔

"آپ تو بیکار کی باتیں کرتے ہیں۔ میں دوسری بنائے دیتی ہوں۔" وہ بھی اُلجھ گئی۔

" مجھے نہیں پینا ہے۔" میں تلخی سے بولا۔

" اونہہ، ہوگا۔" وہ بھڑک کر آگے بڑھی کہ اتنے میں باورچی خانے میں شیشے کی بوتل گرنے کی آواز آئی۔ روزی گھٹنوں گھٹنوں چل کر باورچی خانے میں گھس گیا تھا۔ ریشماں تیزی سے اُدھر جھپٹی۔ پھر اس کے بعد میں نے سُنا۔ شہناز پر بُری طرح سے دو ہتّھڑ پڑ رہے تھے اور وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر رو رہی تھی۔ ریشماں کہہ رہی تھی۔

" یہ کتیا کی بچی دیکھتی رہی اور لڑکے نے سارا تیل پھینک دیا۔"

ریشماں جب اُسے اچھی طرح دھنک چکی تو اسے باورچی خانے کے باہر دھکیل دیا۔ وہ روتی ہوئی میرے پاس آئی اور میرے پہلو سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ میں کرسی پر بیٹھا ہوا دفتر کی فائل دیکھ رہا تھا۔ میرا جی شہناز کی طرف دیکھنے کو نہیں چاہ رہا تھا لیکن میں نے فائل پر سے نظر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر اُسے اپنی طرف کھینچ لیا میری نظر اس کی فراک کی طرف پڑی جو میلی تھی اور کئی جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ اس کے پیر ننگے تھے۔

" تیری چپلیں کہاں ہیں؟" میں نے اُس سے سوال کیا۔

وہ کچھ دیر دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں ملتی رہی پھر دھیرے سے سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔

"بچپلیں نہیں ہیں۔"

میں ذرا تیز آواز میں ریشماں سے مخاطب ہوا۔

"میں کہتا ہوں آخر تم کیا کیا کرتی ہو۔ بچوں کا منہ ہاتھ تک نہیں دُھلتا۔ سارے دن کیچڑ میں لت پت رہتی ہے یہ۔ صورت دیکھو چڑیلوں کی سی حالت ہو رہی ہے۔"

"دن میں کئی پھیرے ہاتھ منہ دھلاتی ہوں، اور کیسے دکھوں؟" ریشماں منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ میں نے دیکھا، ریشماں کا پیجامہ میل سے چیکٹ ہو رہا تھا۔ میری جان جل کر رہ گئی، میں تنک کر بولا۔

"ذرا اپنی حالت تو دیکھو، تم بھی کسی فقیرنی سے کم تھوڑی ہو۔"

"ایک جوڑے سے دوسرا جوڑا نصیب نہیں۔" وہ تڑپ کر بولی۔ "بڑی شرم آتی ہے تو بنوا دو۔" پھر وہ تیوریاں چڑھا کر باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

"ابھی بازار کا ہوش نہیں ہے۔ دفتر کا وقت آجائے گا تو مجھ پر مت چیخنا۔"

"بڑا اچھا ناشتہ کرایا ہے۔ کھانا بھی ایسا ہی کھلا دینا۔" میں نے جل کر کہا۔

"مجبوری ہے۔" وہ بے رخی سے بولی۔

"مجبوری ہے تو کھانا بھی نہیں کھاؤں گا۔"

"نہ کھائیے خوشامد تھوڑی کروں گی۔"

"تم خوشامد کیوں کرنے لگیں۔ میں ہاتھ جوڑوں گا تمھارے۔ تمھارا غلام جو ٹھہرا۔"

وہ کچھ نہیں بولی۔ مجھے شدید غصہ آگیا تھا۔ میں نے پیٹی کھولی اور اس میں سے دُھلی ہوئی قمیص نکالی اور اس کے بٹن دیکھنے لگا۔ ایک بٹن ٹوٹا ہوا تھا، میں نے طاق پر سے سوئی دھاگہ اٹھایا اور بٹن تلاش کر کے ٹانکنے بیٹھ گیا۔ ریشماں یہ دیکھ کر

بڑھی اور بولی۔

"لائیے میں ٹانک دوں۔"

"جاؤ مجھے پریشان مت کرو۔" میں نے اُسے ڈانٹ دیا۔ وہ اُٹھ کر باہر چلی گئی اور پھر اپنے آپ کو چولہے میں جھونک دیا۔ یکبارگی پپّو پھر رو دیا۔ ریشماں پھکنی ہاتھ میں لئے چولہے پر جھکی گیلی لکڑیوں پر اپنی دھونکنی آزما رہی تھی کہ پپو کی آواز سن کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور پپو کو گود میں لے کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک بڑا سا منھ بنا کر اپنے جمپر کا کونا اوپر کی طرف اُٹھایا۔ پپّو نے لپک کر سینہ پر منہ مارا اور خاموش ہو گیا۔ میں نے سرسری نگاہ سے ریشماں کی طرف دیکھا۔ اس کے ماتھے پر شاید کوئلے کی کالک لگی ہوئی تھی۔ میں بٹن ٹانک کر اٹھا اور جوتے کے لیے پالش کی ڈبیہ کھول کر جو دیکھی، تو اس میں خاک اُڑ رہی تھی۔ مجھے اور غصہ آگیا۔ میں نہانے چلا گیا اور ریشماں پھر باورچی خانے میں گھس گئی۔ ساڑھے نو بجے جب میں دفتر کے لئے تیار ہونے لگا تو ریشماں نے کھانے کی سینی لاکر رکھ دی۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا تک نہیں اور کپڑے پہننے لگا۔

"پہلے کھانا کھا لیجئے۔" ریشماں بولی۔

میں نے کچھ جواب نہیں دیا۔

"آیئے نا۔" وہ کھانے کے قریب ہی شہنا کو لے کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"میں نہیں کھاؤں گا۔" میں نے اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا۔

"آپ کو میری قسم۔ میرا مردہ دیکھئے جو نہ کھائیے۔"

"مُردہ ہی دیکھنے کو مل جائے تو پھر یہ سارے جھگڑے ہی کیوں ہوں نا؟" میں نے انتہائی تلخی کے ساتھ کہہ دیا اور ساتھ ہی تیزی کے ساتھ گھر سے نکل گیا۔

——— دفتر نے اپنی آغوش میں مجھے کچھ اس طرح لیا کہ میں سب کچھ بھول گیا۔ یہ کہ ریشماں نے کھانا نہیں کھایا ہوگا۔ اس نے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ ایسی حالت میں اسنے پپّو کو دودھ بھی پلایا ہوگا۔ یہ خیال مجھے اس وقت بھی نہیں آیا جب میں کنٹین سے چائے اور منگوڑے منگوا کر کھا رہا تھا یا جب میں نے اپنے ساتھ کے کلرک کے ناشتہ دان کے پراٹھوں میں حصّہ لیا تھا۔

دفتر سے میں سیدھا گھر نہیں گیا، کیونکہ جب میں گھر پہنچا تھا تو بچے سو چکے تھے۔ ریشماں کھانا لئے میرا انتظار کر رہی تھی۔ اُجلا اُجلا سا چہرہ، بالوں میں تیل پڑا ہوا، ہونٹوں پر ہلکی سی لپ اسٹک لگی ہوئی۔ بدن پر صاف ستھرے کپڑے۔ آج خیال آیا ہے کہ میرے طبقے کی عورت بھی بازار کی عورت کی طرح چراغوں میں روشنی ہونے کے بعد ہی اپنے کو سنوارتی ہے۔

مَیں چپ چاپ کپڑے اتار کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ ریشماں اپنے پلنگ پہ بیٹھی تھی۔ میں نے اس کی طرف اپنی پیٹھ کر رکھی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میرے کانوں نے سُنا وہ چپکے چپکے رو رہی تھی۔ میں خاموش لیٹا رہا۔ رات پھر چپ تھی۔ پھر میں نے محسوس کیا میرے پلنگ کے پیچھے ایک بوجھ سا لٹک گیا۔ اور رونے کی آواز اور زیادہ قریب ہوگئی۔ کچھ وقت اور گذر گیا کہ ریشماں نے روتے روتے یکبارگی اپنا سر میرے بازوؤں پر رکھ دیا۔ میں پھر بھی چُپ رہا۔ لیکن اب میں زیادہ چپ نہیں رہ سکا۔ میں نے دھیرے دھیرے اپنا ہاتھ اس کے سر کی طرف بڑھایا اور اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگا۔

"اچھا، اب روؤ نہیں"۔ یہ جملہ میرا تھا۔ وہ چُپ رہی لیکن دھیرے دھیرے روتی رہی۔

"کھانا کھایا تم نے؟" یہ سوال بھی میں نے کیا۔

"ہاں۔" دھیرے سے جواب ملا۔

"جھوٹ۔" میں اُچھل کر اُٹھ بیٹھا۔

"کھاؤ میری جان کی قسم۔" وہ جواب میں چُپ رہی۔ میں نے اُس کو اپنی باہوں میں لے لیا۔ "اگر تم اس وقت نہیں کھاؤ گی تو میں بھی بھوکا سو رہوں گا۔" شاید میں اتنا بھوکا نہیں تھا۔ لیکن میں نے صفائی سے جھوٹ بول دیا۔ پھر بھی وہ روتی رہی۔ "تم کو میری قسم ہے جو کھانا نہ کھاؤ۔" یہ کہہ کر میں اُٹھا جو لہے پر سے کچھ گرم ہی پر رکھا تھا۔ میں نے کھانا نکالا اور دستر خوان بچھا کر اس کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ پکڑ کر اسے اُٹھایا۔ وہ اپنی ناک کی نوک کو جو روتے روتے سُرخ ہو گئی تھی، دوپٹے سے پونچھتے ہوئے اُٹھی اور بڑی مشکل سے دو چار لقمے کھا کر پلنگ پر پڑ رہی۔

رات خاموش تھی۔ دن بھر کی محنت اور تھکن نے میرے جسم کی ساری نسوں کو تان سا دیا تھا اور اب اُنھیں سکون کی ضرورت تھی۔ ریشماں کے برابر میرا پلنگ تھا لیکن میں اپنے پلنگ پر نہیں لیٹا۔ وہ اپنے پلنگ پر پٹی کی طرف بیٹھ کیے لیٹی تھی۔ پلنگ کی پٹی اور اس کی بیٹھ کے درمیان کسی اور جسم کی گنجائش نہ تھی کیونکہ اس کے ساتھ اس کے تینوں بچے لیٹے ہوئے تھے، مگر میں نے اپنے کو اس جگہ میں ٹھونس دیا اور اس کے گلے میں باہیں ڈال کر لیٹ گیا۔ وہ خاموش لیٹی تھی، میں بھی خاموش تھا۔

ابھی تھوڑے دنوں کی بات ہے، شاید صرف سات سال ہوئے، ریشماں ایک اجلی سی اور شگفتہ سی لڑکی تھی۔ جو میرے گھر پہلی بار برسات کی ایک رم جھم میں صرف چند دنوں کے لئے مہمان آئی تھی، اور جیسے میں نے اپنے کمرے کے دروازے کی دراز سے

چوروں کی طرح دیکھا تھا۔ وہ گھر کی بڑی سی گیلی انگنائی میں اپنے دودھیا غرارے کے دونوں
پائینچوں کو اپنی نازک نازک چٹکیوں سے ٹخنوں تک اٹھا کر چل رہی تھی، اس کے گورے
گورے پیروں میں نازک سی چپل تھی۔ کاندھوں پہ جھولتے ہوئے گھنیرے بالوں کے گچھے
بادلوں کی طرح مست اور خوابوں کی طرح بکھرے ہوئے۔ دو سال تک میں اس کے پیار
میں دیوانہ رہا تھا۔ اس موہنی سی صورت نے میرے دامن میں وصل کا نشاط بھی ڈالا اور
ہجر کا درد بھی۔ گرلز کالج کی طرف، ایک جھلک دیکھ لینے کے وہ بیقراری، اس
سے روٹھ جانے پر خودداریوں کے وہ جھوٹے ڈھکوسلے اور پھر کن ارمانوں سے میں اُسے
بیاہ کر لایا تھا۔ یکبارگی میرے خیالات منتشر ہو گئے۔ میرے کانوں میں سسکیوں کی
ہلکی ہلکی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے دیکھا ریشماں تکیے میں مُنھ دیئے رو رہی تھی۔
میں نے جلدی سے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

"ریشماں، مجھے اتنی سخت سزا نہ دو۔" میں نے چپکے سے کہا اور چپ ہو گیا۔ میرا
دماغ پھر پچھلے دنوں میں ڈوب گیا۔ ریشماں اسی طرح میری طرف پیٹھ کیے لیٹی تھی اور شاید
اس کا ہیجان کچھ کم ہو گیا تھا کہ میں نے اس کے کان میں کہا۔

"ریشماں! تم کو میں اس رات کا واسطہ دے کر کہتا ہوں جب پہلی بار میرے
ہونٹوں نے تمہارے ہونٹوں کے ساتھ گستاخی کی تھی، کہ اب مجھے معاف کر دو۔۔۔۔"

ریشماں کچھ نہیں بولی۔

"تم کو یاد ہے ریشماں جب پہلی بار میرے ہونٹوں نے تمہیں چوما تھا۔" میں نے
پھر سوال کیا لیکن وہ خاموش رہی۔

"بالکل پہلی بار۔۔۔۔ تمہاری نظریں جھک گئی تھیں اور تمہارا سارا جسم پانی کے

پتّوں کی مانند کپکپا رہا تھا۔" میں کہتا رہا " اور ریشماں میں ڈر گیا تھا، تب ہی تو میں نے نئے بلیڈ سے تمھاری نظروں کے سامنے اپنے نچلے ہونٹ پر ہلکا سا شگاف بنا دیا تھا اور تم سے کہا تھا، دیکھو ریشماں! اب تو اس گستاخ کو اپنے کیے کی سزا مل گئی۔ اب تو مجھے معاف کر دو اور تم سے کچھ بن نہ پڑا تھا۔ تم نے میرے ہونٹ سے رستے ہوئے خون کو دیکھ کر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا۔ میں جانتا تھا میری اس حرکت پر تم تڑپ کر رہ گئی تھیں۔ بولو، یاد ہے نہ وہ دن ــــــ"

لیکن ریشماں خاموش رہی۔ میں نے اس کے بالوں سے کھیلتے ہوئے پھر کہنا شروع کیا۔

" اور وہ خط ــــ وہ خط تمھیں یاد ہے نا ــــ جو تم نے ایک چھوٹے پرزے پر لکھ کر بھیجا تھا۔ تم نے لکھا تھا، آپ جسے سب سے زیادہ چاہتے ہیں اس کی قسم، آج کالج نہ جائیے گا۔" ریشماں کچھ نہیں بولی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں نے پھر کہا " اور وہ صبح ریشماں، جب تم نے کہا تھا میرے ساتھ ایک لڑکی پڑھتی ہے وہ بڑی پیاری ہے، آپ اسی سے شادی کیجیے گا، تو میں نے کہا تھا۔

" میں تو ایک لڑکی کو پسند کر چکا ہوں۔"

" کون ہے وہ، مجھے بھی دکھایئے۔" تم انجان بن گئی تھیں۔

" یہ ہے وہ۔" میں نے تمھارے چہرے کے سامنے آئینہ کر کے کہا تھا۔

" ٹھینگا۔" یہ کہہ کر تم نے منہ چڑھایا تھا اور میرے کمرے سے بھاگ گئی تھیں، بولو یاد ہے نا؟"

ریشماں پھر بھی کچھ نہ بولی تو میں نے جھانک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا شاید

وہ بہت دیر پہلے سو گئی تھی۔ تھکا تھکا سا چہرہ جو کبھی دُھلے ہوئے کمل کی طرح اُجلا تھا، مُرجھائے ہوئے بیلے کی طرح زرد ہو گیا تھا۔ آخر کار میں پلنگ سے اُٹھنے ہی والا تھا کہ ریشماں نے یک بارگی کروٹ لی اور آہستہ سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ایک بات پوچھوں۔" وہ آنکھیں کھول کر بولی۔

"ارے۔" میں نے حیرت ظاہر کی۔ "میں سمجھا تم سو گئیں۔"

"نہیں۔" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں سب سُن رہی تھی۔" اور یہ کہہ کر اس نے اپنا منہ میرے زانوؤں میں چھپا لیا اور دھیرے سے بولی "میں تم سے صرف ایک سوال کرنا چاہتی ہوں۔ بس اتنا بتا دو کہ یہ ساری یادیں، محبت کے زمانے کے یہ سارے قصے تمھیں صرف رات ہی کو یاد آتے ہیں صرف رات کو، جب تم دفتر سے تھکے ہارے آتے ہو، جب تم میرے پہلو میں آ کر لیٹتے ہو۔"

ایسا نہیں ہے ریشماں۔"

"نہیں۔" اُس نے میری بات کاٹ دی۔ "دن کی روشنی میں تمھیں اس میں سے کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ اس میں سے کسی بات کا تم ذکر نہیں کرتے۔" اور یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں خاموش تھا، رات بھی خاموش تھی۔ میرے تینوں بچے آڑے ترچھے پلنگ پر پڑے تھے کہ ریشماں پھر بولی۔

"صرف پانچ سال ہوئے ہماری شادی کو، لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے ان پانچ سالوں کی راتیں ہی راتیں مجھے ملی ہیں، اور دن میرے حصّے میں نہیں آئے۔ کیونکہ دن کی روشنی میں تم مجھے بھوکا چھوڑ کر دفتر چلے جاتے ہو۔" یہ کہہ کر وہ سسکیاں لینے لگی۔

میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کہوں کہ اس کی آواز آئی۔

"ان پانچ برسوں نے تو مجھ سے میرے دن چھین لیے ہیں لیکن اگلے پانچ برسوں میں جانتے ہو کیا ہو گا؟"

"کچھ نہیں ہو گا۔" میں نے اسے اپنی طرف کھینچا، لیکن وہ مجھے جھٹک کر بولی۔

"اگلے برسوں میں یہ راتیں بھی مجھ سے چھن جائیں گی۔ محبت کے زمانے کی یہ ساری یادیں کیا اگلے برسوں میں بھی تمہیں یاد رہیں گی۔" وہ بڑی بے رحمی سے رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ "سوچو تو کہ تم کو مجھ سے کیا مل سکا ہے۔ یہی تین بچے نا؟ اور یادوں کے کچھ پھول، جو صرف رات کو تھوڑی دیر کے لیے کھلتے ہیں اور دن کو شاخ سے ٹوٹ کر گر جاتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی اور میں اسی طرح گم سُم بیٹھا رہا۔ خدا جانے کتنا وقت یوں ہی گذر گیا۔ ریشماں کا سر میرے زانوؤں پر تھا اور آنسو بہاتے نہ جانے کس وقت اسے نیند آ گئی تھی۔ آخر کار میں نے آہستہ سے اس کا سر اٹھا کر اس کے تکیے پر رکھا اور نڈھال ہو کر اپنے بستر پر آ کر لیٹ رہا۔

رات کے آخری حصے میں نہ جانے کیا بجا ہو گا کہ مجھے اپنے چہرے پر گرم گرم سانسیں سی بکھرتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا، ریشماں میرے پہلو میں لیٹی میرے چہرے پر جھکی ہوئی تھی۔ میں نے نیند اور بیداری کی ملی جلی کیفیت میں اسے اپنی باہوں میں لے لیا۔ وہ میرے کانوں میں دھیرے سے بولی۔

"بڑے ظالم ہو، چپکے سے آ کر لیٹ گئے۔ مجھے بھی اپنی گود میں لے آتے۔"

"تم نے مجھے معاف کر دیا نا؟" میں نے کہا۔

"اب اُسے بھول جاؤ۔" وہ چپکے سے بولی۔ "اب کوئی اور بات کرو۔"

میں چُپ ہو گیا۔ سوچتا رہا کیا بات کروں۔ کوئی ایسی بات جو ہمارے درمیان

مشترک ہو۔ لیکن ایسی کون سی بات تھی۔

"کرونا کوئی بات۔" وہ پھر بولی۔

اور ایک بار پھر میں نے اپنے دماغ پر زور دیا، لیکن مجھے کچھ نہیں ملا ——

"ہاں یاد آیا۔" میں چونک کر بولا۔ "پپو کے پیشاب میں بڑی بھراہند ہے۔"

"یہ بات نہیں، کوئی اور بات۔" وہ مسکرائی اور پھر ہم دونوں خاموش ہوگئے

—— اور رات گزر گئی۔

میں اُس رات بھی ریشماں کو کچھ نہ دے سکا۔ لیکن میرا خیال ہے، شاید وہ وہی رات تھی، جب ریشماں کے شکم میں میرے چوتھے بچے کی داغ بیل پڑی تھی۔

دوبارہ جب میری آنکھ کھلی، تو پپو نے گنجے پر پیشاب کر دیا تھا، اور سورج کی کرن نے دیوار پر ایک اور دن کی مہر ثبت کر دی تھی۔

بے سہارا

"کیوں رے؟ ماتھے پر چڑیا کا جھونجھ پھر رکھ لیا تو نے؟"

بڑی بہن کا اتنا کہنا تھا کہ وہ اس پر شکرے کی طرح جھپٹ پڑا۔ اور اس کے بازو پر دانت گڑو کر اسے بھنبھوڑ ہی تو ڈالا۔ وہ ہائے کر کے رہ گئی۔ لیکن اس نے پلٹ کر یہ بھی نہیں دیکھا کہ اس کے شکار کا زخم کتنا گہرا تھا۔ لپک کر دروازے پر پڑا پردہ اٹھا کر دیکھتے ہی دیکھتے یہ جا وہ جا ——— ماں ہاتھ میں پھکنی لئے جب تک دروازے پر لپکتی بہت دیر ہو چکی تھی۔ جس کوٹھری میں چڑیا کا جھونجھ ماتھے پر رکھ کر آیا تھا اس کی دیوار پر ایک بوسیدہ سی کارنس تھی جس پر مدار کے پھولوں والا ایک چھوٹا سا آئینہ رکھا تھا۔ ایک شیشی میں تلّی کا تیل اور آئینہ کے بغل میں ایک کنگھا پڑا ہوا تھا ——— سلمہ جب روتی بسورتی اپنی بانہہ پکڑے کوٹھری میں داخل ہوئی تو کنگھا دیکھ کر اس نے سر پیٹ لیا۔ تیل کی شیشی کا ڈھکنا ایک طرف لڑھکا پڑا تھا اور کنگھے کی دراروں میں پانی اور تیل کے ساتھ سر کا تیل کیچڑ بن کر لتھڑا ہوا تھا ——— سلمہ نے کنگھا اٹھایا اور چٹ سے دو ٹکڑے کر کے انگنائی میں اچھال دیا۔ ماں نے آ کر دیکھا

نہ تاؤ، لڑکی کی پیٹھ پر ایک دو ہتھڑ جما دیا اور کٹکٹا کر بولی۔

"مالزادی! میرے پاس رد کوڑ نہیں رکھی ہے۔ یہ ٹھسکے اپنے خصم کے گھر میں دکھانا۔"

پھر وہ بڑبڑانے لگی۔ "واہ۔ یہ ایسی رانی صاحبہ ہیں کہ ان کے لئے روز کنگھیاں ہی آیا کریں۔"

"تو میرے کنگھے سے کنگھی کیوں کرتا ہے۔ ہزار بار منع کر چکی ہوں۔" سلمہ منہ ہی منہ میں بُدبُدا کر ایک کونے میں بیٹھ کر رونے لگی۔

یہ آنسو جو آئے دن سلمہ کی آنکھوں سے بہتے ان کا سبب عام طور پر وہی تھا۔ دن بھر وہ اس کی جان جلایا کرتا تھا۔ رات کو بھی اکثر دونوں میں جھوٹم جھاٹم ہوا کرتی۔ کبھی قلم دوات پر لڑائی ہو رہی ہے، کبھی پلنگ پر لیٹنے کے معاملے میں لڑائی ہوتی ــــ وہ کہتا:

"میرے پیر پٹی کے باہر نکلے رہتے ہیں۔ میں اتنے سے کھٹولے پر نہیں لیٹوں گا۔"

"نہ لیٹ، کون سی کمائی کر کے آیا ہے۔" وہ جل کر کہتی۔ اور تھپیڑ مار کر پلنگ پر لیٹ جاتی۔

وہ تنتنا کر اس کی چٹیا پکڑ کر پلنگ سے نیچے گھسیٹ لیتا اور پھر ماں کے کوسنے ہوتے اور مسٹنڈی پیٹے پر چیلوں کی پھٹا پھٹ۔

ماتھے پر چڑیا کا جھوبجھ نکال کر وہ سویرے کا گیا دوپہر کو ایک بجے گھر میں گھسا پتلون کی دونوں مہریاں ٹخنوں تک چڑھی ہوئی قمیص کی آستین بازو کی مچھلیوں تک الٹی ہوئی۔ کمر پر صرف ایک انگل چوڑی نازک سی پیٹی، ہوائی چپل سٹر سٹر کرتا ہوا سیدھا باورچی خانے میں گھس گیا۔ تھوڑی دیر برتن کھڑکھڑانے کی آواز آتی رہی۔ ماں نے لوٹا اٹھا کر پاخانے جاتے ہوئے کنکھیوں سے اسکی طرف دیکھا۔ وہ گردن جھکائے روٹی کے بڑے بڑے

نوالے جلدی جلدی حلق سے اتار رہا تھا۔ دو ہی منٹ میں روٹیوں کی ڈلیا صاف ہو گئی۔
ماں پاخانے سے نکلی تو وہ بولا۔
"اماں، اب روٹی نہیں ہے کیا؟"
"نہیں۔" وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ ماں برآمدے میں آکر پلنگ پر لیٹ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ اس کی باڑھ کا زمانہ تھا۔ اس عمر میں آٹھ روٹیاں بھی کھائے تو کم ہے۔ تین روٹیوں میں کیا ہوا ہوگا۔ اس نے کروٹ بدل کر ایک لمبی سانس لی۔ وہ باورچی خانے سے نکل کر نل پر گیا۔ چلو میں منھ لگا کر غٹا غٹ پانی پینے لگا۔ پانی پی کر وہ دھیرے دھیرے بہن کے پاس پہنچا۔ جیسے جیسے وہ بہن کے قریب ہوتا گیا، بہن کے کان کھڑے ہوتے گئے۔ آخر وہ تیوریوں پر بل ڈال کر بولی۔
"آگئے نواب صاحب!"
وہ شاید نیکی کے موڈ میں تھا۔ چپ کھڑا ایک لمحہ بہن کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ بولا۔
"بجّو! ہمارے ٹکٹ کے دام دو تو ایک پکچر کے دو پاس بنوا لائیں۔"
"ہمیں نہیں پکچر وکچر دیکھنا ہے۔"
"بہت بڑھیا تماشا ہے۔" وہ لالچ دلاتا ہوا بولا اور جیب سے فلمی گانوں کی ایک کتاب نکال کر اور اس میں سے دیکھ دیکھ کر ایک گیت گانے لگا۔ گاتے گاتے وہ وہ کوٹھری میں جا کر تخت پر لیٹ گیا۔ بہن پہلے ہی غصّے میں بھری بیٹھی تھی۔ بپھر اٹھی۔
"پہلے میرے کنگھے کے دام دے پھر گیت گانا۔"
"کیسے دام؟" وہ ٹھٹکا۔
"میں نے کنگھا توڑ کر پھینک دیا۔"

"آئیں اماں؟ بچوں نے کنگھا توڑ ڈالا؟" اس نے ماں سے تصدیق چاہی۔ ماں جھکی پڑی رہی تو وہ کبھی گویا بات کو ٹھلاتے ہوئے اپنی پتلون کی جیب میں کچھ ڈھونڈھنے لگا۔ اس کی جیب میں کسی فلم کا پوسٹر مڑا ہوا رکھا تھا۔ اس نے پوسٹر کو تخت پر پھیلا دیا اور بڑے چاؤ سے اس کی سلوٹوں کو برابر کرتا رہا۔ ماں کئی بار ان پوسٹروں کو جلا چکی تھی۔ لیکن نہ یہ پوسٹر کم ہوئے اور نہ فلمی گانوں کی کتابیں۔ اکثر دھوبی کو کپڑے دیتے وقت اس کی جیبوں سے فلمی گانوں کی ایک آنے والی کتابیں نکال نکال کر رکھی گئی تھیں۔ کوٹھری کی دیواریں پوسٹروں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ ایک دن بہن نے پلندہ بھر کتابیں اس سے چھین کر ماں کی پیٹی میں رکھ دیں۔ اس وقت بہن نے جب اسے پوسٹروں پر انی کیلیں جڑتے ہوئے دیکھا تو چیخی۔

"آج پھر کسی چڑیل کی تصویر اٹھا لایا؟"

"یہ غزالہ ہے۔" وہ کچھ اس طرح مزہ لے کر بولا جیسے کہہ رہا ہو "یہ رس گلا ہے۔"

"ابھی چولھا دکھاتی ہوں تیری غزالہ کو۔"

"دکھاؤ چولھا۔" وہ آنکھیں نکال کر بولا۔ "میں تمھاری چٹیا کو ماچس لگا دوں گا۔"

"چٹیا کے بچے، ذرا ادھر آ۔" ماں، جو بہت دیر سے ضبط کئے بیٹھی سب کچھ دیکھ رہی تھی، بولی۔ اس نے ماں کی طرف مشکوک نظروں سے دیکھا اور پھر اس کے پلنگ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا ہے؟"

"کیوں صاحب! آج پھر ہاتھ صاف کر دیا۔"

"کیوں؟" اس نے نظریں چراتے ہوئے ماں کی طرف دیکھا۔

"سچ سچ بتادے، نہیں تو اپنی جان اور تیری جان ایک کر دوں گی۔"

"ہم نے کیا کیا؟" اب وہ بالکل سمجھ گیا تھا۔ ماں نے دھاندھلی شروع ہوتے جو دیکھی تو چپل سنبھال لی اور بولی۔ "کمینہ کہیں کا آنکھوں میں گھستا ہے۔ بول چونی نکالی ہے پاندان سے؟"

"ہمیں کیا معلوم؟"

"نہیں بتائے گا؟" ماں پلنگ سے اتر کر کھڑی ہو گئی —"نہیں بتائے گا؟ اور پھر اُسے دُھننا شروع کر دیا۔ اس طرح جیسے اس پر ہسٹریائی دورہ پڑا ہو۔ وہ اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے چھپا کر اکڑوں جھک گیا۔ ماں نے پھر اس کی پیٹھ پر لاتیں مارنا شروع کر دیں۔ وہ غصے کی شدت میں سارے بدن سے کانپ رہی تھی۔ آخر اس کا تھا پائی سے ذرا ہی دیر میں اس کی سانس پھولنے لگی۔ لیکن وہ سویرے سے بھری بیٹھی تھی۔ آٹا منگانے کے لئے پاندان کھول کر اس نے پیسے نکالے تو دیکھا ایک چونی غائب ہے۔ ایک لمحہ کے لئے اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ بہت کانپتی ہوئی آواز میں اس نے لڑکی سے پوچھ تاچھ کی۔ کئی بار حساب لگایا۔ لیکن جب چونی نہیں ملی تو وہ آبدیدہ ہو کر اپنے مقدر کو کوسنے لگی۔ مجبوراً آٹا اس نے کم منگایا۔ جتنا منگایا تھوپ تھاپ کر رکھ دیا۔ لڑکی کو کھلا کر باقی روٹیاں اس کے لئے رکھ دیں۔ بھو کا پیٹ، آنکھیں پھوڑ کر کمائی ہوئی مشقت کی آمدنی کی چوری اور وہ بھی اپنی اولاد کے ہاتھوں! وہ سویرے سے خون کا گھونٹ پئے بیٹھی تھی اور اب جب وہ دن بھر ڈاؤن شہر کی خاک چھان کر گھر میں گھسا تو وہ اسے کھلا پلا کر اس کی چھاتی پر چڑھ کر اس کا خون پی رہی تھی۔

سکینہ کو بیوہ ہوئے بارہ برس ہو چکے تھے۔ باپ اور ماں بچپن میں سدھار گئے تھے۔

لے دے کے ایک بھائی تھا جو پانچ برس ہوئے اللہ کو پیارا ہو گیا۔ بھائی کیا مرا سکینہ کی آس مر گئی۔ بھائی کے جنازے پر پڑی ہوئی گوری چادر سکینہ کے ننھے سے کفنے کے بھرم کی چادر تھی جو قبرستان کی منوں مٹی میں دفن ہو گئی۔ سکینہ کے پاس اور کوئی چارہ تو نہ تھا اپنی آنکھوں کا تیل جلاتی اور ویل کی ساریوں پر سوئی کی نوک سے باغ کھلاتی۔ وقت کا پانچ سال لمبا پہاڑ سکینہ نے اس سوئی کی نوک سے کھود کر برابر کیا تھا۔

جب سکینہ ببو کو مارتے مارتے تھک گئی تو الگ ہٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد سلمہ اٹھی اور ماں کو چائے میں بسکٹ بھگو کر دیئے تو ببو کی سمجھ میں آیا کہ ماں نے آج فاقہ کیا ہے۔

سہ پہر کو چار بجے اس نے چپکے سے بہن سے پوچھا: "آئیں بجو، اماں نے کیا کھانا نہیں کھایا تھا؟"

"تمھاری بلا سے۔ تم نے تو اپنی جیب گرم کر لی۔"

وہ گردن جھکا کر چپ ہو گیا۔ مار کھانے کے بعد ببو پھر گھر سے نہیں نکلا۔ رات جب ماں پلنگ پر لیٹی، تو اس نے اس کی گردن میں باہیں ڈال دیں۔ ماں روٹھی رہی۔ اور وہ مناتا رہا۔ جب وہ کچھ نرم پڑی تو وہ چپکے سے بولا۔

"اماں ــ ایک سینما میں گیٹ کیپری مل رہی ہے، کر لیں؟"

"اور کیا کرو گے۔ گیٹ کیپری ہی تو کرو گے!" بہن نے کتاب پر سے گردن اٹھا کر کہا۔

"تم سے کون پوچھ رہا ہے استانی جی؟ تم اپنا کام کرو۔"

"ٹھیک تو کہتی ہے۔" ماں بولی۔ "اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر اسکول کی فیس اسی لئے دیتی ہوں کہ تو گیٹ کیپری کرے؟"

"تو کیا یہ خراب کام؟" وہ قدرے سہم کر بولا۔

ماں اسے کافی دیر سمجھاتی رہی کہ گیٹ کیپری بہت معمولی نوکری ہے۔ بڑی نوکری ملے تو ایک بات بھی ہے، وغیرہ۔

بتّو کی عمر سولہ سترہ سال کی ہوگی۔ مگر ہاتھ پیر اس نے لمبے چوڑے نکالے تھے اور وہ اپنی عمر سے زیادہ نظر آتا تھا۔ صرف دو سال پہلے ماں نے اس کا نام چھٹی جماعت میں لکھوایا تھا۔ اور اس وقت بھی وہ اپنے کلاس میں سب سے لمبا تھا۔ اِدھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کے ہاتھ پیر سر سے نکل گئے تھے۔ ایک رات ماں نے اسے اپنے پاس بٹھا کر اور سر پر ہاتھ پھیر کر بڑے پیار سے پوچھا۔

"کیوں رے بتّو تجھ کو اپنی ماں کا کچھ خیال نہیں؟"

"کاہے کو۔" وہ ماں کے گلے میں باہیں ڈال کر بولا۔

"تو مجھے کتنے دکھ دیتا ہے۔ جانتا ہے کہ تیری ماں کیسے کیسے غم اُٹھا کر تھوڑے سے پیسے کماتی ہے اتنے ہی پیسوں میں مجھے تیری بجو کو بیاہنا بھی ہے پھر بھی تجھ کو میرے اوپر ترس نہیں آتا۔"

"تو بتاؤ میں کیا کروں؟ تم مجھے نوکری بھی نہیں کرنے دیتی ہو۔"

"مجھے تیرا پیسہ نہیں چاہیئے بیٹا۔ میں تو چاہتی ہوں تو جی لگا کر پڑھ ڈال۔ مگر تو تو دن بھر آوارہ لڑکوں میں گھومتا ہے۔ پیسے چرا کر بائیسکوپ دیکھتا ہے۔ تیرے سر پر تو موئے بائیسکوپ کا بھوت سوار ہے۔ دنیا بھر کے گانوں کی کتابیں جمع کر رکھی ہیں تو نے۔"

"اچھا اب چوری نہیں کروں گا۔" وہ خوشامد کے لہجے میں بولا۔

"تو ہمیشہ یوں ہی کہہ دیتا ہے۔"

"اچھا اب پڑھوں گا بھی۔" اور پھر وہ بہت دیر تک ماں سے لپٹا رہا۔ خاموش۔

اور اس کے ذہن میں مختلف خیال چکر کاٹتے رہے۔ آخر کار وہ یک بارگی ماں سے ایک سوال کر بیٹھا۔ اداس اور ڈوبی ہوئی آواز میں وہ بولا۔ "آئیں اماں، بجّو کی شادی ہو جائیگی تو بجّو چلی جائیں گی؟"

"اور کیا بیٹھی رہیں گی؟"

وہ کچھ سوچتا رہا۔ پھر کہنیوں کے بل کسی قدر اٹھا اور ماں کے چہرے پر نظریں گاڑ کر مسکرا کر بولا۔

"اچھا تم ہم کو زیادہ چاہتی ہو کہ بجّو کو؟"

"بجّو کو!" ماں نے چٹکی لی۔ جواب سن کر اس نے اپنے کو پھر ماں کے پہلو میں گرا دیا۔ اور اپنے سر کی طرف پھیلے ہوئے آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں ستاروں پر پھسل رہی تھیں کہ یکبارگی وہ ماں سے پھر مخاطب ہوا۔

"آئیں اماں جب بجّو کی شادی ہو جائے گی تب تو تم کو پیسے نہیں جمع کرنے ہونگے؟"

"نہیں" ماں نے جواب دیا۔ اور پھر دونوں ماں بیٹے خاموش ہو گئے۔ ماں جلد ہی سو گئی۔ اور وہ بہت دیر تک تارے چھٹکے آسمان کو تکتا رہا۔

جب وہ سویرے اٹھا تو قدرے مضمحل تھا۔ اسکول دو مہینے کے لئے بند تھا۔ دن اور راتیں سب ہی خالی خالی سی تھیں۔ اس روز گھر سے باہر نہیں گیا۔ سارے دن گھر میں پڑا رہا اور سلمہ سے بات بات پر جھگڑے مول لیتا رہا۔ دو تین دن تک اس کے ارد گرد، ایک اداسی سی طاری رہی۔ لیکن چوتھے روز جب وہ گھر سے سویرے سویرے نکلا تو اس کو ایسا لگا جیسے کسی نے سمندر میں ڈھکیل دیا ہو۔ ایک بار پھر حشمت جراح کا اڈہ تھا اور وہی لونڈھار۔ جانی واکر کی نقلیں، فلموں کے گانے، ایکٹروں کی ادائیں،

بمبئی کی داستانیں اور سگرٹوں کے کش۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ خانماں برباد بھبوتی ٹھکی لکڑیاں زمانے کے ساون کی ایک ہی ادم جھم پر بمر بمر کر رہ گئی تھیں۔

دن ڈھلے بو جب گھر میں داخل ہوا تو جانتا تھا کہ ماں نے پاندان کھول کر کیا دیکھا ہوگا۔ جو وہ نکال کر لایا تھا سگرٹوں میں پھونک دیے گئے تھے اور اب اس کی پیٹھ چیلوں اور لاتوں کے تصور سے پھوڑے کی طرح تپکنا شروع ہو گئی تھی۔

وقت کے زخم سے صبحیں اور شامیں دھیرے دھیرے رستی ہیں۔

سکینہ کے آنگن کی بیری پھلوں سے لدی کھڑی تھی۔ اور اُس ننھے سے آنگن کی دیواروں نے اس بیری کو تکتے تکتے کتنی ہی راتیں آنکھوں میں کاٹ دی تھیں۔ سکینہ نے ایک ایک کر کے ہاتھوں، کانوں اور پیروں کے ہلکے ہلکے زیور بنوا لئے تھے۔ جنھیں وہ بڑی حسرت و آرزو کے ساتھ بکس سے نکال کر دیکھتی۔ ایک ایک پیسہ کر کے جمع کئے ہوئے تین سو روپیوں کے نوٹوں کو گنتی اور پھر سوئی دھاگہ لے کر جہیز کے کپڑے سینے بیٹھ جاتی۔ جیسے گھر میں جیسے شادی کے انتظامات بڑھتے گئے۔ اور شادی کی تاریخیں قریب آتی گئیں سلمہ سے بو کا لگاؤ بڑھتا گیا۔ وہ اکثر چپ چاپ اپنی بہن کی طرف دیکھا کرتا۔ اب وہ اس کو ستاتا بھی نہیں تھا عموماً وہ گھر پر ہی رہتا۔ بہت کم کسی سے بات کرتا اور کوٹھری میں پڑے پڑے ایک سرے سے دنیا بھر کی فلموں کے گانے گایا کرتا۔

ایک دن وہ سلمہ کے پاس چپ چاپ آکر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر یوں ہی بیٹھا رہا پھر بولا۔

"بجو جب تم چلی جاؤ گی تو گھر اور اکیلا ہو جائے گا۔!"

"میں جا ہی کہاں رہی ہوں۔" وہ انجان بن کر بولی۔

"اپنے میاں کے یہاں۔" وہ کب چوکنے والا تھا۔ فوراً کہہ اٹھا۔ اور وہ جھینپ کر رہ گئی۔ وہ پھر کچھ خاموش رہا۔ اور ٹکٹکی باندھے بہن کے جھکے ہوئے چہرے کو دیکھتا رہا جو سوئی تاگہ لئے کچھ سی رہی تھی۔ آخر اس نے پھر خاموشی توڑی۔

"بجو تمھارے لئے اماں نے خوب بہت سے کپڑے بنوائے ہیں۔"

"تو کیا کریں؟" وہ بے رخی کے ساتھ بولی۔ پھر وہ بہن کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ اور اس کی چوٹی سے کچھ دیر کھیلتا رہا۔ اور تھوڑی دیر بعد پھر بولا۔

"بجو تم کو معلوم ہے اماں تم کو ہم سے زیادہ چاہتی ہیں؟"

"ہاں معلوم ہے۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"اچھا بجو تم ہم کو زیادہ چاہتی ہو یا اماں کو؟"

"اماں کو!" اس نے بہت صفائی کے ساتھ کہہ دیا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر آہستہ سے کہنے لگا۔

ہم کو سب ہی لوگ کم چاہتے ہیں۔"

"تم ہو ہی پھٹکار زدہ۔" یہ جملہ ہزار مرتبہ سلمہ کے منہ سے سن چکا تھا۔ اور اس جملہ پر وہ اپنی بڑی بہن کی کئی مرتبہ مرمت بھی کر چکا تھا لیکن اس بار اس نے خاموشی سے جملہ سن لیا اور اپنے ہونٹوں کے کونوں سے مسکرا کر رہ گیا۔

شادی کے دو روز پہلے جب سلمہ الگ ایک کوٹھری میں مانجھے بیٹھی تو بودن بھر اس کے پاس گھسا رہا۔ عورتوں نے ڈانٹا ڈپٹا بھی پر وہ نہیں مانا۔ کبھی وہ اپنی بہن کے جسم کو سونگھتا تو کبھی اس کے پیلے پیلے کپڑوں کو ہاتھوں سے چھو کر دیکھتا۔ ایکبار وہ کہہ اٹھا۔

"بجو بہت دنوں سے ہم کو تم پر بہت پیار آ رہا ہے۔" اور وہ بھائی کے اس جملے پر

نہ جانے کیوں آبدیدہ ہو گئی۔ شاید اپنے جنگلی بھائی کے اس جملے کے پیچھے اس نے زندگی میں پہلی بار اپنے بابل کی آواز سنی تھی۔ اور اس جملے کا درد اُبٹن اور سہاگ کی خوشبو کی آمیزش کے بعد کچھ اس طرح مہک اٹھا تھا کہ سلمہ کی روح کلیجے میں پھڑپھڑا کر رہ گئی۔

دوسرے دن سویرے پانچ بجے جب سکینہ کی آنکھ کھلی تو اُس نے دیکھا ببو کا پلنگ خالی تھا۔ وہ دن چڑھے تک سونے کا عادی تھا اس کے اس قدر سویرے اُٹھ جانے پر ماں کو حیرت ہوئی اور جب دن کے آٹھ بجے تک وہ واپس نہیں آیا تو سکینہ کو قدرے تشویش ہوئی۔ اس نے محلے کے لڑکوں میں اُسے تلاش کرایا تو بدھو اخبار والے کے لڑکے سے معلوم ہوا کہ اس نے ببو کو سویرے چھ بجے چار باغ ریلوے اسٹیشن پر دیکھا تھا۔ وہ ہاتھ میں ایک جھولا لئے بمبئی جانے والی گاڑی کے ڈبّے سے جھانک رہا تھا۔ سکینہ یہ خبر سن کر سٹپٹا گئی۔ گھبرائی ہوئی تیز تیز قدموں سے اپنے کمرے میں گئی۔ اس نے ببو کی پیٹی کھول کر دیکھی۔ وہ خالی پڑی تھی۔ اور تینوں جوڑے کپڑے غائب تھے جو اُس نے دو روز پیشتر اپنے ہاتھ سے دھو کے رکھے تھے۔ ببو کی پیٹی خالی دیکھ کر اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اور پھر ایک خیال بندوق کی گولی کی طرح اس کے دماغ کو چھیدتا ہوا گزر گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا کلیجہ تھام لیا۔ وہ ایک دم تڑتی ہوئی شیرنی کی طرح پلٹی ـــــ اور جب کمرے کے دوسرے کونے میں رکھی ہوئی پیٹیوں میں سے ایک پیٹی پر اس کی نظر پڑی تو اسکی دونوں آنکھیں حلقوں سے باہر نکل آئیں۔ جس پیٹی میں سلمہ کا زیور اور نقدی رکھی تھی اس کا تالا مع کنجی کے کھلا ہوا زمین پر پڑا تھا۔

"ہائے میں مر گئی۔" اس کے حلق سے ایک چیخ نکل پڑی۔ اور وہ اپنی چھاتی پیٹتی ہوئی بال بکھرائے پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ انگنائی سے بھاگتی ہوئی سلمہ کی کوٹھری میں گھس گئی

اور سلمہ سے لپٹ گئی۔ "ہائے میں تباہ ہو گئی ــــ ارے میری بچی کیا ہو گا۔" وہ بین کر رہی تھی اور آنکھوں سے آنسو کا سیلاب جاری تھا۔

"کیا ہوا اماں۔ کیا ہوا؟" سلمہ نے ماں سے گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا۔

"ارے وہ سانڈ۔" ماں کہہ رہی تھی۔ وہ سانڈ تالا کھول کر سب لے گیا تیرا۔ ارے تجھے برباد کر گیا بیٹی۔ تجھے برباد کر گیا ــــ"

سلمہ پر جیسے ایک سکتہ سا طاری ہو گیا۔ اس کے جسم سے ماں کی گرفت آہستہ آہستہ ڈھیلی پڑ گئی۔ اور وہ بیٹی کی گود میں غشی کے عالم میں گر پڑی۔ پاس پڑوس کی عورتیں جو پہلے ہی سے گھر میں موجود تھیں سکینہ کی طرف دوڑ پڑیں۔ سلمہ کوٹھری سے نکل نہیں سکتی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے کو قابو میں کیا۔ نہ معلوم کون سی قوت تھی جس نے اس کو ایک نظر وہ بکس دیکھنے کے لئے اکسایا۔ اس نے ایک عورت کو پیٹی کا نشان پتہ بتا کر کوٹھری کے اندر منگوایا۔ پیٹی کھولتے وقت اس کی وہی کیفیت تھی جو ایک سزا یافتہ بے گناہ کی بڑی عدالت سے اپنی اپیل کا فیصلہ سنتے وقت ہوتی ہے۔ جب پیٹی کھلی تو اسکی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس نے بکس کی ایک ایک چیز کو غور سے دیکھا۔ ایک بار، دو بار اور پھر اس کی نظر پیٹی کی اوپری جیب پر پڑی اور چند لمحوں کے لئے ٹھہر گئی ــــ وہ جیب خالی تھی۔ اس نے اپنی یادداشت پر زور دیا اور پھر وہ اپنی ماں سے لپٹ گئی ــــ

ـــــــــــــــــــــــــــ جس نے ابھی ابھی غشی سے

آنکھیں کھولیں تھیں۔ وہ اپنی ماں سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور بولی۔

"ایسا کیوں کہتی ہو اماں؟ سب ہی کچھ تو رکھا ہے۔ تمہارا تو کچھ بھی نہیں لے گیا۔ ٹھیک سے دیکھو نا۔"

"کیا کہہ رہی ہے بیٹی؟" ماں چونک اٹھی۔

"اللہ قسم اماں زیور اور روپیہ دونوں ہی رکھا ہے۔"

"لیکن یہ پیٹی تو کھلی پڑی تھی۔" ماں یکبارگی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

سلمہ دھیرے سے بولی۔ "اماں میں نے اس کے گانوں کی کتابوں کا پلندہ چھین کر اس میں رکھا تھا۔ وہی پلندہ ....." یہ کہہ کر اس کی آواز رندھ گئی۔ اور بڑی مشکلوں سے وہ کہہ سکی۔ "وہی پلندہ غائب ہے اماں۔"

ببو پھر لوٹ کر نہیں آیا۔ سکینہ کو ایک ہی قلق رہا۔ وہ اکثر رندھی ہوئی آواز میں لمبی سی ہائے کھینچ کر کہا کرتی۔

"میرا بیٹا یوں ہی بے سہارا نکل کھڑا ہوا۔ کاش ان پیسوں میں سے ایک ہی روپیہ اپنے ساتھ لے گیا ہوتا۔"

تھکن

ہاتھ میں اگر کچھ ہوتا تو وہ بھی بھرپور وار کرتی ۔ مسہری کا پایا جیسا مسٹنڈا ہاتھ تھا تو کیا ہوا؟

وہ دھیرے دھیرے چراغ کے قریب گئی ۔ سیدھے ہاتھ کی کلائی پر موٹی رسی جیسے انگلیوں کے نشان بنے ہوئے تھے ۔۔۔۔ کانچ کی دو چوڑیاں، وہ بھی چٹخی ہوئی ۔

چٹ !

چٹ !!

اُس نے ان دونوں کو بھی توڑ دیا ۔ رسی جیسے نشان کے پاس کہیں کانچ گھس گیا تھا اور خون کی ایک بوند لال کانچ کی طرح چمک رہی تھی ۔

●

"ملکہ ہے ۔"

"......."

"اری سُنتی ہے ری"۔

"بول۔"

"یہ مرادآبادی کلائی، یہ لہریادار رومال۔ جلوے ہیں جلوے۔"

"دھت۔"

"اچھا ایک بیڑی پلا۔"

●

کلائی پر نظر پڑتے ہی اسے بس یوں ہی یاد آ گیا تھا۔
مرادآبادی کلائی ـــــ وہ دھیرے سے مسکرائی
چھنگا بڑا انجیری تھا۔ سدا یہی کہتا تھا۔
"میری بنیان کا میل اور تیرے بدن کی مرادآبادی پالش مشکل سے چھوٹے گی"۔
آنگن کے اس پار کھلے ہوئے کواڑ کی طرح چھنگا کی باتیں ملکہ کے دماغ کھول دیا کرتیں۔

وہ کوٹھری کے پٹ سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ رات کے اندھیرے میں سامنے، آنگن کے اُس پار، کواڑ پاٹوپاٹ کھلا تھا۔ انگنائی میں کچھ کچی اور کچھ تازی نمکولیاں پڑی تھیں۔ میٹھی بھی کڑوی بھی۔ ذرا سا گودا باقی سب گٹھلی، اسے اپنی کئی راتیں نمکولی کی طرح لگی تھیں۔ میٹھی سی کڑوی سی ذرا سا گودا اتنی بڑی گٹھلی ـــ؛

"ہائے۔" وہ دھیرے سے سسکی۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے سیدھے ہاتھ کی کلائی کو سہلایا۔

"رام کرے آدھی رات کو کھٹیا جائے، رام کرے ہیضہ پکڑے۔"

اس کا بلاؤز پسینہ سے بھیگا ہوا تھا۔ بڑی دیر سے گھر گھر کر رہا تھا۔ شاید پھر برسے گا۔ اس نے چوٹی کا جوڑا باندھتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا۔ چھنگا کے دل کی طرح کالے، ٹھاکر کی چھاتی کی طرح چوڑے اور خود اس کے من کی طرح بوجھل، بادل جیسے کسی مکاوٹ میں لگے تھے۔

"یہ اسی کی مکاوٹ ہے۔" وہ دھیرے سے بڑبڑائی۔

"نائی کا جنا۔"

سامنے آنگن کے اندھیرے کے اس پار کھلے کواڑ سے کوئی اندر آیا۔ اس نے غصّے میں کوٹھری کے طاق پر رکھا ہوا آئینہ کھینچ مارا۔

ہیں۔ میں بیں کی ایک کرخت سی آواز آئی اور آنے والا تین ٹانگوں سے لنگڑاتا ہوا واپس آیا۔

اس ٹوٹے ہوئے آئینہ پر اسے بہت دنوں سے غصّہ آرہا تھا۔ اس نے ٹھاکر سے کئی بار نئے آئینے کی فرمائش کی تھی۔ ٹھاکر سونے کی ایک الٹی سیدھی آرسی لے آیا پر ایک شیشہ نہ لایا گیا اس سے۔

جہاں شیشہ گرا تھا، ادھر اس نے یوں ہی گھور کر دیکھا۔ بیچوں بیچ آنگن کی کیچڑ میں اس کا تکیہ پڑا تھا۔

"رام کرے آنکھیں پھوٹیں۔" وہ بڑبڑائی۔ اس کا جب کچھ بس نہ چلا اور اسے کچھ سوجھ نہ پڑا تو اس نے وہ تکیہ ہی اس کی پیٹھ پر دھد سے دے مارا۔ اس کی پیٹھ پر تکیہ لگا تو وہ گھڑی بھر کے لیے رکا اور پھر پلٹ پڑا تھا۔ اس نے آتے ہی ملکہ

کی چوڑیوں سے بھری کلائی کو اپنی گرفت میں بھر لیا تھا۔

چٹ، چٹ چٹ۔

ایک ساتھ کئی چوڑیاں ٹوٹ گئیں مگر ملکہ کو جیسے کچھ ہو گیا تھا۔ جب اس نے ملکہ کو دوسرے ہاتھ سے اپنی گود میں سمیٹا تو وہ جیسے اس کے بدن پر جھول کر رہ گئی۔ لیکن اس نے کچھ نہ کیا۔ بس ڈھانٹے کے باہر اپنی تھوڑی سی نکلی ہوئی ناک کو ملکہ کی ناک پر رگڑ دیا۔ سب کچھ بہت تھوڑی دیر کے لیے ہوا تھا لیکن اس تھوڑی سی دیر میں ملکہ کو اتنی ڈھیر ساری باتیں سوجھ گئیں۔ سارے کے سارے وسوسے اس پر جھپٹ پڑے تھے۔

جانے کیا کیا ہوگا۔؟

ڈاکو بڑے ظالم ہوتے ہیں، سیدھے سیدھے کپڑے نہیں اتارتے، بدن سے سب کچھ نچ کر اترتا ہے۔ ابھی اس کی انگیا کے چر سے پھٹنے کی آواز آئے گی۔ چولی کا بند پھٹ سے ٹوٹے گا، اور تب ہی ملکہ کے دانتوں میں چلچلاہٹ ہونے لگی۔ اور اس نے اس کے داہنے بازو میں دانت گڑو دئے، جب وہ کاٹ چکی تو اس نے بھی اسے چھوڑ دیا۔

اور تب ہی ملکہ کے سینے میں اس طرح دھک سے آواز آئی جیسے چولی کا بند ٹوٹ گیا ہو۔ انگنائی میں بکھری ہوئی ٹکولیوں کو اپنے بھاری بھاری پیروں سے روندتا ہوا وہ جا رہا تھا۔ بندوق اس کے کندھے پر جھول رہی تھی یا ٹوپاٹ کھلے دروازے سے وہ بہت سکون کے ساتھ باہر نکلا اور بے حد کالے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

تب ملکہ نے سوچا اسے تکیہ نہیں جوتی کھینچ کر مارنا تھی، وہ بدبدائی۔

"بھگوان کرے کوڑ ٹپکے۔" آنگن کی کیچڑ میں لدی پھندی نیم سے نمکولیاں ٹپک رہی تھیں۔

دھیرے دھیرے قدموں سے چل کر اس نے آنگنائی پار کی۔ پٹ بند کیے اور اپنی کوٹھری میں آکر چارپائی پر اوندھے منہ گر پڑی۔

اس کا جی کر رہا تھا کہ وہ چپ چاپ ٹھاکر پوردے سے کہیں چلی جائے۔ کسی سے کچھ کہے بغیر۔ اس نے اپنی پٹاری کو کنکھیوں سے دیکھا جو اب خالی ہو چکی تھی۔ ٹھاکر سے بٹورا ہوا مال جا چکا تھا۔

ابھی پچھلے ساون کی بات تھی۔ جب چھنگا نے اس کے بدن کی مراد آبادی قلعی کے دام ٹھاکر پوردے میں وصول کیے تھے، ایک سال میں نئی نویلی ملکہ دیکھنے میں نئی نویلی ہی سی تھی، کے بڑے ٹھسکے اٹھائے ٹھاکر نے۔ گھناپا تا ملکہ نے منہ پھوڑ پھوڑ کر مانگا، پرانے ہتھکنڈے دکھائے۔ اور کام بنا لیا۔ پر ایک رات میں شائد چھنگا نے اسے فقیر کر دیا۔

لیکن وہ چھنگا نہیں ہو سکتا۔ وہ لیٹے لیٹے سوچنے لگی۔

جس نے اس کی کلائی پکڑی، اپنے بازوؤں میں دبایا اور جس کے بازو میں ملکہ نے دحشیوں کی طرح دانت گڑو دئے تھے وہ چھنگا نہیں ہو سکتا۔ وہ چھنگا کے ساتھ کئی بار سو چکی تھی۔ اس کی گرفت کو پہچانتی تھی۔ سوکھا سا کیکڑا۔

"پر یہ اسی کی مسکا دٹ ہو گی۔"

چھنگا شہر سے دو ہی چیزیں لایا تھا۔ ایک تو "مسکاوٹ" کا لفظ اور دوسرے

"ملکہ" جیسا خوبصورت نام۔ نام چھنگا نے اسے بخش دیا مسکاؤٹ کا لفظ اس نے خود ہی سیکھ لیا۔

پھر اُسے لیٹے لیٹے رام دئی پر غصّہ آنے لگا۔

"حرام جادی ۔" اس نے دل ہی دل میں رام دئی کو سیکڑوں گالیاں دے ڈالیں۔

"کہتی تھی ڈاکو بڑے جالم ہوتے ہیں' ہونہہ' وہ حرامی' جالم تھا یا جانا۔"
ملکہ کو یقین نہیں آرہا تھا کہ عورت کے رنگ و روپ کے مقابلے میں مرد پیسے کی قدر کرے گا۔ وہ یہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ بٹھا کر دس کے بھرے گاؤں میں گھس کر جہاں دس بارہ بندوقیں ہوں اس طرح ڈاکہ ڈالنے والا اجیالا زیورں کی پٹاری تو کھول لے اور ایک کسبی کا چاندی جیسا جوان بدن مرغی کی ڈھابلی کی طرح بند چھوڑ دے۔ آخر پھر کیوں رام دئی نے اس سے کہا تھا۔

"ڈاکے میرا اتیرا ایسے ہی نہیں تن بھی لوٹتے ہیں ری۔"

"جبردستی ؟"

"ہاں ری۔"

"بھلا کیسے ؟"

"کبھی لٹ کر دیکھ' بڑا دیا لگے ہو۔" دیا سے رام دئی کا مطلب ایسا ویسا بالکل نہیں تھا۔

"عجّت تو ہم روج ہی لٹاتے ہیں۔" ملکہ نے جیسے کوئی بڑی فلسفیانہ بات کہہ دی۔ پر رام دئی نے اُسے سمجھایا تھا۔

"ارے وہ تو ہم لٹاتے ہیں تب دوسرا لوٹتا ہے، مجا تو جب ہے نا جب ہم نہ لٹائیں اور دوسرا جبردستی، لڑ کر، نوچ کھسوٹ کر، ہڈیاں چرمرا کر اور ادھ مرا کر کے لوٹے، رام کسم ایک ایک انگ دکھتا ہے ری۔ میں تو مر گئی تھی ایک بار۔ ایسی تھکن ایسی تھکن کہ ہائے رام۔"

رام دئی کی بات پر اب اسے غصہ آ رہا تھا، اس کا من ہو رہا تھا کہ اسی وقت آنگن کی دیوار پھاند کر رام دئی کے بر دھٹے میں چھلانگ لگا دے اور اس کو اس کے یار کی گود سے نوچ کر کہے۔

"تیری جوانی میں کون سے جگنو ٹکے تھے ری جو ڈکھا تجھ سے جبر دستی کر بیٹھا۔ بول تھا نا سب نرا جھوٹ۔؟ کوری موم بتی جیسا میرا بدن باہوں میں بھر کر چھوڑ دیا اس نے ہو نہ جھوٹی کہیں کی۔"

ملکہ نے تڑپ کر کروٹ لی۔ اس کے پاس جو کچھ تھا جا چکا تھا لیکن اس رات جیسے سودزیاں کے وہ پیمانے چھوٹے پڑ گئے تھے۔ اس نکھرے زمانے میں اس نے پتہ نہیں کیا کیا پایا اور لٹایا تھا۔ چھنگا نے اس کی دل داری کی، ناز نخرے اٹھائے گہنا پاتا کئی بار آیا اور گیا جب چھنگا پر برے دن آئے تو ملکہ نے خود ہی ایک ایک کر کے سب بھنا ڈالا۔ جیسے آتا ویسے ہی چلا بھی جاتا، ایک بار کنگن کے بدلے ٹرانسسٹر بھی منگوایا تھا اس نے ـــ دو چار دن میلے ٹھیلے رہتے، چاٹ بازاری ہوتی چھمک چھلو بن کر گھومتی اور پھر وہی سستے بساط خانے کے چار دن میں کالے پڑ جانے والے چھلّے ہوتے اور بالیاں ـــ اور اس بار تو وہ ٹھا کر کی رکھیل تھی۔ کسبیوں کی اس بستی میں یہ گھر ٹھاکر نے ہی اسے دیا تھا۔ گھر کے پیچھے ڈھائی بیگہ زمین پر کاشت بھی اسی

کے نام سے کرائی جاتی اور اتنے ڈھیر سارے گہنے، ایک دم سے نہ سہی ایک ایک کرکے سہی آئے تو بٹا کرکے ہی طفیل سے۔

گہنوں کی پٹاری الٹی دیکھ کر ملکہ کو ایسا لگا جیسے گہنے کی پٹاری نہیں کچی شکر کی ہنڈیا تھی جو الٹ لی گئی ہو۔ ایسی اور بھی کتنی ہی پٹاریاں خالی ہو جاتیں تو بھی وہ اُف نہ کرتی۔ وہ جانتی تھی جب تک بدن کی آگ دھیمے دھیمے روشن ہے، تانبے کی چیتا لیے کا رہے۔

چت لیٹے لیٹے وہ چھت کی طرف یوں ہی دیکھتی رہی۔ اسے وہ دن یاد آئے جو ابھی تھوڑا پہلے آکر چلے گئے تھے۔ چھنگا کے گاؤں میں اس کے قیام کی وہ رات اُسے یاد آرہی تھی۔

"اے سنتی ہے۔"

"......" وہ چپ رہی۔

"اری چراغ تو جلا، یا یوں ہی سسٹی مارے پڑی رہے گی۔"

"میں کہتا ہوں بولتی کیوں نہیں۔"

اندر اور باہر بڑا اندھیرا تھا۔ دور دور سیلاب کا پانی چھنگا کی مڑیا کو گھیرے پڑا تھا۔ راستوں میں بچھا تھا ستیہ گرہیوں کی طرح۔ اور سامنے کی طرف اونچائی پر ریل کی دو پٹریاں جو جانے کہاں گئی تھیں بے حد کے میدان میں کبیر داس کی ابدیت کے تصور کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ ابھی ابھی ہانپتی کانپتی ایک گاڑی ان پر سے گزر گئی تھی۔ چھنگا نے کان کھڑے کئے شاید ملکہ بھی پلنگ پر لیٹی انجن کی طرح ہانپ رہی تھی۔

"کاہے کو مری جا رہی ہے۔" چھنگا نے یوں ہی اندھیرے میں بات ماری، اور لنگڑی اور کبڑی سی کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔ دور سیلاب کے پانی کے اس پار ریلوے کراسنگ کے پاس پائنٹ مین کی کوٹھری میں لالٹین جل رہی تھی۔

"دیکھ چھنگا، گنڈاسے سے سر کاٹ دے پر ایسے سانڈ نہ لایا کر میرے پاس۔"

"کیسا سانڈ؟"

"جو ابھی گیا ہے۔"

"کیوں؟ کیا ہوا؟" چھنگا پوچھتا ہوا اندھیرے میں ٹٹول کر چارپائی کی پٹی پر بیٹھ گیا۔ چولیں یوں بول پڑیں جیسے ایک ساتھ کئی مینڈھک ٹر ٹرا پڑے ہوں اس رات پہلی بار چھنگا نے اس کے ساتوں طبق روشن کر دئے تھے۔

"دیکھ تو ابھی کل کی لونڈیا ہے، تھوڑے سے گر سیکھ لے نہیں تو خون تھوک دے گی۔ مرد کی ہڈی کے گودے سے لڑے گی تو سدا چوٹ کھائے گی۔ اس کے نیچے کو مسل چسوا آم کی طرح۔"

"ارے وہ منی کب تھا رے، دیکھ تھا ریچھ۔" جملہ اس طرح ادا کیا گیا کہ چھنگا اندھیرے میں بھی جان گیا کہ ملکہ دانت پیس رہی تھی۔

"رہنے دے بس" چھنگا نے برا سا منہ بنایا "یوں بستر بند کی طرح کھل کر پڑ جائے گی تو کر چکی دھندا۔ ارے وہ کون بڑا بھیم سین تھا۔ چار گھڑے تاڑی پی لینا، مونچھوں کو تیل پلانا اور پھر سالے گاؤں میں گھومنا کون سی بڑی بات ہے۔ عورت سے گھاٹ پائے نہیں بنتی۔ چٹکی بجاتے میں اس گھاٹ سے اس گھاٹ اتار دیتی ہے یہ۔ الٹے سیدھے چپو چلانا چھوڑ، ملاحی سیکھ ملاحی۔ تو کسی ایک کی

عورت نہیں ہے جوڑ بودے اپنے کو تیرا کام تو پار اتارنا ہے، کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ!
تو تو میرے ساتھ شہر جا چکی ہے نا، وہاں اسٹیشن پر میں نے تجھے وزن لینے والی
مشین پر کھڑا کیا تھا۔ یاد ہے نا؟ بس مردوں کے ساتھ وہی حساب رکھ، ادھر
دونوں پیر جمے نہیں کہ ٹکٹ دھرا ہے۔"

"جا جا مجھے بھوک لگی ہے۔"

"دودھ پیئے گی؟"

"نا ——"

اور دیکھ ری ملکہ میری ایک بات مان، چارپائی تیرا دھرم ہے اس سے کبھی
کھلواڑ نہ کرنا۔ مرد کو اس پر اس گھڑی تک پیر نہ رکھنے دے جب تک وہ ادھ مرا
نہ ہو جائے اور ہاں وزن بتانے والی مشین۔"

"جا رے مجھے بھوک لگی ہے۔" ملکہ اس کی بات کاٹ کر بڑی ادا سے ٹھنکی۔
اور اس رات، اس اندھیری کوٹھری میں اس 'پکھیرے' والے ریچھ کے جانے
کے بعد سے ملکہ وزن بتانے والی مشین کی طرح چل نکلی۔ لیکن چھنگا بڑا تیز تھا
اس سے پہلے کہ ملکہ کے بدن کی مراد آبادی پالش اترے وہ اسے ٹھکانے کر کے ہاتھ ٹھکانے
لگا گیا۔

ملکہ نے بیتے دنوں کی یادوں پر سے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی اس کا بھٹکتا
ہوا ذہن اس طرح ایک دم سے واپس لوٹ آیا جیسے غلیل کھینچے ہوئے ربڑ کا سرا
چھوٹ گیا ہو، ملکہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کروٹ بدلی۔ انگنائی میں نمکولیاں
ٹیک رہی تھیں پٹاری اوندھی پڑی تھی۔ ملکہ اب بھی اپنے دانتوں پر اس کے

بازو کے گوشت کی سختی محسوس کر رہی تھی جس کو اس نے کھنبھوڑ ڈالا تھا لیکن وہ کیسا ڈاکو تھا۔ ملکہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جب وہ کچھ دیر پہلے دیوار پھاند کر بھد سے انگنائی میں کودا تھا تو وہ جاگ رہی تھی آہٹ پا کر وہ بولی تھی۔

"کون ہے۔؟"

لیکن اسے جواب نہیں ملا تھا تو ملکہ نے کوٹھری کے دروازے سے باہر جھانک کر دیکھنا ہی چاہا تھا کہ دروازے سے بندوق کی ایک نال اندر بڑھتے نظر آئی اور پھر چراغ کی مدھم مدھم روشنی میں مسہری کے پائے جیسے موٹے موٹے ہاتھ پیروں والا ایک اونچا اور چوڑا سا قد کھڑا تھا۔ اس کا سارا چہرہ سیاہ کپڑے کے ڈھانٹے سے لپٹا تھا آنکھیں دو گہرائیوں میں اندر کہیں چمک رہی تھیں ملکہ ایک پل کے لیے ضرور اچھل پڑی یہ جھٹکا خوف و دہشت کا تھا لیکن ٹھیک اس کے بعد ایک اور بھی جھٹکا آیا۔ ایک ان جانا اور غیر محسوس سا جھٹکا جیسے ملکہ کو بہت دنوں کی کھوئی ہوئی کوئی بات یاد آ گئی ہو وہ سوال اندر ہی اندر پھانس کی طرح چبھ اٹھا تھا۔

"کیا رام دئی ٹھیک کہتی تھی۔؟"

"..... مجا تو جب ہے نا، جب ہم نہ لٹائیں اور دوسرا جبردستی، لڑ کر، نوچ کھسوٹ کر، ہڈیاں چرمرا کر اور ادھ مرا کر کے لوٹے۔ رام کسم ایک ایک انگ کھتا ہے رہی، ایسی تھکن ایسی تھکن کہ ہائے رام۔"

اس وقت جب ڈاکو کی جبردستی والی بات رام دئی نے اس سے کہی تھی تبھی ملکہ کو ایسا لگا تھا جیسے اس کی سانس اپنے والی ناڑی میں کچھ اٹک گیا ہو، اس نے رام دئی سے چھپا کر اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا۔

تھکن!

تھکن!!

صرف یہی ایک لفظ تھا جو ملکہ کو پکڑ ملا تھا۔ یہ کون لفظ کہا تھا رام دئی نے۔ ملکہ کو ایسا لگا تھا جیسے کسی دوسرے تالے کی کنجی اس کے تالے میں گھوم گئی ہو اور کھٹاک کی آواز کے ساتھ خلاف امید اس کا تالہ کھل گیا ہو۔ شاید وہ اسی جیسے لفظ کی کمی کو اپنی زندگی میں محسوس کر رہی تھی۔ اتنا سب کچھ ہو گیا لیکن وہ نہیں تھکی اتنا سب کچھ ہوتا رہتا ہے لیکن وہ نہیں تھکتی۔

"میری بات مان۔" چھنگا نے اس سے کہا تھا "چاہے یا ئی تیرا دھرم ہو اس سے کبھی کھلواڑ نہ کرنا۔"

وہ اس دھرم کو آج تک نبھا رہی تھی اور تھکی نہیں تھی وہ کئی بار چھنگا سے کہہ چکی تھی۔"

"میرا من اوب گیا ہے رے اپنی کسم بہت اکتا گئی ہوں۔"

چھنگا بڑا کائیاں تھا۔ اس نے کبھی ملکہ کو اکتاہٹ اور تھکن کا فرق نہیں سمجھنے دیا۔ وہ ہمیشہ ایسے موقعوں پر اسے چمکار کر غلط راستے پر ڈال دیتا۔

"تو تھک گئی ہے، کچھ دنوں سستا لے۔" اور ملکہ اکتاہٹ کو بھول کر تھکن کو سچ مان لیتی۔ لیکن رام دئی نے ڈاکو والے قصے میں تھکن والی بات بتائی تھی تو ملکہ کو ایسا لگا تھا جیسے یہ شبد اس نے پہلی بار سنا ہو تبھی اس پر یہ بھید بھی کھلا تھا کہ چھنگا اُسے ہمیشہ تھکنے سے بچاتا رہا۔ اور وہ اکتاہٹ کا شکار ہوتی رہی۔ چھنگا نے اسے یہ کبھی نہ بتایا کہ اس معاملے میں ملکہ مجبور ہے، تھکن اسے نہ مل سکی۔ چھنگا نے

اسے یہ بھی نہ بتایا کہ تھکن کام کا انعام ہے اور اکتاہٹ بیٹھے کی لعنت۔ یہاں تک کہ وہ ٹھاکر کے ہاتھوں اونے پونے بیچ دی گئی۔ کہنے کو وہ ٹھاکر کی رکھیل تھی لیکن کچھ تو ایسی ہی بات تھی جو ٹھاکر کے علاوہ بھی اس کی اٹریا میں دوسرے لوگ آتے تھے۔ کبھی ٹھاکر کے نام سے کبھی ٹھاکر کے بھیجے ہوئے اور کبھی مہمان بن کر۔ وہ انھیں بھی خوش کرتی اور چلتے وقت وہ اسے خوش کرتے اور ان ساری خوشیوں میں جیسے چوری چھپے ٹھاکر کی خوشی بھی شامل ہوتی، پوری بستی کا یہی حال تھا۔ رام دئی چھوٹے ٹھاکر کی رکھیل تھی۔ کندنی برگد والے ٹھاکر کی رکھیل تھی۔ جیا ٹھاکر رام سنگھ کی رکھیل تھی کیونکہ یہ چھوٹی سی بستی انھیں ٹھاکروں کی آبادکی ہوئی تھی جس کو جہاں سے جو ملی اٹھا لایا سب ہی ٹھاکروں کے پاس زمین تھی، بندوق تھی، ٹرانسسٹر تھا اور رنڈی تھی۔ سب ہی کی ڈیوڑھیوں پر پچیسی کی ساتوں کوڑیاں چت گرتی تھیں اور سب ہی رکھیلوں کی چارپائیوں پر ان کے آقاؤں کے علاوہ ان کے مستند یاروں کا بھی حصہ لگتا تھا۔ کچھ دنوں ملکہ کو ٹھاکر نے ایسا احساس دلایا جیسے سب کچھ نیا نیا ہو لیکن پھر سب کچھ ویسے ہی ہونے لگا۔ وہ پھر سے وزن بتانے والی مشین کی طرح چل نکلی۔ ایک دن اس نے ٹھاکر سے بھی وہی بات کہی تھی۔

"اے ٹھاکر، بہت اوب گئی ہوں، بہت اکتا گیا ہے من میرا۔"

جس کے جواب میں ٹھاکر نے بغل میں دبے ہوئے ٹرانسسٹر کی آواز اور تیز کر دی تھی اور انگنائی میں پان کی ایک لمبی پیک تھوک کر چلا گیا تھا۔

— لیکن رام دئی نے کیا، جو کچھ کہا تھا ٹھیک تھا؟

وہ تھکن کہاں ہے؟

اور اب جب چراغ کی مدھم روشنی میں مسہری کے پائے جیسے موٹے موٹے ہاتھ پیروں والا ایک قد آور اس کے سامنے کھڑا تھا تو پھر جیسے یہی سوال ایک پھانس کی طرح اس کے اندر ہی اندر چبھنے لگا۔

وہ گھور کر آنے والے کو دیکھنے لگی۔ دھیرے دھیرے اس کی آنکھوں سے خوف بہا جاتا رہا۔

"کا بات ہے؟" ملکہ نے سنبھالا لیا۔

"آنے والے نے بندوق ملکہ کے سامنے کر کے اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"ارے اسنری جات کو بندوق کیا دکھاتا ہے۔ بول نا کیا ہے؟" وہ تڑپ کر بولی تھی جس کے جواب میں پھرتی سے ایک قدم آگے بڑھ کر اور ملکہ کے سینے پر نال دکھا کر اس نے صرف دو لفظ تیزی سے نکالی ہوئی سانس پر رکھ کر پھینک دئے تھے۔

"چو......و......پ۔"

اور پھر اس نے اشارے سے ملکہ کو بتایا کہ وہ کلائیوں کے کنگن اتار کر اس کے حوالے کر دے۔

"لے۔" وہ جھنجھلا کر بولی تھی، "بھاگ جا لے دے کے۔ مٹھا کر پا گیا تجھے تو لانگ کھول دے گا تیری' وہ مرد ہے جنانا نہیں۔"

ملکہ سمجھی تھی کہ مرد کی حسد کی بارود کے لیے اتنی سی چنگاری بہت ہو گی لیکن بندوق والے ہاتھ ملکہ کے کانوں کی طرف بڑھے ملکہ اندھی ہو رہی تھی۔

"مجا نو جب ہے جب ہم نہ لٹائیں اور دوسرا جبر دستی......ایسی ٹھکن'

ایسی تھکن کہ ہائے رام۔"
شاید وہ وقت آگیا ہے۔ "جلدی کر۔" اس نے اپنے من سے کہا۔
یہی موقعہ ہے ایک ہاتھ اور مار دے بڑھ کر،
"ارے سن!" وہ بندوق والے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ کر بولی۔
"باقی گہنا پاتا وہ پٹاری میں دھرا ہے۔ بدن کو ہاتھ لگایا تو دانتوں سے ناک کاٹ لوں گی، یہ تیرے باپ کا مال نہیں ہے جو لوٹ لے جائے۔"
آنے والا اسے مرغی کی ڈھابلی کی طرح نظر انداز کر کے آگے بڑھ گیا۔ اس نے بہت اطمینان سے زیور اور نقدی الٹ لی اپنے کندھے پر بندوق لٹکائی اور۔
"وہ جا رہا ہے۔"
"وہ جا رہا ہے۔"
ملکہ کے کانوں میں سناٹے جیسے ہر طرف سے چیخنے لگے۔ ملکہ غیر ارادی طور پر اس کی طرف لپکی، لیکن جانے والے نے اس کی طرف پلٹ کر نہ دیکھا اور پھر ملکہ کو کچھ نہیں سوجھا، ابھی وہ کالی کالی انگنائی میں ہی پہنچا تھا کہ ملکہ نے تکیہ اس کی پیٹھ پر کھینچ مارا اور تب ہی وہ پلٹ پڑا تھا، تب ہی اس نے ملکہ کی چوڑیوں بھری کلائی کو اپنی گرفت میں بھر لیا تھا اور ملکہ سمجھی تھی کہ اب وہ پھانس نکل جائے گی۔ سب کچھ نچ کر اترے گا، چولی کا بند پھٹ سے ٹوٹے گا اور تب ہی ملکہ نے اس کے بازو میں اپنے دانت گڑو دئے تھے اور تب ہی۔
"بھگوان کرے کوڑھ ٹپکے۔" آنگن میں لدی پھندی نیم سے نکولیاں ٹپک رہی تھیں اور وہ جا چکا تھا۔

اور اب جبکہ وہ جا چکا تھا وہ دل ہی دل میں کڑھ رہی تھی اور جاگ رہی تھی، باہر آہٹیں ہونے لگی تھیں۔ اس کے پچھواڑے کھیتوں میں کھڑی ہوئی پتایئں بولنے لگی تھیں، شاید ان میں گھسے ہوئے لوگ اپنی لٹیوں کا پانی بہا کر دھوتیوں کی لانگ باندھ رہے تھے اور تب ہی ملکہ کی آنکھ لگ گئی۔

جانے کب دھوپ اتری۔

رات کی ڈسی ہوئی ملکہ دن چڑھے تک سوتی رہی۔ آنکھ کھلی تو اس کے بازو اور پیٹھ کی ننگی کھال پر کھری چارپائی کے بان بن گئے تھے۔ وہ کوٹھری سے باہر نکلی، آنگن میں اس کا رات کا پھینکا ہوا تکیہ پڑا تھا۔ جب رام دئی نے کنڈے مانگنے کے لیے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا تو ملکہ کو احساس ہوا کہ اس کے دانتوں میں دبی ہوئی دتون کا سواد بڑا کڑوا ہے۔ اور جب اس کے آنگن میں ڈھیر ساری کبسیاں جمع ہو گئیں تو اسے اپنے آنگن کی نمکولیوں کی باس بڑی پیاری معلوم ہونے لگی۔

وہ کڑھ رہی تھی۔ ابھی رام دئی اس کے آنگن سے نکل کر اپنے دروازے تک پہونچی ہی تھی کہ ملکہ کے یہاں ڈاکہ پڑنے کی بات گاؤں کا چکر کاٹ کر لوٹ آئی جب تک اس کی انگنائی میں ہڑبونگ رہا ملکہ کو دھیرے دھیرے ابکائیاں آتی رہیں اور جب سب چلے گئے تو بھی رام دئی نہیں گئی۔

"سن۔" رام دئی اپنی انگیا کی سیون پر جمے ہوئے میل میں کچھ ڈھونڈھتے ہوئے بولی۔

"برس برس یہی ہوتا ہے ری، تیرا تو پہلا ہی ساون ہے یہاں۔ آگے دیکھیو
ایک پچھیا بھی نہیں چھوڑتے دہجرے۔" اور پھر وہ پوچھ بیٹھی۔
"جھاڑو دے گیا نا؟"
جواب میں ملکہ نے لمبی سی سانس لی، رام دئی دھیرے دھیرے اسے بتاتی رہی۔
"کوئی نہیں جانتا ری۔ چودھری لوگن کا اتّا جبردست گاؤں کہ دس دس
کوس پر نگاڑا بجے، پر جہاں ساون آیا تہاں ایسے لگے ہے کہ اب کوئی پھاند اب
چھاتی پر بندوک آئی۔ سارے چودھری دھتورہ گھوٹ کر جانو سوئے جات ہیں"
پھر رام دئی نے اسے ایک ایک کر کے پچھلے تین چار برسوں میں اس بستی
میں پڑنے والے ڈاکوں کی کتھا سنائی۔ ہر سال آدھی سے زیادہ کسبیاں اسی طرح
کی برسات کی کسی رات میں اپنی جمع کی ہوئی معمولی سی نقدی اور ٹھاکروں سے بڑی
منّت اور سماجت کے بعد اینٹھے ہوئے کاغذ سے بھی ہلکے گہنوں کو کھو بیٹھتیں، اس
نے بتایا کہ ڈاکہ کی صبح دکھیاری عورت اپنے ٹھاکر کی دہائی دیتی ہوئی اس کی چوکھٹ
پر اپنی چوڑیاں توڑ دیتی اور پھر وہ ٹھاکر سارے گاؤں میں ایک کہرام مچا دیتا
سارے ٹھاکروں کی بندوقیں نکل آتیں لینا، دوڑنا، پکڑنا کی صدائیں آتیں
بوڑھے چودھری اپنی اپنی دھوتیوں کے اندر ہاتھ ڈال کر کچھ دیر بلاضرورت کھجاتے
اور پھر کوئی بڈھوا یا چپر واخارش زدہ کتّے کی طرح اونگھتا ہوا پوچھتا۔
"تو پھر مالک، تھانے چلی..."
"دھت توری بہنی کی۔" اس کو ڈانٹ پلائی جاتی۔
"ہمار رعایا اور تھانے ماں رپٹ۔ تب تو ہم کر بھئے ٹھکرائی، ارے آدے

دیو دوارے پر ایک کار توس ماں دھواں نکل پڑے ہے دھواں۔"

اس طرح سارے قصّے بتانے کے بعد رام دئی نے ملکہ کو صلاح دی۔

"تو ایسے کیوں بیٹھی ہے ری، ڈیوڑھی پر جا کر روتی کیوں نہیں؟ دیکھ بچّی، اپنا جوبن تو جاڑے کی دھوپ ہے، دیوار سے اتری کہ جانو چھت پر تب بھی جوار کے چار دانے بھنا کر سکھ ملے گا۔ ایک ایک چھلا ٹوٹے ایک ایک چھلا۔ یہ حرام جانے منڈیر کے کوّے، ہڈی دبائی اور پھر سے بھنگی پر، ان کا بسواس، رام رام۔"

اور پھر چلتے چلتے رام دئی نے جو کچھ کہا اس سے ملکہ ایک پل کے لیے اپنے من ہی من میں پھلجھڑیوں کی طرح پھوٹ پڑی۔

اے، جاری ملکہ اتی سی بات کا اتا بتنگڑا۔"

رام دئی کی دلیلوں میں اکثر اتنی ہی طاقت ہوتی، لیکن ایک بار پھر ملکہ کو شک ہوا ـــــ

"کون جانے رام دئی کی بات کوئی پرمیشور کے بچن ہیں۔ اپنی آنکھوں سے تو اس نے دیکھا نہیں۔

لیکن جب وہ اس چوڑے چکلے ہاتھ پیر والے کے بدن کی ساخت کو ڈھا کر کے خد و خال سے ملاتی تو چھاتی کے اندر اس کا دل تیز تیز چلنے لگتا۔ وہ گھبرا کر اپنی نظر ڈالتی۔ اس کی کلائی پر موٹی رسی جیسے نشانوں کی ہلکی ہلکی چھاپ اب بھی رہ گئی تھی۔ اس نے ہاتھ کی گرفت کو ذہن میں ٹٹولا۔ اور اچھل پڑی۔

"ہائے رام ـــ" فیصلہ اس کے حق میں ہوا تھا۔

رام دئی نے بڑے رازدارانہ انداز میں اس سے کہا تھا۔

"ملکہ ایک بات کہوں، کھا کسم کسی سے نہ کہے گی۔"

"کا" ملکہ نے مختصر سا سوال کیا۔

"میرے من میں تو کبھی کبھی بڑا شک آتا ہے ری۔"

"کیسا شک!"

"ایسے بھی کہیں ڈاکے پڑے ہیں ری۔ ہو گیا کبھو کدھار پر یہاں تو برس کے برس یہی ہووے ہے۔ آج تک ایکو رپٹ تھانے میں نا گئی ری۔ میرا گاؤں تو ایک بندوک پر رکا رہا اور یہاں اتی اتی بندوکیں اور برس برس ڈاکے، میں نے تو ایسے جیالے نا دیکھے کبھی جو ایسے سانپن کے بل ماں لپ سے ننگا ہاتھ ڈال دیں اور وہ بھی ایک بار نہیں بارم بار۔"

"جانے" ملکہ یوں ہی کچھ غور کرتے ہوئے بولی۔" پر تجھے سک....."

"سن" رام دئی نے بات کاٹ دی۔

"یہ سارے کے سارے چودھری بڑے مکری ہیں ری، کہیو نا۔ مجھے تو ایسا لگے ہے ری کہ اپنا بدن تو بیاج میں جاوے ہے یہ اپنا اصل تو سال پورا ہوا کہ اٹھا لے گئے پر ماتما کسم مجھے سو اس نہیں ان پر۔"

"اچھا" ملکہ حیرت سے بولی۔

اور پھر رام دئی نے ملکہ کو بتایا کہ اس نے اکثر بڑی گہری باتیں سوچ ڈالی ہیں۔ کہ وہ اور جیا اور ملکہ اور بابا سب بہت کمزور ہیں۔ اور چودھریوں کا یہ گاؤں چھوٹنا مشکل ہے اور چودھری لوگ اپنی ایک ایک پائی کا حساب یوں ہی لیتے رہیں گے اور

آنے والی برسات کے

لئے وہ سب ہر سال، یوں ہی ٹھاکروں کے گھروں سے چیونٹیوں کی طرح ایک ایک دانہ بٹورنے میں لگی رہیں گی اور یہ بھی کون جانتا ہے کہ منہ پر ڈھانٹا باندھ کر انگنائیوں میں کودنے والے داستو میں ڈاکو ہی ہوں۔

"پھر؟" ملکہ حیرت سے اسے تکنے لگی۔

"کیا تجھے لبواس ہے کہ وہ کوئی ڈاکو ہی رہا۔ تیرا یار نہیں۔"

"میرا یار" وہ گھبرا کر بولی "پر کون ری۔"

"جو وہ تیرا ٹھاکر رہا ہو تو۔؟"

"ٹھاکر ـــ" اس بار پھر ملکہ کو دو جھٹکے لگے۔ پہلے جھٹکے میں حیرت اور استعجاب اور کسی غیر متوقعہ سازش کے پھوٹ پڑنے کا دھماکہ تھا۔ لیکن ٹھیک اس کے بعد ایک اور جھٹکا آیا۔ ایک غیر محسوس سا زلزلہ۔

"تو کیا وہ ٹھاکر نہیں تھا۔"

تو کیا اس کی وہ ساری کامنائیں جن کی تکمیل ہوتے ہوتے رہ گئی اور جن کا جادو ٹوٹنے پر وہ اس طرح پچھی تھی کہ انگاروں پر لوٹتی رہی کیا وہ خواب ابھی نہیں ٹوٹے۔ اور تب ہی سودا ما لوہار کے بچھڑے کے گلے میں ملکہ نے باہیں ڈال کر کہا تھا۔

"ارے جاری ملکہ۔ اتی سی بات کا اتنا بتنگڑا۔" اور اسکے من میں پھلجھڑیاں پھوٹ پڑیں تھیں۔

"ہے بھگوان رام دئی کا کہا سچ نکلے۔" وہ من ہی من میں بڑبڑائی ایک پل کے لئے اس کے من میں آیا کہ وہ اسی وقت کو اڑتے اوٹ کر ٹھاکر کی چوکھٹ پر جائے اور اس سے کہے۔

"ہے ٹھاکر میں سدا تیری جوگن بنی رہوں گی پر اتنا کہہ دے کہ رات جو کچھ ہوا وہ سوانگ تھا، کپٹ تھا۔ دیکھ لیے نرموہی۔ کہہ دے کہ رات میرے آنگن میں کوئی دوسرا نہیں۔ تو تھا۔ دیکھ میری آس نہ توڑنا۔"

آس۔!

وہ کون سی آس تھی۔؟ ملکہ سے پوچھا جاتا تو پتنگ کی کٹی ہوئی ڈور کی طرح اڑ جاتی، پھانسی کے پھندے پر اس سے اگر کہا جاتا بول تیری آخری خواہش کیا ہے تو کچے تربوز کی طرح سفید ہو جاتی لیکن بول نہ پاتی، ہاں اس کے کانوں میں وہ آوازیں ضرور بجنے لگتیں۔

"یہ ڈاکو میرا تیرا پیسہ ہی نہیں تن بھی لوٹتے ہیں ری۔"

"جبر دستی۔"

"ہاں ری۔"

"بھلا کیسے۔؟"

"کبھی لٹ کر دیکھ، بڑا ویسا لگے ہے..... ایسی تھکن ایسی تھکن کہ ہائے رام۔"

رام دئی کے جانے کے بعد اور گاؤں میں ڈاکے کی بات مشہور ہو جانے پر سب نے سوچا کہ ابھی ابھی ملکہ بال کھولے آنچل اڑاتی ٹھاکر کی ڈیوڑھی کی سمت بھاگتی دکھائی دے گی۔ لیکن ملکہ نہ دکھائی دی۔ تھوڑی دیر بعد ٹھاکر کا آدمی اسے بلانے آیا وہ تب بھی نہ گئی اور پھر جب شام ہوئی۔ اندھیرا ہوا تو گاؤں کی اس آخری جلتی جاگتی بستی میں ملکہ کی انگنائی میں چراغ نہ جلا۔

وہ یوں ہی اندھیرے میں پڑی تھی کہ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ آس

نے باہر کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ اسے انگنائی کے اندھیرے میں جانی بوجھی سی پیروں کی چاپ سنائی دی۔ آنے والے کے قدم ملکہ کی کوٹھری میں آ کر رک گئے۔ اور پھر ملکہ کو لگا کسی نے ڈھیر ساری روشنی اس کے چہرے پر انڈیل دی۔ ٹن ویتے ہی پھر اندھیرا ہو گیا۔

"ملکہ" وہ دھیرے سے بولا۔ "اٹھ اور چراغ جلا"

یہ کہہ کر ماچس اس کے پاس ڈال دی گئی۔ ملکہ دھیرے سے اٹھی بتی کی لو بڑھا کر تیلی جلائی اور چراغ کے پاس سے ہٹے بغیر کنکھیوں سے ٹھاکر کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ ترچھا ہو کر چارپائی میں دھنس گیا تھا۔ بگلے کے پروں جیسی سفید دھوتی چمکتا ہوا لمپ چنا ہوا کرتا، داہنے گال میں بھرے ہوئے بیڑے کو مزے مزے پگھلا رہا تھا۔ چھپر کی چھت کو تکتے ہوئے بولا۔

"میں نے تجھے بلایا تھا"

"ہاں" جواب دے کر ملکہ نے اس کی طرف پیٹھ کر لی۔ اور جوڑا باندھنے لگی۔ جھٹ پٹا ہوتے ہی وہ نہائی تھی بال ابھی تک کچھ کچھ گیلے تھے۔ موٹی سی بندیا موٹا موٹا کاجل اور موٹی سی سفید دھوتی، چولی کے قید و بند سے آزاد اس کا موٹا موٹا سینہ اس کی غیر معمولی سانسوں کے زیر و بم کا احساس دلا سکتا تھا۔

"پر تو آئی نہیں" ٹھاکر کی آواز ابھری۔

"نا ـــــ"

"دیکھ چلا گیا تو چلا جانے دے، من میں تنک میل نہ لا، میرے ہوتے تو چنتا کس بات کی کرتی ہے"

ملکہ ٹھاکر کی طرف سے بیٹھ کیے اپنے سیدھے ہاتھ کی کلائی کو دھیرے دھیرے سہلاتی رہی جس میں پچھلی رات چوڑی کی ایک کرچ گھس گئی تھی۔

حالانکہ ٹھاکر کو چراغ کی مدھم روشنی میں تیکھے کی ملکہ اپنے اتار چڑھاؤ میں کچھ زیادہ اچھی لگ رہی تھی لیکن وہ بول پڑا۔

"ادھر دیکھ۔"

ملکہ گھوم پڑی۔ موٹے موٹے سے مگر ڈھلے ہوئے سے ہونٹ بڑے اداس لگ رہے تھے آنکھیں جو کنی گائے کی طرح پھیلی ہوئی تھیں ٹھاکر کو یک بارگی اس پر دلار آگیا۔ اس نے بڑھ کر ملکہ کا ہاتھ پکڑا اور اپنی طرف کھینچ لیا۔

"ہائے رے دکھتا ہے۔"

"کہاں ؟"

"یہاں۔" اور بڑے بھولے پن سے ملکہ نے اپنی کلائی اس کی جانگ پر رکھ دی۔ ٹھاکر پھر ترچھا لیٹ گیا اور جب ٹھاکر نے ملکہ کا سر اپنے بازوؤں میں رکھا تو جیسے ملکہ کا دل اس خیال سے بلیوں اچھلنے لگا جیسے وہ بہت دیر سے دل کے کسی گوشے میں دبائے تھی۔ کوئی اس سے کہہ رہا تھا۔

"یہ بھید صرف تو ہی جان سکتی ہے اگر وہ ٹھاکر ہی تھا تو اس کے بازو پر تیرا دیا ہوا نشان اب بھی موجود ہوگا۔"

اس کی منزل اتنی قریب تھی یہ سوچ کر مارے خوشی کے اس کا جی امنڈ آیا اور وہ ٹھاکر کے گلے میں باہیں ڈال کر اور اس کے سینہ میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

"چپ ہو جا۔" ٹھاکر نے اس کے کولھے میں چٹکی لی۔ اور دلاسہ پر لانے لگا۔

"اس سے دوگنا نہ دیا تو ٹھاکر نہیں چمار کہنا"۔ اس نے ملکہ کو دلاسہ دیا۔ اور کھل نکلا۔ ملکہ نے خوب خوب جھکائیاں دیں۔ بہت دیر تک تو ٹھاکر کھلواڑ جانتا رہا پھر بولا۔

"کیا بات ہے، تو تو ہاتھ ہی نہیں لگتی"

"کیا تجھ سے کم ہوں" ملکہ دھیرے سے مسکرائی۔

"زور آزمائے گی۔؟"

"آزمالے" یہ کہہ کر ملکہ نے لمبی سی سانس لی۔ جیسے جیسے اس کے منصوبے تکمیل کو پہنچتے جا رہے تھے اس کے ہاتھ پیر سرد ہوتے جا رہے تھے۔ دو ہی چار منٹ کی دھینگا مشتی میں ملکہ کے کس بل نکل گئے۔ وہ بڑی دیر سے ٹھاکر کے سیدھے ہاتھ کی آستین کو مونڈھے پر سے اپنی مٹھی میں بھینچے ہوئے تھی۔

"ہے ایشور میری سہائتا کر" وہ من ہی من میں گڑگڑائی۔ اور زور سے ہاتھ کا جھٹکا دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے آستین کی دھجیاں اڑ گئیں۔ چراغ کی روشنی میں ٹھاکر کا بازو ننگا دکھائی دے رہا تھا۔

اور پھر دوسرے دن ـــــ

"ٹھاکر، اپنی کسم من بہت ادب گیا ہے۔ بہت اکتا گئی ہوں رے" ٹھاکر اس طرح بولا جیسے چھنگا بول رہا ہو۔

"تو تھک گئی ہے، تھوڑا آرام کر لے"

اور ٹھاکر چلا گیا۔

وہ بیٹ پکڑے اسے کچھ دور جاتے دیکھتی رہی، اس نے ٹھاکر سے تب بھی یہ نہ

بتایا کہ وہ اس کے بازو پر اپنے دانتوں کے نشان دیکھ چکی ہے۔

پٹ بھیڑ کر اس نے کچھ اس طرح انگڑائی پار کی جیسے واقعی بہت تھک گئی ہو۔

--

پیٹ کا کیچوا

"کفن کے کپڑے میں کتنا خرچ ہوگا؟"

"بیس پچیس روپے!"

"غسل وغیرہ میں؟"

"دس پندرہ روپے۔"

"قبر کے لیے؟"

"اگر خرید کی جگہ لی گئی تو تیس بتیس روپے۔"

"اور دفن کے واسطے؟"

"پندرہ بیس روپے اوپر سے اور رکھ لو۔"

"تو سو روپے کے اندر کام ہو جائے گا نا؟" اس نے سیدھے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہو جائے گا۔" میں نے جواب دیا۔

"تو تمہارے پاس کیا کچھ بھی نقد نہیں؟"

"ہے کیوں نہیں۔"

"کتنا ہے؟"

"دو سو روپیہ۔" میں نے اندر ہی اندر کھولتے ہوئے جواب دیا۔

"میرے پاس نقد دو سو روپیہ موجود ہے" میں نے جملہ پھر دہرایا۔ ایک ایک لفظ پر زور دیا۔

"تو پھر؟"

"تو پھر کیا۔؟" جیسے اب تک وہ میرے سامنے ریوالور تانے کھڑا ہوا تھا اور اب اس نے ٹریگر پر انگلی رکھ دی ہو۔

"اب تمھیں کس بات کا انتظار ہے یہ لاش اب تک یونہی کیوں پڑی ہے؟" اس نے گولی چلا دی۔ جیسے میری شہ رگ پر نوکیلی کیل رکھ کر ٹھونک دی گئی ہو۔

"تم ذلیل ہو۔" میں نے مٹھیاں بھینچ کر جواب دیا" میں جانتا تھا کہ ابھی نہیں تو کچھ دیر کے بعد تم مجھ سے یہ سوال ضرور کرو گے۔ کمینے!"

لاش کیوں پڑی ہے۔

کیوں!

کیوں!!

یہی کیوں تھا جو پچھلے چار گھنٹوں سے میرے دماغ کے گودے کو نوچ نوچ کر کھا رہا تھا۔

برابر والے کمرے سے راجہ کی ماں تھکی تھکی سسکیوں سے رو رہی تھی۔ وہ راجہ کے سرہانے بیٹھی تھی۔ اس نے راجہ کو پیر کے انگوٹھے سے لے کر سر تک چادر سے ڈھک رکھا تھا۔

میں نے اپنے اندھیرے کمرے سے باہر آسمان کی طرف دیکھا۔ باہر کا اندھیرا جیسے اندر آ گیا تھا۔ بہت اندر۔ باہر حد نظر تک بہت کچھ خالی خالی سا گنجلا گنجلا سا تھا۔ میرے دماغ کے گوشوں کی طرح ۔۔ رات جو سارے دکھوں کو سلا دیتی ہے میرے دکھ کو پھوڑے کی طرح ٹپکا رہی تھی۔

ابھی چار گھنٹہ پہلے راجہ زندہ تھا۔ اس نے مجھ سے مدھم سی آواز میں تین پہیوں والی سائیکل لا دینے کی فرمائش کی تھی۔ اور سامنے کی روشندان کی طرح اسکی آنکھیں کھلی تھیں اور لوبان جل رہا تھا۔ ناک میں بُو پہونچی تو میں نے کنکھیوں سے اس کمرے کی طرح دیکھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ بہت دیر سے اندھیرے میں بیٹھا ہوں۔ میری نگاہوں نے بجلی کی سوئچ کو ٹٹولا۔ اور پھر میں اٹھ کر سوئچ کی طرف بڑھا۔ ہاتھ سوئچ کی طرف بڑھایا۔

"بتی مت جلاؤ" اس نے سرگوشی کی۔

اس نے میرے دل کی بات کہہ دی تھی۔ اس وقت میں روشنی سے ڈر رہا تھا۔ جیسے روشنی مجھے ننگا کر دے گی۔ مادر زاد ننگا۔ اور راجہ کی ماں مجھے یوں ننگا دیکھ کر مجھے پھاڑ کھائے گی۔ وہ کہے گی۔

"بے شرم بے حیا"

"ننگے ۔ ننگے"

میرا ہاتھ سوئچ پر سے لوٹ آیا۔

"مگر یہ اندھیرا کب تک مجھے بچائے رکھے گا۔" میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے مخاطب ہوا۔ وہ کچھ نہیں بولا۔ میں گھٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگا۔ وہ میری بے بسی کو خوب جانتا تھا لیکن خاموش رہا۔ میرے ان اندھیروں کو۔ میری اس تنہائی کو صرف ایک روشن دان تھا جو تکے جا رہا تھا۔ کمرے کی دیوار کا روشندان۔

یہ روشندان سات سال پرانا ہے کیونکہ بانو کے شکم میں راجہ سات سال پہلے آیا تھا۔ تب ہی سے مجھے لگنے لگا تھا جیسے کوئی چیز برابر ہر وقت ہر جگہ مجھے گھورے جا رہی ہے۔ تب میں نے اس سے کہا تھا۔ بہت مجبور ہو کر کہا تھا۔

"تم ایک بار نہیں کئی بار یہ جان چکی ہو کہ مجھے تمھارے عقیدے وغیرہ سے کوئی غرض نہیں۔"

"لیکن۔" وہ ہچکچاہٹ کے ساتھ بولی اور گھٹ کر رہ گئی۔ اسے میری طرح بولنا نہیں آتا تھا۔ وہ محرّم کے دنوں میں سر سے د قا تھی۔ امام باڑوں کے سامنے نوحے پڑھتی تھی۔ میری ریشہ دوانیوں پر کب وہ جیت سکی تھی۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔" میں برہم تھا اور بھی تیز ہو کر بولا "میں نے تم سے محبّت کی، شادی کی یعنی اس بات کا اقرار کیا کہ ہمارے جو بچّے ہوں گے وہ میری پناہ میں رہیں گے ہم ایک دوسرے کا دکھ سکھ بانٹیں گے اور بس۔"

"میں کب کہتی ہوں۔" وہ دھیرے سے بولی۔ "لیکن اماں اسے نہیں مانیں گی"

"ان سے کہہ دو کہ میں خدا کو نہیں مانتا ہوں مذہب کو ایک غیر ضروری چیز

سمجھتا ہوں۔"

"ایسی باتیں نہ کیجئے آپ میرے خاندان میں بدنام ہو جائیں گے۔"

"پرواہ نہیں۔" میں بولا۔ "میں نے تم سے شادی کی ہے، تمہارے عقیدے سے نہیں، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں، مجھے اپنے ماں باپ کے مذہب سے بھی کوئی لگاؤ نہیں۔

"اور ہمارے بچے۔" وہ شرم سے سرخ ہوتے ہوئے گردن جھکا کر بولی۔

"ان کا بھی ہم نے ٹھیکہ نہیں لیا ہے۔" ہمارا فرض ان کی نگرانی کر کے انہیں بڑا کرنا ہے، اس کے بعد وہ خود راستہ ڈھونڈیں گے۔ فیصلہ کریں گے وہ کیا مانتے ہیں کیا نہیں مانتے یہ ان کا اپنا معاملہ ہوگا۔"

نہیں۔ شاید امّاں کو اس کا بڑا دکھ ہوگا۔ وہ انہیں شیعہ دینیات ضرور پڑھائیں گی۔؟

"اگر میری ماں سنّی دینیات کے لیے بضد ہوں تو۔" وہ کچھ نہیں بولی۔

میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ میں نے اپنے کو سنبھالا۔

"چلو چھ سال کیوں نہ وہ دونوں ہی دینیاتوں کو پڑھ لیں۔ سمجھدار ہو کر تو پھر وہ وہی کریں گے جو ان کی مرضی ہوگی۔" اور تب ہی میں نے اسے بڑا زوردار قسم کا الٹی میٹم دیا تھا۔

"ایک بات صاف سمجھ لو بانو ہم اپنے بچوں میں کوئی زہر نہیں بوئیں گے۔ میں اپنی محبت کے بدلے میں صرف اتنا ہی مانگتا ہوں۔"

بڑے تیور سے وہ فلمی قسم کا مکالمہ میں نے ادا کیا تھا۔

اور آج کی رات جبکہ راجہ کو پیدا ہوئے سات سال ہو چکے ہیں جبکہ اسے مرے چار گھنٹے گذر چکے ہیں اور یہ روشندان مجھے ٹکٹکی باندھے تکے جا رہا ہے۔ محض مکالموں سے کام نہیں چلے گا کیونکہ وہ برابر میرے پیچھے لگا ہے، مجھ سے اسلئے سیدھے سوال کر چکا ہے۔ اس وقت بھی میرے قریب بیٹھا ہے اور مجھ سے پوچھ رہا ہے۔

"ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو۔"

"یہ شیعہ سنّی کا کیا چکر ہے؟"

"صرف اتنا کہ میں نے ایک شیعہ لڑکی سے شادی کی ہے محبّت کی ہے جبکہ میرے ماں باپ سنّی ہیں اور میں خدا تک کا منکر ہوں۔"

"اور لڑکی؟"

وہ عورت ہے جاہل ہے کٹّر ہے خدا اور قیامت پر یقین رکھتی ہے۔"

"لیکن اس سے فرق کیا پڑتا ہے۔ میرا مطلب ہے تمھارے لیے کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر وہ شیعہ نہ ہو کر ہندو ہوتی تب بھی کیا فرق پڑتا؟"

"کچھ نہیں۔"

"اور اگر وہ عیسائی، سکھ یا اسی طرح کی کوئی اور چیز ہوتی تو بھی تمھارا مسئلہ تو شائد یوں ہی رہتا۔"

"میرا مسئلہ؟ میرا کون سا مسئلہ؟..... میں نے گھبرا کر اس سے نگاہیں ملائے بغیر پوچھا تھا۔

"وہی" یہ کہہ کر اس بار وہ مسکرایا۔ میرے بچّے کی لاش پڑی تھی اور وہ مسکرا رہا تھا۔ اس مسکراہٹ کے لیے یقیناً اس کو بڑی ہمت کرنا پڑی ہوگی۔

"بُرا نہ مانو تو کہوں۔"

"کہو۔" میں اندر سے کانپ گیا لیکن وہ میری آنکھوں میں دور تک دیکھتے ہوئے بولا۔ "وہی مسئلہ جس کے سبب پچھلے کئی گھنٹوں سے تمھارے بچّے کی لاش پڑی ہے اور تم بے دست و پا بیٹھے ہو۔"

میں نے نفرت سے اس کی طرف سے منہ موڑ لیا۔

مانک پور کی یہ رات جو میں اپنے وطن سے دو سو میل دور رہ کر کاٹ رہا تھا شائد وہ نہ ہوتی اگر میرے گھر پر میرے خاندان کے بیچ گزرتی۔ میں اس ذہنی کرب سے بچ جاتا۔ باہر کے کمرے میں بیٹھا رہتا۔ راجہ کی دادی سب کچھ کر دیتیں۔ راجہ کیسے نہلایا گیا، کون غسل ہوا، کون سی آیتیں پڑھی گئیں، کیسے کفن سلا، کیسے قبر میں اتارا گیا سب کچھ ماں کرتی، بانو کی ماں اس وقت کیا کہتی مجھے نہیں معلوم میں ایک دکھی باپ جس کی اولاد مر گئی ہو آنے والوں کے پُرسے سنا کرتا۔ موت کی تفصیل بتاتا ہوتا صرف دو سو روپے ماں کے ہاتھ میں رکھ کر تمام الجھنوں سے سبکدوش ہو جاتا۔ پھر وہ مجھ سے اس طرح کے الٹے سیدھے سوال نہ کرتا۔ لیکن ایسی حالت میں راجہ کی لاش کو میں وطن بھی تو نہیں لے جا سکتا تھا۔ چھوٹے سے اس قصبہ میں ٹیکسی نہ لاری۔ ڈاک کے ذریعہ خاندان والوں کو اطلاع کر دی تھی۔ لیکن کوئی بھی دوسرے دن سے پہلے نہیں پہونچ سکتا تھا۔

ایک رات، ایک دن اور پھر شام۔ آخری رسوم کو اس سے پہلے ہونا تھا۔

جلد سے جلد ورنہ لاش خراب ہوسکتی تھی۔ بانو ماں تھی بڑی مشکل سے اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر مجھ سے کہا تھا۔

"دیکھو تم نے ہمیشہ من مانی کی ہے۔ مگر اب میری ایک بات مان لو۔ یہ راجہ کی نہیں میری لاش ہے، اُسے یہ سمجھ کر دفناؤ جیسے مجھے دفنا رہے ہو" اور پھر وہ مجھ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں بھی رو پڑا۔ میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ اور اسی لیے دل میں ایک خوف لئے اپنے کو اندھیرے میں چھپائے بیٹھا تھا تاکہ روشنی میں وہ میرے دل کے خوف کو پہچان نہ لے۔

میں قسمت کو نہیں مانتا لیکن اتفاقات کو مانتا ہوں۔ پوری بستی میں تین شیعہ گھر تھے۔ جن سے میں مدد لے سکتا تھا۔ جو راجہ کو اسی عقیدے کے مطابق دفن کر سکتے تھے جیسا کہ میری بیوی چاہتی تھی۔ میں بستی میں اجنبی ضرور تھا۔ لیکن میں ان تینوں گھروں میں گیا۔ ان سے بتانے کہ میرا لڑکا مر گیا ہے۔ اس کی تجہیز و تکفین میں میری مدد کیجئے۔ میرا ارادہ تھا کہ میں ان لوگوں کو اپنے گھر بلا کر لاش کو دفن کراؤں گا۔ ان میں سے کسی بڑے کے ہاتھ میں دو سو روپے رکھ دوں گا اور وہ سارا انتظام کر دیں گے۔ لیکن جب میں ایک گھنٹے کی تلاش کے بعد گھر واپس لوٹا تو میرا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ ایک ایسی پسپائی تھی ایک تھکن تھی جس کی شکایت میں کسی سے نہیں کر سکتا تھا۔ روح کے کچھ تجربے ہمارے اپنے ہو جاتے ہیں ان کا ساجھے دار کوئی نہیں ہو سکتا۔ سوچا تھا یہ بات بانو سے کہہ دوں گا۔ گھر پہونچا تو پاس پڑوس کی عورتیں بانو کے پاس بیٹھی تھیں۔

میں مردہ قدموں سے اپنے کمرے میں اندھیرے میں جا کر پھر بیٹھ گیا۔ اس کا

میرا بڑا پرانا ساتھ تھا۔ وہ میری کمزوریوں کو خوب جانتا تھا۔ لیکن اس بار وہ ہمیشہ سے زیادہ حربے استعمال کر رہا تھا۔ میری آنتوں میں رینگتے ہوئے بولا۔

"تو اس کے مطلب یہ ہوئے کہ زندگی ہو یا موت پیسے کے علاوہ بھی کچھ ہونا چاہیئے۔"

"کیا مطلب۔" میں نے مری سی آواز سے پوچھا۔

"مطلب یہ" اس کا لہجہ اداس تھا "کہ تمھارے پاس دو سو روپے موجود ہیں لیکن پھر بھی تم بے بس ہو، لوگوں کے گھروں کی کنڈیاں کھٹکھٹاتے پھر رہے ہو۔

"دیکھو میں بہت پست ہو گیا ہوں" میں نے خوشامد کی "خدا کے لیے مجھ پر یوں تیر نہ چلاؤ۔"

"کیا تم مجھ سے ڈرتے ہو؟" یک بارگی وہ پوچھ بیٹھا۔

"میں تم سے بہت ڈرتا ہوں۔ اور نہیں بھی ڈرتا۔ تم کمینے ہو، سفاک ہو، دوسری بات یہ کہ تم مشین کی طرح ٹھنڈے ہو موقع نہیں دیکھتے، برا بر کچوکے لگائے جاتے ہو، میرا لڑکا مر گیا ہے، بانو راجہ کا جنازہ اپنے عقیدے کے مطابق اٹھانا چاہتی ہے وہ اس کی آخری رسوم اس شکل میں دیکھنا چاہتی ہے جس میں اس کے گھر کے دوسرے مردے اٹھے تھے۔

"شکل؟" وہ مسکرایا "کیا کوئی ایسا آدمی ملا جو بانو کے عقیدے کے مطابق بچے کی تجہیز و تکفین کرے۔"

"نہیں اتفاق سے تینوں گھر کے مرد بستی میں موجود نہیں، ایک ہے لیکن وہ بیمار ہے۔ میں قسمت کو نہیں مانتا لیکن اتفاق کو مانتا ہوں۔"

"اچھا بانو اگر ہندو ہوتی اور وہ اپنے بچے کی آخری رسوم اس شکل میں دیکھنا چاہتی جس میں اس کے گھر کے دوسرے مُردے اٹھے تھے تو تم کیا کرتے؟"

"میں راجہ کو۔"

"تم راجہ کو جلا دیتے ہے نا؟؟" اس نے بیچ میں میری بات چھین لی۔

"شکلوں کا معاملہ ہی کچھ ایسا ہو۔ پارسی اپنے مُردوں کو Tower of silence میں رکھ آتے ہیں، انگریز دوسری طرح سے دفن کرتے ہیں، زمین پر ہزاروں شکلیں ہیں، اس کرۂ عرض پر الگ الگ انسان نے نہ جانے کتنی رسوم میں کتنی شکلوں میں اپنی زندگی موت، شادی بیاہ اور زندگی کرنے کا اظہار کیا ہے۔"

"تم کوئی اور بات نہیں کر سکتے۔ یا کچھ دیر خاموش نہیں رہ سکتے۔"

لیکن وہ نہیں مانا۔ تب اس نے مجھے بتایا کہ سمندر کے سفر میں جہاں زمین نہیں ہوتی خواہ کسی رسم کا ماننے والا ہو لاش کو سمندر کے سپرد کرنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے اور مچھلیاں اُسے کھا جاتی ہیں، لیکن زمین پر۔

شکل، شکل، شکل!!!

اور تب ہی اس نے یہ پوچھا تھا۔؟

"لیکن مان لو بانو تمہارے ہی خاندان کی ایک لڑکی ہوتی تمہاری ہی طرح وہ بھی کسی خدا اور کسی جہنم پر یقین نہ رکھتی تم عدالت کے سامنے اس سے شادی کا اقرار کرتے فرض کرو اس بانو کا راجہ آج یوں مرا پڑا ہوتا تو تم کیا کرتے۔؟"

میں کچھ نہیں بولا۔

لیکن وہ میرے پیچھے پڑ گیا تھا۔ پیٹ میں پڑے ہوئے کیچوؤں کی طرح

وہ میری ہر غذا کا ساجھے دار تھا۔ اس کو رینگنے کی عادت تھی۔ آنتوں میں چمٹے رہ کر اس نے میری عمر پائی تھی۔ وہ ایک Foreign Body تھا جو بس کیچوے کی طرح میرے اندر پلا بڑھا تھا اور میری ہر خوراک پر قبضہ جمائے تھا جب رینگتا تھا ایک Foreign Body کے روپ میں جب اپنے وجود کو منواتا تھا تو مجھے بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ میں درد سے تڑپ اٹھتا تھا کیونکہ وہ اپنے وجود کو میرے اندر گھسے رہ کر منوانا چاہتا تھا۔ میں اس کی شخصیت کے اس راز سے واقف تھا اور مجبور تھا۔ اس وقت بھی وہ مجھے درد سے تڑپا رہا تھا۔ یعنی اندر ہی اندر رینگنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"بولو تم جو کسی شکل کو نہیں مانتے۔ اس وقت تم کون سی شکل اپناتے؟"

"میں کچھ نہیں بولا۔"

"کیا تم راجہ کو جلا دیتے؟"

"——"

میرا مطلب ہے کیا بانو بھی اسے جلانے کے لیے تیار ہو جاتی۔ اس لیے کہ عورت زیادہ Conservative ہوتی ہے۔ ممکن ہے تم وقت کی مروّجہ شکلوں میں ایک نئی شکل کا اضافہ کرتے۔ یعنی تم کوئی نئی بات سوچتے۔ تم راجہ کی لاش کو محض گھورے پر پھینک کر ہی مطمئن ہو جاتے۔

"بکواس مت کرو۔" میں تلخی سے بولا۔

"سنو۔" اس کا لہجہ کچھ نرم ہو گیا۔

"میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔ میں تلخی سے بولا۔ لیکن وہ نہیں مانا کہنے لگا۔

"دیکھو ساری بات یہ ہے کہ تم مجھ سے ڈرتے ہو۔"

"تم کیچوے ہو اور کیچوؤں سے مجھے گھن آتی ہے۔" میں نے اپنا غصہ دبا کر جواب دیا۔

"نقصہ یہ ہے۔" وہ حرامزدگی پر تلا ہوا تھا کہ خداؤں سے انکار کر دینا بڑا آسان ہے لیکن راجہ کو، امن کی حالت میں (اس لیے کہ جنگ میں سب ممکن ہے) گھوڑے پر پھینک دینا بڑا مشکل ہے۔"

"میں کہتا ہوں چپ رہو۔" میں چیخ اٹھا۔

"میری جان۔" وہ بڑی نرمی سے گویا ہوا "کیا تم جانتے ہو کہ سنّی مسلمان اپنے مردے کی تجہیز و تکفین کیسے کرتے ہیں؟"

"نہیں۔"

"اور شیعہ مسلمان۔"

"نہیں۔"

"تم تو شاید غسلِ میّت بھی نہیں جانتے ہو گے۔"

"نہیں۔"

"اور فاتحہ۔"

"بچپن میں سیکھا تھا اب بھول گیا۔"

"اور ان سب کے لیے تکفین کرانے کے آدمی چاہیئے۔" وہ بہت زور سے ہنسنے والا تھا کہ بانو کا خیال کر کے رک گیا۔ برابر ہی کمرے میں بانو عورتوں کے پاس رو رہی تھی۔

"دیکھو بانو کو بکنے دو' اگر تم میں ہمّت نہیں ہے تو میں ہی تمھاری کچھ خدمت کیے دیتا ہوں' میں چپکے سے راجہ کی لاش لیے جاتا ہوں' کندھے پر لادلوں گا۔ چپکے سے میونسپلٹی کے کسی گھورے پر پھینک آؤں گا۔"

"مجھے میرے حال پر چھوڑ دو یار۔"

لیکن وہ کہتا رہا "ایک آدھ روز میں جب لاش سڑ جائے گی تو جمعدار کسی مہتر سے اٹھوا کر بستی سے باہر پھنکوا دے گا۔"

وہ اتنا بچّہ نہیں تھا کہ اس فرق کو محسوس نہ کر پاتا۔

تجہیز و تکفین کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ پھر وہ مذہب کی دھمکی کیوں دے رہا تھا۔ اس کا نام لے لے کر کیوں ڈرا رہا تھا۔ خدا کا منکر ہوتے ہوئے بھی بہر حال مجھے اپنے بچّے کی لاش کو باعزّت طور پر ٹھکانے لگانا تھا۔ کسی ایسی شکل میں جسے دل قبول کرے۔ یہ میرا المیہ نہیں تھا کہ لاش کس طرح سے ٹھکانے لگائی جائے۔ میری الجھن تو یہ تھی کہ.....

"تو پھر بولو کیا فیصلہ کیا؟ جن آدمیوں کو تم ڈھونڈھنے گئے تھے' وہ کرائے کے آدمی تو تم کو ملے نہیں۔" اور تب میں نے اس سے بتادیا کہ یہی میری مجبوری ہے۔

"تو پھر تم اپنی بیوی کو سمجھا کیوں نہیں دیتے۔ کہہ دو کہ جو کچھ وہ چاہتی ہے وہ ممکن نہیں۔ پڑوسیوں کو بلواؤ ——— وہ تمھاری مدد کریں گے۔ میرا مطلب ہے کہ سنّی پڑوسی۔"

اس روز سب کو معلوم ہوگیا کہ مجھے ان سب کی ضرورت تھی۔ انھوں نے میرے بچّے کو نہلایا دھلایا۔ کفن سلوایا۔ اسے لپیٹا۔ لوبان، کیوڑا اور کوری چٹائی

لائی گئی۔ آیتیں پڑھی گئیں۔ وہ یہ سب کرتے جاتے اور مجھے دیکھتے بھی جاتے۔ راجو کو قبر میں اتارتے اتارتے وہ میرے بارے میں بغیر میرے بتائے ہی سب کچھ جان چکے تھے اور مجھے ذلیل کر چکے تھے۔ اپنے ایک ایک عمل سے انھوں نے ظاہر کر دیا تھا کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں خدا ترسی کے ناطے کر رہے ہیں وہ جیسے کہہ رہے ہوں۔

"دیکھو تم کتنے کمینے ہو، کس قدر غلیظ ہو لیکن ہم اپنی ناکوں پر کپڑے باندھ کر تمھارے غلیظ بدن میں پڑے ہوئے کیڑوں کو نکال رہے ہیں۔ لیکن تم اتنے بڑے احسان فراموش ہو کہ کل سویرا ہوتے ہی ہمارے اس احسان کو بھول جاؤ گے کہ ہم نے تم کو تمھارے آڑے وقتوں پر سنبھالا انھیں سہارا دیا۔ روح کے ایک عذاب سے بچایا۔"

راجو کو قبر میں اتارنے کے بعد جب میں شام کو گھر لوٹا تو کچھ اسی طرح کی بات اس نے بھی مجھ سے پوچھی تھی۔

"فرض کرو اس بستی میں تم اکیلے مسلمان ہوتے، میرا مطلب ہے ظاہری قسم کے مسلمان اور باقی لوگ کچھ اور ہوتے تو پھر تم کیا کرتے ---؟

اور تب میں نے سنجیدگی سے سوچا تھا کہ سارے فساد کی جڑ یہی کمبخت ہے۔ یہ جو مجھے برابر کچوکے لگا رہا ہے اور اذیتیں دے رہا ہے۔ الٹی سیدھی باتیں کر کے چوٹیں مار رہا ہے۔ ایسے سوال کر رہا ہے جو مجھے پریشان کرنے کے لیے کافی ہیں۔ میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ اور آخری بار تصدیق کی کہ اس کا وجود ایک کیچوے کے مانند ہے۔ جو میرے پیٹ میں پیدا ہوتا ہے، اس روز سے جس روز میں نے دنیا میں آنکھ کھولی اور اپنی ماں کا دودھ پیا اسی روز سے یہ میری تمام تر غذاؤ

کا سا بجھے دار رہا ہے۔ جیسے جیسے میں بڑھتا گیا یہ بھی بڑھتا گیا ہے۔ اور اب یہ اتنا بڑا ہو گیا ہے۔ اتنا موٹا اور تندرست کہ میری غذا کا بڑا حصّہ خود کھا جاتا ہے اور مجھے بیمار رکھتا ہے۔ تبھی بچّوں کی طرح میرے دانت کٹکٹاتے ہیں۔ جی متلاتا ہے۔ میں اپنے میں وہ سارے symptoms محسوس کرتا ہوں جو ایسے بچے محسوس کرتے ہیں جن کے پیٹ میں کیچوے پڑ جائیں۔

یہ مجھے میرے اندر بہت دنوں سے Foreign Body کے مانند تنگ کر رہا ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو یہ اندر زخم ڈال دے گا۔ مجھے فوراً جلّاب لینا چاہیئے۔ کیسے بھی ہو اُسے باہر نکال دینا چاہیئے۔ حالانکہ یہ میرے اندر پلا ہے، لیکن باہر کا ہے۔ میرے لیے اجنبی ہے، اس لیے کہ یہ میرا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس کا وجود میرے مقابلے میں بہت حقیر ہے لیکن مجھ سے کہیں زیادہ مستحکم ہے یہ ہر جگہ ہر موقع پر Important بن جاتا ہے مجھ پر غالب آجاتا ہے۔

اسی رات میں نے سوتے میں دیکھا کہ میرے بچھانے میں ایک بڑا سا کیچوا رینگ رہا تھا۔ کاہلی کے ساتھ ادھر ادھر کلبلا رہا ہے اور میں بےحد خوش و خرم اور چاق و چوبند ہو گیا ہوں مجھے کھل کر بھوک لگی ہے۔

دوسرے دن سویرے محرّم کے چاند کی پہلی رات تھی۔ میں اپنی بالکونی پر کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا میرے پڑوسی کے بچّے قصبہ کی بازار سے چھوٹے چھوٹے تازیے خرید کر لا رہے تھے۔

"انسان کیسی کیسی بیوقوفوں میں گرفتار رہے۔" میں نے سوچا۔ "میری بیوی بھی آج امام باڑہ سجائے گی۔ تازیہ رکھے گی۔" اس نے مجھے یہ سوچتے ہوئے شاید

دیکھ لیا۔ میرے پیٹ میں رینگ کر بولا۔

"ایک بات بتاؤ۔ کیا تم تازیے کی بے حرمتی کر سکتے ہو سب کے سامنے۔ پچھو رلما ہے یہ۔"

"کیا بکتے ہو ذلیل۔" میں نے دانت کٹکٹاتے ہوئے اس کے جملے کاٹ دئے۔

"تو پھر تم مجھے صاف صاف بتا دو کہ اگر تمھارے بچے کو جلایا جاتا تو تمھیں کیسا لگتا ہے۔؟"

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ آنسو میری شکست کا اظہار تھے۔ لیکن تب بھی میں نے اس سے یہ نہیں کہا کہ راجہ کی لاش اگر جلائی جاتی تو مجھے بے حد افسوس ہوتا۔ وہ مجھے روہانسا دیکھ کر بولا۔ "شاید تمھاری صحت ٹھیک نہیں۔"

میں اس سے بڑی مشکل سے کہہ سکا۔ میں ایک صحت مند انسان کب ہوں۔ جس کے پیٹ میں تمھارے قد کا کیچوا موجود ہو وہ صحت مند رہ بھی کیسے سکتا ہے؟"

▬ ▬

بیساکھی

چلتے وقت، جو کارڈ اس نے مجھے دیا تھا وہ اب بھی موجود ہے۔ میں چاہوں تو مل سکتی ہوں اس سے لیکن اس سے تو مر جانا بہتر ہے۔ پھر تو ہر طرح سے دل کو سمجھایا تھا میں نے۔ لیکن!

کھٹ!

کھٹ!!

اس طرح میری کنپٹیاں بج رہی ہیں جیسے سنسان راہداری پر کوئی بیساکھیوں کے سہارے چل رہا ہو اور بیساکھیاں ایک سی آواز میں بول رہی ہوں، سپاٹ کرخت اور اکتا دینے والی یکساں آواز میں۔

کھٹ!! وہ کمینگی کی حد تک طاقت ور ہے۔

کھٹ!! میں اپاہجوں کی حد تک کمترین ہوں۔

کھٹ!!! پھر میری زندگی میں بیچ کا کوئی راستہ نہیں۔ سمجھوتے کی کوئی منزل

نہیں ـــ

میں کیسے سمجھاؤں اپنے دل کو، میں کوئی پندرہ سولہ برس کی لڑکی نہیں ہوں جو ابھی ابھی جوان ہوئی ہے۔ جو مرد کی ایک نگاہ التفات سے بےخود ہو جائے اور پگھل کر اس طرح بہہ جائے، جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ بھیا مسیح تم خفا مت ہونا کہ سولی تمھیں صرف اس لیے دی گئی تھی کہ تم نے بہت زیادہ جان لیا تھا کہ کبھی کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ......؟

کھٹ! ایسے کمترین لوگ جن کی کمتری مجھے آسودہ کر سکے مجھے نہیں ملتے۔

کھٹ! سیدھے سادے ڈھرے کے عام جیسے لوگوں سے مجھے نفرت ہے۔

.....کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی کسی پہاڑ پر چڑھ کر چیخ چیخ کر یوں جیسے ان معصوم انسانوں سے کہوں کہ تمھیں کبھی شانتی نہیں ملے گی کہ غم تمھاری چوکھٹ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ اس لیے کہ تم بہت کچھ جانتے ہو، تم روشنی کے چمگادڑ، بے وقوف جاہل، یونہی بھٹکتے رہو۔ تمھارے بانس جیسے سوکھے جسم پر مٹکا جیسا سر جڑ گیا ہے، خدا کے لیے اپنے سر کو چھوٹا کر دو۔ اپنے جسم کے تناسب سے چھوٹا کر دو۔

اب میں کیا کروں کہ مجھے لاج نہیں آتی جوان لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے چار برس کی عمر سے میرے ساتھ کتابیں ہیں، رنگین حرفوں کی، چکنے اور کھردرے کاغذ کی۔ رنگین تصویروں والی موٹی جگادری کتابیں۔ ان کتابوں نے میرے دماغ کی سیکڑوں کھڑکیاں کھولی ہیں کتنے پہرے ہٹائے اور کتنے پہرے بٹھائے ہیں۔ مرد کے جسم میں اور میرے جسم میں کیا فرق ہے۔ مرد عورت کی کون سی ضرورت کو پورا کرتا ہے عورت مرد کو کون سے سکھ دیتی ہے، کوئی سماجی معاہدہ کے بغیر

عورت مرد کے ساتھ سو جائے تو بہر حال IRREGULARITY کہلائے گی اور نہ جانے کیا کیا خاک بلا سیکھا، پڑھا، دیکھا اللہ دُشنا تھا میں نے۔ لیکن میری کنپٹیاں تپنک رہی ہیں۔

کھٹ کھٹ! یہی میرا المیہ ہے۔

کھٹ کھٹ!! یہی میرا المیہ ہے۔

میں ان بیا کھیوں کی آواز کو نیچے سے جُدا نہیں کر سکتی۔ میں صرف ایک بار اس سے ملی تھی۔ لیکن میں اسے بھول نہیں سکتی۔ ہاں میں جو اپنی زندگی کی ۲۶ سال پورے کر چکی ہوں، جس کا جسم اپنے تمام نشیب و فراز بھرپور طور پر نمایاں کر چکا ہے۔ میرا رنگ گورا چٹا ہے۔ میرے رنگ کو بیلے کے پھول کی طرح سفید نہ سمجھا جائے تو اچھا ہے۔ تاج محل کے سنگ مرمر والی بات سے بھی بات نہیں بن پائے گی۔ ریتا میری سہیلی تھی، اس نے میرے رنگ کے بارے میں کچھ ٹھیک ٹھیک بات کہی تھی۔

"کیوں ری تُو تو زیکو سلاوکیہ کی اس چینی کی پیالی کی طرح گوری ہے، جس میں ہلکے رنگ کی دم کی ہوئی چائے ڈالی گئی ہو اور جس کی باریک چینی کے اس پار چائے کا ہلکا ارغوانی رنگ بھی جھلک رہا ہو۔

"اور میری بھویں"

"لَوْلی LOVELY"

"اور میری گردن"

"غضب ہے"

"اور میری ہونٹ؟" میں نے پھر جھک کر پوچھا۔؟ اس بار وہ سمجھ گئی اور مسکرا کر بولی: Trash

○

کھٹ! گھٹ! میری کنپٹیاں اب بھی تپک رہی ہیں۔

میں عورت ہوں۔ اسی گوشت پوست اور اسی دنیا کی عورت۔ میں نے اتنے دنوں شادی نہیں کی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں بغیر مرد کے زندگی کاٹ دینے کا بیڑا اٹھا چکی ہوں۔ میں خانقاہوں کی عبادت گذار باندیوں کی طرح سننے دیکھنے اور چکھنے کی لذتوں کے دروازے، کھڑکیاں بند کر کے رہنا نہیں چاہتی تھی۔ میں زندگی کی ہر لذت سے آشنا ہونا چاہتی تھی۔ میں مرد کے ساتھ سونا چاہتی تھی، کئی مرد میری زندگی میں آئے۔ کچھ نے مجھ سے فلرٹ کیا تھا، کچھ نے مجھ سے شادی کی خواہش کی تھی، کچھ ایسے بھی تھے جو مجھے رات کے کھانے پر اپنی قیام گاہ پر بلانا چاہتے تھے اس وعدے پر کہ وہ سویرے اپنی موٹر سے مجھے گھر تک پہونچا دیں گے اپنی اپنی ہمت کی بات ہے۔

لیکن وہ ہمت نہیں کر سکتا تھا وہ جو بس میں میرے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ [illegible] دعوے کے ساتھ یہ کہہ سکتی ہوں کہ وہ بھی ایک بھرپور مرد تھا۔ وہ کچھ بھی تھا لیکن میری زندگی میں ایسا پہلا مرد تھا جس نے میرے دل کے اندر اس خواہش کو جو [illegible]ی فطری ہے، ابھارا تھا۔ اسے دیکھ کر میں نے چاہا تھا، ہاں میں جھوٹ نہیں [illegible]نا چاہتی تو اسے دیکھ کر میں نے چاہا تھا کہ اس جیسے اس مرد کیساتھ ہی میرا ساتھ [illegible]۔ میں اسے بالکل نہیں جانتی تھی، وہ کون ہے کیا ہے۔ عجیب ہے کہ امیر مجھے کچھ

بھی نہیں معلوم تھا، میں اسکے مزاج، اس کی عادتیں، اس کی پسند ناپسند، کسی
چیز سے بھی واقف نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی میں نے یہ چاہا تھا کہ وہ مجھے مل جائے۔
وہ مجھے اچھا لگتا تھا، اس لیے کہ یہ میرا بالکل ذاتی حق ہے اور نجی حق ہے کہ کوئی
مجھے اچھا لگے۔ ہاں، میں بالکل اس سے کہہ سکتی تھی، اسی وقت کہہ سکتی تھی، جب
اس نے میری ساری کے پلو کو بس کے اندر سیٹ کے ایک لوہے کے ٹکڑے میں پھنس
جانے پر بڑے ہی شائستہ طریقہ سے چھڑایا تھا، میں اس سے بلا جھجک کہہ سکتی تھی۔
"کیا تم پسند کرو گے کہ میں تمہارے بچوں کی ماں بن سکوں؟"
کیونکہ اس کے علاوہ اور جو کچھ کہا جاتا ہے وہ سب معمولی قسم کا سچ ہوتا ہے،
کیونکہ عورت بیوی بہت کم دنوں رہتی ہے۔ ماں ہمیشہ رہتی ہے — میں اس سے
سب کچھ کہہ سکتی تھی۔ لیکن وہ — میں نے دیکھا اس نے اپنے گھٹنوں پر ایک
کمبل ڈال کر اپنے پیروں کو چھپا رکھا تھا۔ لیکن اس طرح کمبل ڈال کر کوئی کسی کو لوٹ
نہیں سکتا۔ وہ ان دو بیساکھیوں کو نہیں چھپا سکتا جو اس کی سیٹ کے قریب
ہی اس کے پہلو میں رکھی تھیں۔ اس کی عمر ۳۰ سال سے زیادہ نہ ہو گی۔ وہ یقیناً
مجھ سے زیادہ پرکشش تھا۔ تندرست تھا؟ جو بیساکھیوں کے سہارے چلتا ہے
اس کی تندرستی ہی کیا، لیکن بہرحال اس کا سینہ کشادہ تھا۔ کھلا ہوا تھا۔ اسکے
ہاتھ میں ہومر کی شاعری تھی۔!
ایک اٹیچی، ایک ایئر بیگ، تھرماس اور ایک کیمرہ۔ یہ کل سامان
اس کے کلاس کا سائن بورڈ بن گیا تھا۔ میرے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ کتنی دیر
میں اس کے برابر دوسری سیٹ پر خاموش بیٹھی تھی۔ وہ مجھے چونکا ہوں سے

تک رہا تھا۔

"اس طرح کیوں دل ہی دل میں گھٹ رہے ہو بھئی، اپنے خول سے باہر نکلو، کچھ باتیں کرو، کچھ آپ بیتی، کچھ جگ بیتی۔ کیا سارے سفر یونہی کاٹے جاتے ہیں" بار بار جی چاہ رہا تھا کہ یہ بات اس سے کہہ دوں۔

لیکن وہ کمزور تھا۔

اس لیے بزدل تھا۔

میرا ذہن کسی جگاڑی قسم کے جرمن فلسفی کی ایک بات کی طرف بھٹک گیا کہ اخلاق دو طرح کے ہوتے ہیں، غلامانہ اخلاق اور آقائی اخلاق۔ پہلا اخلاق دائیں گال پر تھپڑ کھا کر بایاں گال بھی پیش کر دیتا ہے اور آقائی اخلاق وہ ہے جو دوسری طرف کے گال پر بھی تڑاخ سے ایک تھپڑ جڑ دے۔ ایک تھپڑ مارنے کے لیے ہے اور دوسرا تھپڑ کھانے کے لیے۔ تو بھئی تکلف کس بات کا ہے آؤ یہی کھیل کھیل لیں تم اپنا بایاں یا دایاں کوئی بھی گال پیش کر سکتے ہو۔

میرے جی میں آیا کہ اس سے کہوں، لیکن جی میں آنے والی بات تو بعد میں بھی بتائی جا سکتی ہے، سیدھی بات یہ ہے کہ وہ اپنے پیروں پر اگر چل سکتا تو اپنی خوبصورتی، اپنے بانکپن اور اپنی جوانی کے گھمنڈ میں چور ہوتا اور اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے وہ طرح طرح سے مجھے snub کرتا، دل ہی دل میں کڑھاتا لیکن وہ بیساکھیوں پر چلتا تھا۔ اپنے دونوں پیروں سے معذور تھا اسلیے غلامانہ اخلاق کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

" دیکھو۔ کیا تم زندگی بھر اکیلے رہو گے؟"

"میرا مطلب ہے کیا ان لکڑیوں کی بیاکھیو ںکے علاوہ کوئی اور نرم و نازک کندھا تمھیں نہیں مل سکتا؟"

میں یہ دونوں باتیں بھی اپنے جی میں ہی سوچ کر رہ گئی۔ عورت بھی تو انسان ہے بے جان لکڑی نہیں۔ کوئی بھی ہو، کب تک بوجھ اٹھائے پھرے گی، آخر کو ایک دن تھک جائے گی۔

"دیکھو ڈیئر، تم ایسی غلطی مت کرنا کیونکہ وہ غریب اگر تھک گئی تو تم دھڑام سے گر پڑو گے۔"

میں اسے صلاح دینا چاہتی تھی لیکن ایک خیال میرے دل میں اور بھی بجلی کی طرح گذر گیا۔ ہو سکتا ہے کہ شادی اس کی پہلے سے ہو چکی ہو اور اس کے مقصد اس کے پیروں پر یہ آفت آئی ہو، تو لگے ہاتھوں یہ بات صاف ہی کیوں نہ کر لی جائے، مجھے اس میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ دھیرے سے ایک بار اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور مخاطب ہوئی۔

"سُنئے۔"

"جی۔ جی فرمائیے۔" وہ یکبارگی ہڑبڑا گیا (مجھے بڑا اچھا لگا)

"آپ کی مسز کا نام للتا کپور تو نہیں؟"

"جی۔" وہ ہنسا "معاف کیجیے گا، میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔"

"اوہ۔"

چلئے یہ بات بھی صاف ہو گئی۔ میں اپنے آئندہ اقدام کے لیے کچھ سوچ ہی رہی تھی کہ میری گود میں پڑی ہوئی انگریزی میگزین کی طرف اشارہ کر کے وہ بولا۔

"کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟"

"اوہ شیور۔" میں نے مسکراتے ہوئے وہ میگزین اس کی طرف بڑھادی۔ مجھے خوشی ہوئی کہ میں نے اس کی ہمت افزائی کی تھی۔ اور اب وہ دھیرے دھیرے بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ حجاب ٹوٹ رہے تھے، میرا جی چاہنے لگا کہ میں اس سے ہمدردی کروں۔ اس کی دلجوئی کروں تاکہ زندگی کے چند لمحے ہی وہ اعتماد کے ساتھ گزارے۔ یہی اعتماد اُسے آسودگی بخشے گا۔ میں چاہ رہی تھی کہ میں اپنے کو زیادہ سے زیادہ حقیر ثابت کروں تاکہ اسے زیادہ سے زیادہ اپنی برتری کا احساس ہی آسودگی ہے۔

"مجھے ایسا لگتا ہے۔"

"جی؟" میں اس کی آواز پر چونک پڑی۔

"جی میں کہہ رہا تھا کہ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں نے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے پھر اپنی نگاہیں میگزین پر گاڑدیں اور جملہ پورا کیا "لیکن یاد نہیں آتا کہاں دیکھا ہے۔"

"شاید آپ نے مجھے لکھنؤ کے میڈیکل کالج میں دیکھا ہوگا۔"

"میڈیکل کالج ــــ وہ کچھ چونک سا پڑا۔

"جی ہاں۔ میں وہاں اپنے داہنے ہاتھ میں بجلی لگوانے جایا کرتی تھی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔"

"اچھا۔ لیکن ہاتھ میں تکلیف کیا تھی؟ اس نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ میں اداس ہوگئی اور آہستہ سے بولی۔"

"برسوں سے سن ہو گیا ہے، جیسے فالج گر گیا ہو۔ کوئی کام نہیں کر سکتا۔"

"اوہ ویری سیڈ۔" وہ کچھ فکر مند ہو کر بولا۔

"Bravo" میں نے دل میں مسرت کے ساتھ ایک نعرہ لگایا۔

"دیکھو دوست اگر تمھارے اندر ذرا بھی شرافت ہے تو زندگی بھر میرے اس احسان کو یاد رکھو گے کہ بس پر تمھیں ایک خوبصورت اور جوان لڑکی ملی تھی جس نے تمھیں شاید پہلی بار اپنے وجود سے باہر نکل کر دوسروں پر رحم کھانے کا موقعہ فراہم کیا تھا۔ دیکھئے نا میری جھوٹی اداکاری کتنی عظیم ہے لیکن میں آپ سے کیسے کہوں حضرت کہ انسان کتنی جلد بہل جاتا ہے کہ ایک چھوٹا سا بہانہ اسکے غم اور اس کی محرومیوں کو کس قدر کم کر دیتا ہے۔ جیسے جیسے آپ مجھے کمتر محسوس کریں گے آپ کی برتری کا احساس آپ پر چھاتا جائے گا اور پھر حضور والا ویسے ہی آپ میں آقائی اخلاق کے جوہر نمایاں ہوتے جائیں گے اور پھر سرکار میرے آپ کی ہتھیلی میں میرے بائیں یا دائیں گال پر طمانچہ مارنے کے لیے کھجلی ہونے لگے گی۔ کہیے تو یہی باتیں میں آپ سے کہہ دوں؟"

لیکن — ؟ لیکن کیا ؟ کیا میں یہ سب کچھ اس سے کہہ کر سارا کھیل بگاڑ دیتی۔ میں نے دل ہی دل میں جھومتے ہوئے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے پیروں پر پڑے ہوئے کمبل کو اور احتیاط کے ساتھ پیروں پر سنبھال لیا تھا۔ ہماری بس ابھی ابھی کسی چھوٹے سے اسٹیشن پر رک کر پھر چل دی تھی۔ موسم بڑا ڈھیٹ قسم کا تھا۔ سفر جب ناٹک میں تبدیل ہو جائے اور کسی واقعے کا جز بن کر رہ جائے، تو اس کی کوئی دوسری تفصیل یاد بھی نہیں رہتی۔ میں نے دوسرے

مسافر بھاگتے ہوئے درخت اور راستے، پرانے مسافروں کا اترنا نئیوں کا چڑھنا، پیٹرول کی بُو۔ لوئر درجے میں پیچھے بیٹھے ہوئے لوگوں کے فقرے۔ یہ سب ایسی سپاٹ قسم کی بے معنی حقیقتیں تھیں جو مشاہدہ کی گرفت سے آزاد تھیں۔ ذہن پوری یک سوئی کے ساتھ ایک ہی سمت لگا ہوا تھا ـــــ ہاں ان بیساکھیوں کے جوڑے کا رنگ آج بھی مجھے یاد ہے۔

میں نے جو پھلجھڑی چھوڑی تھی اس پر وہ منتظر تھا۔ گمبھیر سے لہجے میں بولا۔

"امریکہ میں اس طرح کے امراض کا علاج ممکن ہے، لیکن افسوس کہ ہر شخص کے ذرائع ایسے نہیں ہو سکتے۔"

"اچھا کیا امریکہ میں یہ ممکن ہے"؟ میں نے بناوٹی حیرت ظاہر کی۔

"بالکل۔ لیکن اس کے لیے خرچ تو آپ جانتی ہی ہیں۔"

"وہ تو خیر ہو سکتا ہے۔" میں لاپرواہی سے بولی۔

"اگر آپ کے ذرائع ہیں۔" اس نے دلچسپی لی "تو ضرور جائیے، ایک بار اگلے ایک دو ماہ میں، میں بھی جا رہا ہوں۔ شاید میں آپکے کچھ کام آسکوں۔"

"آپ!" میں نے گویا حیرت کا اظہار کیا۔

"جی ہاں۔ میرا مطلب ہے آپ کسی کو ساتھ نہ بھی لے چلیں تو بھی آپ کچھ ہفتہ وہاں بے فکری سے قیام کر سکیں گی۔ میں آپ کو ہر ممکن آسانیاں مہیّا کرا سکوں گا۔"

"اوہ۔ شکریہ۔"

"کیا یہ سچ نہیں؟"

"کیا؟"

یہی کہ کبھی کبھی ہم دوسروں کا دکھ دیکھ کر اپنا دکھ بھول جاتے ہیں۔"

اور........

"اور کیا؟" ———— "میرے دل نے اجازت دے دی۔"

اور دیکھو نا ذرا سی دیر میں وہ کس قدر ہمدرد بن گیا تھا۔ کاش فطرت نے اس کے ساتھ یہ ظلم نہ کیا ہوتا تو میں اس سے پوچھتی۔

"تم کیا کرتے ہو؟"

"کیا نام ہے تمھارا؟"

"آؤ کسی دن ہمارے یہاں؟"

مجھے یقین تھا، میں اسے اپنے قریب لے آتی اور شاید ہم دونوں دوبارہ پھر کہیں ملتے یا ملنے کا وعدہ کرتے، ایک دوسرے کو سمجھتے۔ راستہ کی یہ ملاقات ہمیں ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے ملا سکتی تھی۔ لیکن مرد کی تلاش میرا مسئلہ نہیں تھا۔ میرا دکھ تو میں خود تھی۔ سیدھی سی بات تھی کہ ایک مرد مجھے اچھا لگا تھا اور ٹریجیڈی یہ تھی کہ وہ بیساکھیوں پر چلتا تھا اور صرف اتنی سی بات پر میں اپنے تمام تر علم احساسات اور جذبات کو بروئے کار لا رہی تھی۔

اسی سب سوچنے کے دوران میں نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بے توجہی سے کھڑکی کے باہر کچھ دیکھ رہا تھا۔ باوجود تمام باتوں کے میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے بچپن ہی میں ہمارے بزرگوں نے ہمیں ایک دوسرے کے لیے مانگ لیا تھا۔

ٹھیک تو ہے، میں اگر اس کی منگیتر ہوتی ــــــ ؟ سیدھی سادی، خاموش سی ایک لڑکی سنسار کے سارے زہر کو چپکے سے پی جانے والی کوئی گمبھیر لڑکی تو ــــ ؟

میں چپکے سے سب کی نظریں بچا کر اس کے کمرے میں آتی، اس کے سرہانے بیٹھ جاتی، اس کے سر کو اپنی گود میں لے لیتی، اس کے ماتھے پر آئے ہوئے بالوں کو اپنی انگلی سے سنوارتی اور جب وہ بیساکھی کے سہارے چلنے کی کوشش کرتا تو انھیں اس کے بغلوں سے نوچ کر پھینک دیتی۔ اس کو اپنے پہلو میں کھڑا کر کے اس کے ایک ہاتھ کو کھینچ کر اپنے کندھوں پر رکھ لیتی اور کہتی۔

"آؤ، میرے سہارے چلو، میں تمھیں جہاں کہو لے چلوں۔ مجھے اپنی بیساکھی بنا لو۔ ڈال دو اپنا سارا بوجھ میرے اوپر۔ عورت نے ہمیشہ یہی کیا ہے۔ مرد کا سارا بوجھ اس سے مانگ لیا ہے۔ میرے بالوں میں مہک ہے جو تمھاری سانسوں کو کیف بخشے گی۔ میرے کندھوں میں گرمی بھی ہے اور نرمی بھی۔ یہ مہکتی ہوئی نرم سی بیساکھی تمھیں زیادہ آرام دے گی۔"

لیکن یہ تو بات ہی دوسری ہو گئی۔ یہ نقطۂ نظر ناممکن نہیں، لیکن میرے یہاں ایسا کوئی جذبہ کام نہیں کر رہا تھا۔ مجھے اس سے ہمدردی تھی، صرف ہمدردی۔ ایسی ہمدردی جو میری جانکاری میرے علم نے پیدا کی تھی، جو دوسروں کے دکھوں کو اپناتی نہیں، جو صرف تجزیہ کرتی ہے اور اس تجزیہ کی لذت میں ایک خاص طرح کا لطف لیتی ہے۔ مجھے اس پر پیار آیا تھا اس لیے کہ وہ کمزور تھا، بہت کمزور تھا ــــــ وہ اتنا کمزور کیوں تھا ؟

شائد میں اس طرح اس کا دکھ بھلانا چاہتی تھی۔ (بکواس)

کیا اس طرح کسی کا غم کسی کا دکھ کم ہوا ہے؟ (چھی چھی)

ایک بارگی میرے کانوں میں آواز آئی۔

"لیجیئے محترمہ آپ کی میگزین۔" اور انھیں خیالات کی رو میں، میں نے اپنا ہاتھ میگزین کی طرف بڑھا دیا وہ غور سے میرے ہاتھ کی طرف دیکھنے لگا۔ حیران رہ کر وہ میرے پھیلے ہوئے ہاتھ کو دیکھ رہا ہے۔ یکبارگی مجھے احساس ہوا کیا دیکھ رہا ہے وہ میرے ہاتھ میں۔ اور پھر مجھے خیال آیا۔

وہ میرا سیدھا ہاتھ تھا۔

وہ ہاتھ جس کے بارے میں کچھ دیر پہلے میں نے اسے بتایا تھا کہ وہ بیکار ہے، مفلوج ہے اور بے جان ہے۔ وہی ہاتھ ایک تندرست ہاتھ کی طرح اس کے سامنے پھیلا ہوا تھا اور وہ اسے حیرت سے تک رہا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے دوسری بے وقوفی کی سٹپٹا کر جلدی سے وہ ہاتھ اپنی طرف کھینچ لیا۔ لیکن اس طرح تو بات اور بگڑ گئی تھی۔ کچھ دیر وہ پلکیں جھپکا کر میری طرف دیکھتا رہا۔ اس کا ہاتھ میری طرف پھیلا ہوا تھا جسے اس نے سمیٹ لیا۔

"کیا بات ہے محترمہ" آخر کو وہ گھبرائے ہوئے انداز میں بولا۔

"جی کچھ نہیں" میں نے جواب دیا۔ لیکن نظریں اوپر نہیں اٹھائیں۔ میرا چہرہ شرم اور ندامت کی چغلی کھا رہا تھا۔ میرا فضول کا جھوٹ پکڑا گیا تھا، وقت بہت کم تھا اور مجھے آئندہ کے لیے فیصلہ کرنا تھا۔

"جی ہاں" میں نے ڈھیٹ بن کر جواب دیا کیونکہ میں فیصلہ کر چکی تھی۔

"لیکن شائد اس میں بظاہر تو کوئی خرابی نہیں ہے۔"

"جی ہاں نہیں ہے۔"

"تو پھر ۔ ؟" وہ بچوں کی طرح متحیر ہو کر بولا۔

"تو پھر کیا ۔؟

"جی میرا مطلب ہے، آپ شائد ابھی یہ کہہ رہی تھیں کہ آپ کا یہ ہاتھ بے جان ہے، حرکت نہیں کرتا۔"

"میں نے ۔" میں بڑی ادا سے مسکرائی "میں نے جھوٹ بولا تھا۔" اور یہ کہہ کر پھر سنجیدہ ہو گئی۔ میں جو کچھ کہہ رہی تھی سچ کہہ رہی تھی، لیکن جھوٹ سے سچ کی طرف لوٹتے وقت کچھ یہی دور لگی تھی کہ تھک گئی۔

وہ گھبرا کر بولا۔ "جھوٹ بولا تھا یعنی میں نہیں سمجھا، آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں ۔؟"

"جی ہاں میں نے جھوٹ بولا تھا کہ میرا سیدھا ہاتھ بیکار ہے۔

"کوائٹ اسٹرینج ۔" وہ مسکرایا۔ "لیکن معاف کیجیے گا، آخر کوئی وجہ تو ہو گی؟"

"وجہ یہ ہے کہ میں لوگوں سے ہمدردی چاہتی ہوں۔ ان کی توجہ اپنی طرف کرنے کے لیے جھوٹی کہانیاں گڑھ لیتی ہوں۔ میں پہلے بھی کئی بار ایسا کر چکی ہوں" مجھ سے اور سچ نہیں بولا گیا۔

"جی" وہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"کمال ہے۔" وہ اور زیادہ گھبرا گیا۔ "لیکن آپ یہ کیوں سمجھتی ہیں کہ انھیں باتوں سے لوگ آپ کی طرف متوجہ ہوں گے۔ اور پھر آپ میں کون سی ایسی کمی

ہے، آپ تو۔۔۔

"جو کچھ بھی ہو۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "شاید یہ میرا پرانا مرض ہے۔ آئی ایم ریلی ویری ساری۔"

اور پھر بس ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ ہم شہر کے بڑے بس اسٹیشن پر پہونچ گئے تھے۔ مجھے ایسا لگا جیسے سینہ سے ایک بوجھ ہٹ گیا ہو۔ مجھے وہیں اترنا تھا۔ میں بجلی کی تیزی کے ساتھ اپنی سیٹ پر سے اٹھی، میرے پاس سوائے ایک پرس کے اور کوئی سامان نہیں تھا، پورے سفر میں شائد ایک گھنٹہ گزرا ہوگا لیکن دماغ تھک سا گیا تھا میں تیزی سے بس کے باہر اتر آئی۔ کھلی ہوا میں میں نے لمبی سی سانس لی۔ میں اس کے بیاکھیوں پر لٹک کر چلنے کا منظر دیکھنا چاہتی تھی۔ اس لیے میں نے باہر نکل جانا ہی مناسب سمجھا۔ لیکن میں چند ہی قدم گئی ہوں گی کہ میرے کانوں میں آواز آئی۔

"سنیئے محترمہ!"

"جی" میں نے پلٹ کر دیکھا۔

وہ ایک ہاتھ میں اپنا سامان لیے اور دوسرے ہاتھ میں دونوں بیاکھیاں پکڑے مسکراتا ہوا اپنے دونوں پیروں سے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میرے قریب آکر وہ بولا۔

"کیا آپ میرے ساتھ سامنے کینٹین میں ایک پیالی چائے پی سکتی ہیں؟ کیوں نہ ہم دونوں ایک دوسرے سے باقاعدہ متعارف ہو لیں۔"

"شکریہ۔" میں نے جی کڑا کر کے کہا۔

"آئیے، تشریف لائیے۔" وہ بے حد نرمی سے بولا۔ اور ہم دونوں کینٹین کی طرف بڑھنے لگے۔ کینٹین میں بیٹھ کر ہم دونوں نے ایک دوسرے کو اپنے نام بتائے اپنے اپنے کام دھندوں کے بارے میں ایک دوسرے کو روشناس کرایا اور اس کاروباری بات کے بعد بنا وقت ضائع کئے وہ بولا۔

"معاف کیجئے گا محترمہ۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔

"تھینک یو۔" میں نے کہا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو ایک بات عرض کر دوں۔"

"فرمائیے۔"

"آپ تو جانتی ہوں گی کامپلکس کیسے بھی ہوں، ان کا وجود ہمارے اندر ہی ہوتا ہے۔ میرا مطلب ہے انسان کو انھیں برابر ٹٹولتے رہنا چاہئیے۔"

"جی میں، میں نہیں سمجھی۔ مجھے تو کوئی کامپلکس نہیں۔" میں بہت ہی نارمل انداز اختیار کرتے ہوئے بولی۔

"جی میرا مطلب کچھ اور نہیں ہے۔ پریشان ہونے کی بات نہیں ہمارے دماغوں میں بھی۔۔۔ بیساکھیاں لگ جاتی ہیں اور کبھی کبھی دماغ انھیں بیساکھیوں کے سہارے زندگی کا سارا سفر کاٹ دیتا ہے۔ مگر ان بیساکھیوں کو ہٹایا بھی جا سکتا ہے۔"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ آپ آدمی بڑے دلچسپ ہیں۔" میں نے لئے بڑھائی دی۔

"شکریہ۔ دیکھئے بات یہ ہے کہ میری بہن بھی کبھی کبھی اس طرح کی باتیں کرتی

"اوہ"

"جی ہاں۔ یہ بیساکھیوں کا جوڑا اسی کا ہے۔ مگر یہ بیساکھیاں اس سے ہٹائی نہیں جا سکتیں۔ لیکن آپ کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔"

"میرے ساتھ کیا ہے؟"

"کاش میں آپ کے اندر اعتماد پیدا کر سکتا۔ آپ کے ذہن میں لگی ہوئی بیساکھیاں ہٹا سکتا۔"

"یہ تو حالات پر منحصر ہے۔" میں گردن جھکا کر آہستہ سے مسکرائی۔

وہ اور بھی سنجیدہ ہو گیا۔ "کاش آپ مجھے ایسے حالات پیدا کرنے کا موقع دیں۔"

میں خاموش رہی۔ وہ بھی کچھ دیر خاموش رہا۔ آخر اس نے اپنے پرس سے ایک خوبصورت سا چھوٹا کارڈ نکالا۔

"یہ میرا کارڈ ہے کسی دن غریب خانہ پر تشریف لائیے۔ میری ماں اور بہن آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔"

"آپ مجھ سے مل کر خوش نہیں ہوئے۔"

"یہی سوال میں آپ سے کرنا چاہتا ہوں" وہ دھیرے سے بولا۔ کینٹین کے ریڈیو پر کوئی رومانی دھن بج رہی تھی۔ میری چائے کی پیالی ختم ہو چکی تھی۔ میں کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

"آپ کی چائے کا شکریہ۔ جہاں تک آپ سے مل کر خوش ہونے کی بات ہے تو سنیے۔ جب تک میں نے یہ محسوس کیا کہ یہ بیساکھیاں آپ استعمال کرتے ہیں، میں آپ سے مل کر خوش ہی نہیں بلکہ بے حد مسرور تھی لیکن اب جبکہ آپ نے

پیروں پر چل سکتے ہیں۔ I hate you and you can go to hell
اور یہ کہہ کر میں چلی آئی۔ چلتے وقت جو کارڈ اس نے دیا تھا وہ اب بھی موجود ہے۔
میں بچا ہوا تو مل سکتی ہوں اس سے، لیکن اس سے تو مر جانا بہتر ہے۔

ڈوب بھیگے ہوئے لوگ

بالکل اچانک بارش شروع ہو گئی۔ گرد آلود زمین پر انتہائی موٹی موٹی بوندیں اتنی تیزی سے یلغار کرنے لگیں کہ لوگوں کو جسم پر ان کی چوٹوں کا احساس ہونے لگا تھا۔ کسی کو توقع نہ تھی کہ بارش ہو گی، نہ تو موسم ہی تھا اور نہ ایسے آثار ___ خلاف توقع کوئی بہت بڑی تبدیلی ہمیں سب سے پہلے چونکاتی ہے اور پھر ہمارے معمول میں خلل پیدا کر دیتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بارش نے سڑکوں اور چوراہوں کا سارا انتظام درہم برہم کر دیا تھا، لوگ گھروں سے نہ تو برساتیاں لے کر نکلے تھے اور نہ چھاتے۔ اپنے اپنے بچاؤ کے لئے ادھر ادھر بھاگنے لگے۔

میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کے یہاں کسی چیز میں استحکام نہیں۔ تڑاتڑ بوندیں گرنے پر میں بھی سٹپٹا گیا۔ فوری طور پر میں نے بھی وہی فیصلہ کیا جو اس وقت عام طور پر دوسرے لوگوں نے کیا تھا۔ میں بھی اس وقت سڑک پر چل رہا تھا

جیسے ہی بارش شروع ہوئی میں نے بھی بھاگ کر سب سے پہلی چھت کے نیچے پناہ لی۔ ابھی میں چھت کے نیچے پہنچ کر اپنی جگہ پر سنبھل کر بھی نہ پایا تھا کہ گرتا پڑتا ایک اور آدمی میرے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو ایک بار دیکھا۔ پھر دونوں اپنی اپنی سانسوں پر قابو پانے میں لگ گئے۔ میں نے رومال سے اپنا چہرہ پونچھا قمیض اور پتلون پر ایک نظر ڈالی اور سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔

"بھلا بتایئے کون کہہ سکتا تھا کہ بارش ہونے لگے گی۔"

میرے قریب کھڑے ہوئے آدمی نے سلسلہ شروع کیا۔ میں اس وقت قطعی کسی راہ و رسم کو بڑھانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ جواب میں خاموش رہا اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

خیال تھا کہ یہ موسم کا چھینٹا ہے دو چار پل میں کس بل نکل جائیں گے۔ لیکن ایک بار آسمان پر جو نظر پڑی تو سمجھ میں آیا کہ اتنے بہت سے بادل اس قدر آس پاس چھپے ہوئے تھے اور ہم میں سے کسی کو ان کی خبر تک نہ ہوئی دیکھتے دیکھتے موسلا دھار پانی گرنے لگا۔ گھٹائیں چاروں طرف پھیل گئی تھیں۔ سامنے جس سڑک پر ہجوم تھا ایک پرنالے کی طرح بہنے لگی تھی۔ میں ابھی پہلو بدل کر ان حالات کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ سر اور کندھوں پر ٹھنڈی ٹھنڈی کچھ بوندوں کے گرنے سے چونک پڑا۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ ہمارے سروں کے اوپر آسمان کے بجائے چھت تھی۔

شاید میرے قریب کھڑے ہوئے آدمی کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا تھا۔ یکبارگی ہم دونوں نے دوسری بار ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر ایک ساتھ

ہماری نگاہیں اوپر اٹھ گئیں۔

ہم جس پناہ میں کھڑے تھے وہ ایک پرانا سائبان تھا جو کسی پرانے مکان کے صدر دروازے کے سامنے نکلا ہوا تھا اور جس کی لمبائی شکل سے پانچ فٹ اور چوڑائی دو گز رہی ہوگی۔ ہماری پشت پر صدر دروازہ تھا جس میں تالا لگا ہوا تھا۔ سائبان کی چھت پرانی وضع کی تھی جس کی بوسیدہ دھنیاں نیچے کو جھکی پڑ رہی تھیں اور ان پر پانی کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ دھیرے دھیرے یہ بوند موٹی ہوتی جاتیں اور جب اپنا وزن سادھ نہ پاتیں تو پکے ہوئے آم کی طرح پٹ سے گر پڑتیں۔ یک بارگی ہوا نے بڑی بے رحمی کے ساتھ ہماری سمت رخ کیا اور ایک بہت ہی دبیز سا چھینٹا ہم دونوں کو گھٹنوں تک بھگوتا چلا گیا۔ میں تلملا کر پیچھے ہٹا۔ میرے قریب کھڑا ہوا آدمی تو جیسے اچھل پڑا۔ حالانکہ پیچھے اب گنجائش نہ تھی لیکن وہ آدمی کچھ اس طرح کی کوشش کر رہا تھا جیسے دروازے کی دیوار اس کی مزاحمت پر قدرے پیچھے ہٹ جانے کو تیار ہو جائے گی۔ ہوا کا جھونکا آیا اور چلا بھی گیا لیکن سائبان کی دراڑوں اور دھنیوں سے بوندوں کا سلسلہ تیز تر ہو چکا تھا۔ میرا ساتھی اب بار بار پہلو بدل رہا تھا اور اپنے آپ میں سکڑتا چلا جا رہا تھا۔

میں نے سامنے کھلی ہوئی سڑک پر نظر ڈالی۔ کبھی کبھی کوئی موٹر تمام شیشے چڑھائے چھپا چھپ کرتی گزر جاتی۔ اکا دکا سائیکل سوار دانتوں پر دانت جمائے سارے جسم سے شرابور پیڈل پر زور مارتے دکھائی دیتے۔ ان سائیکل سواروں نے بارش کو جس نقطۂ نظر سے دیکھا تھا وہ مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ میں نے اکتا کر

اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔ وہ ایک کرتا اور پائجامہ پہنے تھا۔ کرتے کے مونڈھے پوری طرح بھیگ گئے تھے۔ چھت سے گرنے والی بوندوں نے اس کے سر، پیٹھ اور باہوں کو اچھی طرح بھگو دیا تھا۔ اس کے پائجامے کی دونوں مہریاں گھٹنوں تک بوچھار کی چوٹ سے پہلے ہی زخمی ہو چکی تھی ـــــــ اس کی یہ حالت دیکھ کر میں نے اپنے کپڑوں کا جائزہ لیا۔ ظاہر ہے کہ ہم دونوں ایک ہی حمام میں تھے۔ اپنا یہ انجام دیکھ کر میں جھنجھلا اٹھا۔

"کبھی یہ بارش نواب رکنے کی نہیں" میں نے پہلو بدل کر کہا اور اپنے ساتھی کی طرف اس طرح دیکھنے لگا جیسے اس سے اپنی پچھلی برتی ہوئی بے رخی کی معافی مانگنا چاہتا ہوں۔

"جی ہاں بادل گھر گئے ہیں"

"اور یہ بھی جگہ کچھ محفوظ نہیں دکھائی دیتی" یہ کہہ کر میں نے چھت کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی دیکھا اور ایک بار پھر ہم دونوں کی نظریں ملیں۔ دراصل میں اب اکتانے لگا تھا۔ میرا جی چاہنے لگا تھا کہ وہاں سے نکل بھاگوں۔ مجھے سڑک پر اکا دکا لوگ اس پانی میں جاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ابھی میں الجھ ہی رہا تھا کہ میرے سر پر پھر کچھ بوندیں گریں۔ میں نے جلدی سے پہلو بدلا۔ لیکن ساری چھت ہی شاید ٹپک رہی تھی جس طرف بھی میں سکڑتا بوندیں میرے تعاقب میں لگی رہتیں۔ یہی حال اس اجنبی کا بھی تھا وہ بھی بہت تیزی سے اس مختصر سی جگہ میں کئی بار اپنی پوزیشن بدل چکا تھا۔ آخر کو میں جھنجھلا کر اس سے مخاطب ہوا۔

"آیئے ہم لوگ نکل چلیں"

جواب میں اس نے میری طرف دیکھا۔ دھیرے سے مسکرایا اور پھر ایک کونے میں سکڑ گیا۔ شاید اسے میری بات اس حد تک مضحکہ خیز لگی تھی کہ اس نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا۔

لیکن میری الجھن بڑھتی جا رہی تھی مجھے اب شدید گھٹن سی ہونے لگی تھی۔ چھت سے مسلسل ٹپکنے والی بوندیں تیروں کی طرح میرے جسم کو چھید رہی تھیں۔ میرے تلوؤں کے نیچے کی زمین اب کیچڑ میں تبدیل ہو چکی تھی اور آس پاس کے ننھے منے گڑھوں میں اتنا پانی آنے لگا تھا کہ جتنا لاڈلے اور ضدی بچے پیالیوں کی تہوں میں دودھ چھوڑ دیتے ہیں۔ میں نے اپنے ساتھی کی طرف قدرے غور سے دیکھا۔ لیکن اس کے چہرے پر اس اکتاہٹ اور بیزاری کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ جو میں محسوس کر رہا تھا اور پھر میں نے انتہائی کینہ توز نظروں سے اس کے ارادوں کو بڑی ہوشیاری سے ٹٹولنا شروع کیا کہ شاید اس نے اس سڑی گلی چھت کے نیچے کھڑے رہنے کے سلسلے میں اپنا فیصلہ بدل دیا ہے لیکن مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ وہ ڈھیٹ بنا جما کھڑا تھا۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور اس بار میں قدرے ترش روئی سے مخاطب ہوا۔

”کیا آپ سمجھتے ہیں یہاں کھڑے رہنے سے آپ اپنے کو بھیگنے سے بچا لیں گے؟“

”مشکل ہی نظر آتا ہے۔“ اس نے بے دلی سے جواب دیا۔

”کیا آپ کے خیال میں یہ بارش اگلے دس پانچ منٹ میں رک سکے گی؟“

”آثار تو ایسے نہیں ہیں۔“ اس نے پھر الفاظ چبا چبا کر جواب دیا۔

"تو پھر یہاں جھک مارنے سے فائدہ؟ جب بھیگنا ہی ہے تو پھر اتنی بے بسی کے ساتھ کیوں بھیگیں۔"

"اور تھوڑا دیکھ لیتے ہیں ممکن ہے تھم ہی جائے۔" وہ پہلو بدلتے ہوئے بولا اور اپنے بھیگے ہوئے قمیص کے دامن سے جو اس کے بدن پر کھال کی طرح چپکا ہوا تھا چہرہ پونچھنے لگا ——

میں نے اپنی اندرونی گھٹن دور کرنے کے لیے ایک لمبی سانس لی اور سامنے سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔ بارش میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ اسی تیزی اور تندی کے ساتھ پانی ہر طرف ٹوٹ ٹوٹ کر بہ رہا تھا۔ میں نے بڑی بے چینی کے ساتھ اپنے دائیں بائیں ایک بار پھر نظر دوڑائی۔ دور تک کوئی بھی ایسا مقام نظر نہیں آیا جہاں بھاگ کر پناہ لی جا سکتی۔ کچھ دور پر ایک پیٹرول پمپ ضرور دکھائی دے رہا تھا اور اس کے بعد ایک رہائشی عمارت کے کمپاؤنڈ کی چہار دیواری تھی جو کچھ دور تک جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ میں اس امکان سے واقف تھا۔ اس میں ایک لیڈی ڈاکٹر رہتی تھی جس کے پھاٹک پر اس کی نیم پلیٹ سے بھی بڑے ایک بورڈ پر موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا "کتوں سے ہوشیار۔" ابھی میں اپنے دائیں بائیں جھانک تانک میں لگا ہوا تھا کہ ایک کتے نے ہماری چھت کے نیچے آکر اپنے کان پٹ پٹائے۔ ہم دونوں نے بیک وقت اس کو وہاں سے بھگا دیا۔

"دیکھیے اس طرح کھڑے رہنا حماقت ہے۔" اسی درمیان میں نے اسے پھر مخاطب کیا۔

"تو پھر کیا کریں؟" وہ اپنے کندھے ڈالتے ہوئے بولا۔

"ہم لوگ یہاں سے نکل چلیں۔"

"مگر بارش بہت تیز ہے۔"

"تو کیا ہوا؟" مجھے غصّہ آگیا۔ "ہم لوگ تو ویسے بھی سر سے پیر تک بھیگ چکے ہیں کیا آپ کو اب بھی یہ خوش فہمی ہے کہ اس چھت کے نیچے آپ محفوظ ہیں۔"

"لیکن پھر بھی......" یہ کہہ کر وہ تذبذب میں پڑ گیا۔

"خیر صاحب میں تو اب یہاں ایک منٹ نہ رکوں گا۔ میں تو چلتا ہوں۔"

"جیسی آپ کی مرضی؟" یہ کہہ کر اس نے اپنے آپ کو اور سکیڑ لیا۔

اس کے اس جواب پر میں دل ہی دل میں اور بزبز ہوا۔ میں نے سمجھا تھا کہ میرے اور اس کے درمیان بہت کچھ مشترک تھا۔ سفر کا ارادہ، یک بارگی بارش میں پھنس جانا، ایک ایسی چھت کے نیچے سر چھپانا جس کی رگ رگ چھدی ہوئی تھی اور پھر ایک ہی کیفیت میں لگاتار دونوں کا بھیگنا۔ اسی لیے میں نے سوچا تھا کہ ایسے حالات میں ہم دونوں کی سوچ بھی کم و بیش مشترک ہوگی لیکن وہ ایسی حماقت آمیز حرکتیں کر رہا تھا جن کا کوئی جواز میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

میں نے سینہ تان کر اپنا ایک پیر زمین سے اوپر اٹھایا اور اپنے بھیگے ہوئے پتلون کی مہریوں کو لپیٹ کر اوپر چڑھانے لگا۔ مجھے الجھن تھی، غصہ تھا۔ اپنے اندازے غلط ہوتے دیکھ کر ایک طرح کی جھنجھلاہٹ تھی۔ ہم دونوں کی سوچ میں بڑا فرق تھا، ہمارے راستے الگ الگ تھے۔ ہمارے نفع نقصان کے پیمانے بھی میل نہیں کھاتے تھے۔ وہ ٹپکتی ہوئی چھت سے دھیرے دھیرے تھوڑا تھوڑا کر کے بھیگنا چاہتا تھا یہاں تک کہ اس کا پورا جسم شرابور ہو جاتا لیکن پھر بھی وہ چھت اس کا پیچھا

نہ چھوڑتی، اس کو بھگوتی رہتی۔ ستا ستا کر بوندیں گرتی رہتیں، بالوں پر گر کر گدّی سے ہوتی ہوئی پیٹھ پر رینگتی ہوئی ایڑی کے آخری سرے تک پہنچ جاتیں۔ بھیگنے کا یہ عمل آہستہ اور سست رفتاری کے ساتھ تھا۔ لیکن وہ اتنا بھی بیوقوف نہیں تھا کہ اس کے انجام سے واقف نہ ہو، پھر کیوں وہ اس چھت سے چمٹا ہوا تھا۔ شاید اس نے قناعت کر لی تھی جو کچھ پہلی کوشش میں ہاتھ آگیا تھا بس اسی کو بہت جانا تھا۔

کاہل۔

کوڑھ مغز

پست ہمّت اور مردہ۔

میں نے زمین پر تھوکا اور والہانہ انداز میں دھڑ دھڑاتے ہوئے پانی میں سینہ تان کر نکل کھڑا ہوا۔ میں نے پھر پلٹ کر نہیں دیکھا ہوا کے تیز جھونکے اور بوچھاروں کے تیز طمانچوں نے میرا استقبال کیا۔

کاوش۔

Exploration

تلاش!

یہی زندگی ہے، میں نئی پیڑھی کا آدمی ہوں۔ میری سوچ میں بڑا فرق ہے چھت دھیرے دھیرے اب بھی ٹپک رہی ہے۔ دھیرے دھیرے بھیگنا اور بھیگے ہوئے بدن پر دھیرے دھیرے ہوا لگتے رہنا تو اور بھی نقصان دہ ہے اسے ضرور ٹھنڈ لگ جائے گی۔ مجبوری ہے ہم سب اپنی اپنی پسند کی موت مرنا قبول کرتے ہیں۔

ہمارے اپنے سلیکشن ہیں۔ ہر آدمی کینسر سے مرنا نہیں پسند کرتا جس طرح ہر آدمی ریل سے کٹ کر مرنا پسند نہیں کرے گا لیکن اگر اسے ٹھنڈ لگ گئی اور ڈبل نمونیا ہو گیا اور وہ مر گیا تو سب کیا کہیں گے۔

بیوقوف! ایک ٹپکتی ہوئی چھت کے نیچے سارا دن کھڑا رہا اس امید پر کہ شاید بارش تھم جائے۔

کام چور، بدحال، اور ناکارہ روحوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ یہ سوچ کا فرق ہی بات یہ ہے کہ ہم زندگی کو کیسے دیکھتے ہیں؟ مرنا تو سب کو ہے، یہ اتنا اہم نہیں اہم یہ ہے کہ ہم کس طرح مرتے ہیں۔ بالکل ٹھیک ہے اس پر بات کی جا سکتی ہے۔ ایک اچھا موضوع ہے کافی ہاؤس جا کر پنکھے کے نیچے کھڑا ہو جاؤں گا ٹیرلین کی قمیض پتلون ہے، پانچ منٹ میں سوکھ جائے گی۔ تب میں ان لوگوں سے پوچھوں گا جو میرے ساتھی ہیں کہ وہ کس کے لیے مرنا پسند کریں گے۔ کس طرح یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے لیکن کس مقصد کے لیے موت انھیں قبول ہوگی؟ کیا ایک ٹپکتی ہوئی چھت کے نیچے ڈبل نمونیا کا شکار ہو کر مرنا ایک عظیم مقصد ہے۔ میں جانتا ہوں وہ لوگ میری بات سنیں گے مجھ سے کہیں گے کہ تم میں سن ۱۹۶۰ء کے بعد کی جینیا بول رہی ہے۔ تب میں ان سے کہوں گا کہ ہاں تم لوگ ٹھیک کہتے ہو، یہی بڑا فرق ہے، سوچ کا فرق اور پھر میں انھیں بتاؤں گا کہ اب بھی ایک آدمی اس چھت کے نیچے کھڑا ہے جو کھلے آسمان کی بارش کے نیچے بھیگنا پسند نہیں کرتا، لیکن بھیگ رہا ہے۔ وہ میرے ساتھ نہیں آیا۔ لیکن میں کھلے آسمان کے نیچے بھیگتا ہوا آیا ہوں۔ پوری بارش میرے اوپر سے گزر گئی ہے، میں نے پوری بارش کو اپنے بدن پر جھیلا ہے، تب کافی ہاؤس کی آرام دہ کرسی اور مضبوط

چھت کے نیچے پہنچا ہوں ۔ میں نے انکس بلور کیا ہے ایسرٹ کیا ہے۔ تلاش کے لیے بوچھاروں کے طمانچے کھائے ہیں، مجھے پانی سے ڈر نہیں تھا لگاؤ تھا۔

لگاؤ ــــــ وہ لوگ اس لفظ پر ضرور چونکیں گے ۔

بوچھاروں کی موٹی موٹی یلغار نے میرے اندر حیرت جگائی تھی جستجو کے لیے اکسایا ہے :

حیرت اور جستجو ! وہ لوگ ان لفظوں کو بھی سنبھال کر رکھ لیں گے تو میں ان لوگوں سے کہوں گا کہ میرے اندر پوری قوت کے ساتھ یہ عقیدہ موجود تھا کہ اس بارش سے پیار کر کے اس کے ساتھ بہہ کر میں ضرور ایک نئی اور بہتر صورت حال تک پہنچوں گا۔

عقیدہ ــــــ وہ اس لفظ کو بھی جلدی سے اپنے قبضہ میں کر لیں گے اور پھر وہ اس بھیگتے ہوئے آدمی کی طرف سے لاپرواہ ہو کر مجھ سے چھینے ہوئے چاروں لفظوں کو کنجوس کی طرح دھیرے دھیرے نکالیں گے ۔

لگاؤ۔

حیرت و جستجو۔

اور عقیدہ۔

پھر ان سب کی آنکھیں طوطے کی طرح ہو جائیں گی اور وہ دھیمے دھیمے لہجے میں مجھے بتائیں گے کہ رگ وید کے انسان کے پاس یہ چار عظیم چیزیں موجود تھیں۔

لگاؤ، حیرت و جستجو، اور عقیدہ۔

ہمارے پاس ان میں سے کچھ بھی باقی نہ رہا اور یہی ساری الجھن ہے ۔ ہم لوگ وید نہیں لکھ سکتے، کوئی وید نہیں لکھ سکتے لیکن تم اس بھیگتے ہوئے آدمی کے بارے میں

کیا کہہ رہے تھے؟؟

لیکن بارش —— سڑک پر چلتے چلتے یک بارگی مجھے احساس ہوا جیسے پانی برسنا تھم گیا ہو۔ ذہن کا سارا تناؤ جیسے ڈھیلا پڑ گیا۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا بادل تیزی سے بھاگ رہے تھے اور بوندیں مگر نا نہ جانے کب بند ہو گئی تھیں کافی ہاؤس ابھی دور تھا۔ بھیگی ہوئی لمبی سڑک پر میرے ٹخنے اپنے آپ لڑھکتے چلے جا رہے تھے میری قمیض اور پتلون دونوں کھال سے چپکی ہوئی تھیں۔ اندر کے بنیائن کے کٹاؤ صاف دکھائی دے رہے تھے میری جیب میں چار مینار کی ڈبیا میں صرف ایک سگریٹ تھی۔ ڈبیا نکال کر میں نے سڑک کے دونوں طرف دیکھا کچھ قدم آگے سڑک کے ایک کنارے پر چائے کی ایک دکان دکھائی پڑی جس کی بھٹی کے کوئلے پانی کی بوچھار پا کر اور سرخ ہو گئے تھے ہوا اب بہت ٹھنڈی تھی۔

سرخ سرخ انگاروں والی بھٹی کے پاس کھڑے ہو کر میں نے ڈبیا سے سگریٹ نکالی جو پوری بھیگ چکی تھی۔ سگریٹ ہونٹوں سے لگا کر میں بھٹی کے قریب کھڑا ہو کر اپنے کو نچوڑنے لگا۔ ماچس لے کر سگریٹ جلائی اور دو چار کش لیے ہی تھے کہ سگریٹ کا کاغذ اپنے آپ ہی گھلتا چلا گیا اور ہونٹوں پر تمباکو کے بہت سے ریشے چپک گئے۔ سگریٹ تھوک کر میں نے چائے والے سے ایک کپ چائے مانگی اور بھٹی سے اپنے کو سکھانے لگا۔ پانی تھمتے ہی سڑک پھر سے چل نکلی تھی۔

"تو صاحب اب کپڑے سکھائے جا رہے ہیں"! کوئی میرے پاس سے گزرتے ہوئے بولا۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا وہی اجنبی ہنستا ہوا چائے خانے میں داخل ہو رہا تھا "آئیے چائے پیئیں"! ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں

قریب ہی بیٹھ گیا۔ ہوا بڑی تیزی سے چل رہی تھی۔ میرے کپڑے کی نمی اب قدرے کم رہ گئی تھی۔

" آپ نے جلدی کی۔ دس منٹ بعد بارش تھم ہی گئی ۔" اس نے اپنی قمیص کا دامن نچوڑتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کی طرف بے دلی سے دیکھا اور بڑبڑایا۔

"اور اگر نہ تھمتی ؟"

"مجبوری تھی !"

مجھے اس کے اس جواب پر افسوس ہوا، قیمتی لفظوں کا بے محل استعمال اتنا ہی افسوس ناک ہوتا ہے جتنا ایک شکاری کے لیے شیر کی گولی سے چڑیا کا شکار کرنا۔

" آپ ایک معمولی آدمی ہیں ۔" میں نے اسے جواب دیا۔

" اچھا ؟" یہ کہہ کر اس نے ایک سوالیہ نشان بنایا " کیسے ؟"

" جیسے کہ اور سب معمولی لوگ ہوا کرتے ہیں ؟"

وہ میری بات پر قطعی دکھی نہیں ہوا۔ صرف ہنس دیا اور جب چائے آئی تو اپنی پیالی میں مزے سے چمچہ چلانے لگا۔

" میں یہ بات سنجیدگی سے کہنا چاہوں گا کہ آپ یا آپ جیسے لوگ خود اپنی جگہ پہ ایک مجبوری ہیں ۔"

وہ پھر غمگین نہیں ہوا بلکہ میری بات پر ہنس دیا اور سیدھا میرے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا " میں نے آپ کا ساتھ نہیں دیا تو شاید آپ اس پر ناراض ہیں ۔"

" بے تکی باتوں سے کوئی فائدہ نہیں ۔" اب مجھے غصہ آگیا " آپ میرا ساتھ کیا دیتے کوئی میں نپولین تھا جو واٹر لو کو فتح کرنے جا رہا تھا اور مجھے ساتھی درکار تھے۔

میں نے تو ایک سیدھی سادھی بات کہی تھی۔"

"کون سی بات؟"

"یہی کہ بھیگنا تو یوں بھی ہے آیئے نکل چلیں۔" میں پوچھتا ہوں آپ بھیگنے سے بچ گئے۔"

جواب میں اس نے میری قمیص کی طرف غور سے دیکھا۔

"یہ کپڑا شاید پولی آسٹر فیبرک کہلاتا ہے؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں! لیکن بھیگتا یہ بھی ہے۔" میں نے طنز کیا۔

"پتلون بھی اسی کپڑے کا ہے شاید۔" اس نے میری پتلون کو نظروں سے ٹٹولا۔

"جی ہاں!"

"آپ کی قمیص میں کوئی جیب تو ہے نہیں؟"

"جی نہیں۔"

جواب پا کر چپ ہو گیا۔ چائے کا آخری گھونٹ لیا اور اس بار ذرا اونچی آواز میں کہنے لگا "ویسے مجھے اس بات کے پوچھنے کا کوئی حق نہیں لیکن اگر آپ مناسب سمجھیں تو بتائیں کہ کپڑوں کے علاوہ آپ کے ساتھ اس وقت کیا اور کوئی چیز ہے؟"

"کیا مطلب؟" میں نے بات کی وضاحت چاہی۔

"میرا مطلب ہے کہ آپ کی پتلون کی جیبوں میں اس وقت کون کون سی چیزیں ہیں، میرا مطلب ہے جیسے روپیہ پیسہ۔"

"یا کچھ ریزگاری پڑی ہے۔"

"کوئی نوٹ؟"

"نہیں ہے۔"

"کوئی تصویر — ایسی تصویر جسے آپ رکھنا چاہتے ہوں جو آپ کو بہت عزیز ہو۔"

"نہیں ہے۔"

"کوئی ایسا کاغذ، یا کوئی مسودہ جو آپ کے لئے بہت قیمتی ہو، یا کم سے کم جس کی حفاظت آپ کے لئے بہت ضروری ہے۔"

"نہیں ہے۔"

"کوئی ایسی دوا میرا مطلب ہے گولیاں یا کیپ سول جو قیمتی خواہ نہ ہوں لیکن اس لیے اہم ہوں کہ انھیں ایسے بیمار کو دیا جانا ہے جو اسے اگر جلد مل جائیں تو وہ بچ سکتا ہے۔"

"نہیں ایسی بھی کوئی چیز نہیں ہے۔"

"کوئی تعویذ کہ جس پر آپ کو بھروسہ ہو کہ جب تک وہ آپ کے پاس رہے گا فتح و کامرانی آپ سے منھ نہیں موڑے گی۔"

"یہ سب کیا بکواس ہے۔"

"یعنی نہیں ہے؟"

"ہاں نہیں ہے۔"

"آپ کے پاس ایک پتلون، قمیص، ایک جوڑا جوتا اور کچھ ریزگاری کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اس وقت؟"

"نہیں۔"

"میری قمیض سے پہلے آپ کی قمیص سوکھے گی کیونکہ پولی آسٹر فیبرک ہے۔"

"جی ہاں۔"

"اسی طرح سے میری پتلون سے پہلے آپ کی پتلون سوکھے گا۔ ٹھیک۔"

"ٹھیک!"

"تو پھر" وہ مسکرایا۔

"تو پھر کیا؟" میں جھنجھلا پڑا۔

"آپ کے پاس جوتے، قمیص، پتلون اور ریزگاری کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں لیکن میرے پاس ہے، آپ کے لئے اگر جوتے اور قمیص، پتلون اور ریزگاری بھیگ بھی جائے تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن میں جوتے اور قمیص اور پتلون کے بھیگ جانے پر بھی اس چیز کو بھیگنے سے بچانا چاہتا ہوں۔"

"کس چیز کو؟" میں طیش میں آکر چیخ پڑا۔

"وہی جو میرے پاس ہے اور آپ کے پاس نہیں۔"

"آخر کیا ہے آپ کے پاس؟ وکیلوں کی طرح پھانسنے کی کوشش مت کیجئے۔" مجھے غصہ آگیا "دنیا میں کچھ ضروری نہیں یہ سب بکواس ہے۔"

لیکن وہ کچھ نہیں بولا۔ آرام سے چائے والے کو پیسے دیے اور باہر نکل کر اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "جب آپ کی جیب میں ایسی کوئی چیز ہو کہ جس کی حفاظت آپ کرنا چاہیں تو آپ کبھی باہر بھیگنے کے بجائے چھت کے نیچے بھیگنا پسند کریں گے اور اس وقت وہ آپ کی مجبوری ہوگی۔"

اور وہ چلا گیا۔ میرے جسم پر پولی آسٹر فیبرک پورا سوکھ چکا تھا۔

یہ کتابیں ہم سے طلب کیجئے

اعتبار نظر سید احتشام حسین کا نام ہی تنقید میں فکر و نظر کی گہرائی اور مسائل پر نئے انداز سے روشنی ڈالنے کی ضمانت ہے۔ اعتبار نظر میں احتشام صاحب کے ۱۲ تنقیدی مضامین شامل ہیں کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے اسے احتشام صاحب کا سب سے اہم تنقیدی مجموعہ قرار دیا جا سکتا ہے ۳۰۰ سو صفحات کے اس مجموعۂ مضامین کی قیمت صرف ۱/۲-۴ روپے ہے۔

جدید اردو تنقید، اصول و نظریات نظری تنقید پر اردو میں بہت کم کام ہوا ہے اور جو ہوا بھی ہے وہ بے حد تشنہ اور نامکمل ہے ڈاکٹر شارب ردولوی کی یہ کتاب دراصل ان کا وہ مقالہ ہے جس پر لکھنؤ یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی۔ زیر نظر کتاب کو اردو تنقید میں ایک اہم اضافہ قرار دیا جا رہا ہے۔ قیمت ۱۵ روپے

تلاش و توازن ڈاکٹر قمر رئیس کے مضامین کو محقق اور نقاد دونوں حیثیتوں سے اعتبار حاصل ہے۔ زیر نظر مجموعۂ مضامین میں اردو ناول، غالب، پیروڈی کے فن اور احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری پر بے حد اہم مضامین شامل ہیں۔ قیمت ۱/۲-۱۰ روپے

پہلی آواز رتن سنگھ کا فن اختصار سے عبارت ہے۔ ان کے افسانے عام طور پر مختصر ہوتے ہیں لیکن زندگی کا جیسا گہرا ادراک ان کے افسانوں کا ملتا ہے نئی نسل کے کسی افسانہ نگار کے یہاں نہیں ملتا۔

رتن سنگھ کے یہ افسانے ہند و پاک کے اہم ترین جرائد میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ یہ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ قیمت: ۴ روپئے

رسوا کے تنقیدی مراسلات

مرزا رسوا اپنے معاصرین میں شاید سب سے زیادہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے انھیں شعر و شاعری اور متعلقہ علوم پر ہی عبور نہ تھا بلکہ وہ ریاضی نجوم اور ٹکنالوجی پر بھی حاوی تھے۔ رسوا کے یہ مراسلات اردو شاعری کے فنی ادب میں ایک قیمتی اضافہ ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن نے انھیں جس محنت، تلاش اور سلیقے سے مدوّن اور پیش کیا ہے وہ ہر اعتبار سے مستحسن اور معتبر ہے قیمت ۲/۱ ۳ روپئے

فٹ نوٹ

یوسف ناظم کا وار کبھی اوچھا نہیں پڑتا وہ قاری کو ہنسا کر ہی چھوڑتے ہیں لیکن اس طرح نہیں کہ وہ بھری محفل میں، قہقہہ لگانے لگے، قہقہہ اور تبسم زیر لب کے درمیان کی ایک کیفیت ان کا مزاح پیدا کرتا ہے۔ فٹ نوٹ یوسف ناظم کے تازہ ترین مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ قیمت ۲/۱ ۳ روپے۔

ستم ایجاد

اگر آپ قہقہہ لگانا نہیں جانتے تو اس کتاب کو ضرور پڑھیے اور اگر آپ قہقہے لگاتے ہیں تو بھی یہ کتاب آپ کے لئے ہے۔ اس میں احمد جمال پاشا نے ایسے ایسے ستم ایجاد کیے ہیں کہ انھیں بے تحاشا داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ قیمت ۲/۱ ۴ روپے

دارا شکوہ

دارا شکوہ ہندستان کی بساط سیاست پر ایک ایسے المیہ کا نام ہے جس کے ذکر پر ہر درد مند دل ملول ہو جاتا ہے۔ قاضی عبد الستار نے دارا شکوہ اور اورنگ زیب کی آویزش کو اس خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہ قاری ناول بڑھتا نہیں

بلکہ اس دور میں پہنچ جاتا ہے اور سارے واقعات، رزم سے لے کر بزم تک آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہیں۔ قیمت ۴½ روپے

لب و رخسار منظر سلیم کو کہانی کہنے پر جیسی بے پناہ قدرت حاصل ہے ویسے نئے ناول نگاروں میں کم ہی کو حاصل ہے، مسائل پر ان کی گرفت مضبوط ہے اور ان مسائل کو گوشت و پوست کے کرداروں کے احساسات کی زبان بنانا انہیں خوب آتا ہے۔ لب و رخسار منظر سلیم کا شائد سب سے اچھا ناول ہے۔

قیمت: ۴½ روپے

سپہ سالار خلجی مائل ملیح آبادی تاریخی ناول نگاروں کے اس گروپ سے تعلق رکھتے ہیں جو کردار کے داخلی آویزش سے زیادہ واقعات اور حالات پر زور دیتے ہیں۔ اسی سبب ان کے ناولوں میں ایک ایسی برق رفتاری پیدا ہو جاتی ہے جو ناول شروع کرتے ہی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ زیر نظر ناول ان کی اس قدرت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ قیمت: ۵ روپے

بہار کا پہلا دن علاء الدین آزاد کا شمار بنگال کے اہم ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کا یہ جذباتی ناول نفسیات کے ایک ایسے نازک لمحہ کی ایسی خوبصورت تصویر کشی کرتا ہے کہ اس کا بیان مشکل ہے۔ قیمت: ۴ روپے

کل کی باتیں رام لعل اردو کے ان چند افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنہوں نے اپنی محنت اور ریاضت سے ادب میں اپنے لیے جگہ بنا لی ہے۔ ان کو کہانی کہنے کا فن آتا ہے اور اس مجموعہ کے افسانے ان کے فن میں ایک نئے موڑ کا پتہ دیتے ہیں: قیمت ۵ روپے

اسرار الحق مجازؔ اردو شاعری کی سب سے محبوب شخصیت

مجازؔ حیات اور شاعری تھی۔ منظر سلیم نے جو مجاز کے قریبی دوستوں میں شامل تھے، اس دلبر شخصیت کو اپنی اس مستقل تصنیف میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا ہے۔ کتاب میں مجاز کی نظموں کا ایک عمدہ انتخاب بھی شامل ہے۔ قیمت ۴½ روپے

رسائی جوگندر پال کا شمار اردو کے ان جدید افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے افسانہ نگاری کو ایک نئی سمت سے روشناس کرایا ہے۔ رسائی ان کے ۸ طویل افسانوں کا مجموعہ ہے: قیمت ۴ روپے

عکس ریز مظفر حنفی نے اس طویل طنزیہ نظم میں زندگی کے سارے ناہمواریوں پر بڑی خوبصورتی سے طنز کیا ہے۔ ایک ایک بند میں ایک ایک کردار کو لے کر انہوں نے گویا زندگی کی کوئی ایسی ناہمواری نہیں چھوڑی جو ان کے طنز کا شکار ہو کر پشیمان نہ ہوئی ہو۔ قیمت: ۳ روپے

کھلونے مسعود مفتی کا شمار اردو کے اہم ناول نگاروں میں ہوتا ہے ان کا یہ ناول ان حالات کی سچی اور کسی حد تک دردناک عکاسی ہے جس میں سماج کے موجودہ حالات میں اکثر ایماندار اور شریف آدمی کو بھی ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ زندگی کی ایسی سچی عکاسی اس دور کے ناولوں میں ذرا کم ہی نظر آتی ہے۔

قیمت: ۳ روپے

طوفان حوادث پروین سرور کا ایک جذباتی ناول جس میں زندگی کی کسک بھی ہے اور تڑپ بھی۔ قیمت: ۳ روپے

دو غنڈے مظفر حنفی کے افسانوں کا مجموعہ۔ ان افسانوں میں مظفر حنفی نے زندگی

کی کئی پہلوؤں سے عکاسی کی ہے۔ بیان نہایت سُلجھا ہوا ہے اور اس میں نیا پن ہے۔ اور انداز دل کش ہے: قیمت ۴ روپے

لہو کے پھول

حیات اللہ انصاری کا یہ ناول جو ۱۹۱۱ء کے دہلی دربار سے شروع ہو کر جد و جہد آزادی کے مرحلوں سے گزرتا ہوا تقریباً ۱۹۵۵ء پر محیط ہے ایک ایسا البم ہے جس میں سب ہی اہم طبقوں کے رہن سہن، مسائل اور جذبات کی سچی تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ ناول میں وہ زندگی کی ریل پیل ہے، جھونپڑیوں اور محلوں، رزم بزم کا وہ امتزاج ہے اور ایسے ڈرامائی حزنیہ، طربیہ اور مزاحیہ موڑ ہیں کہ جہاں ایک بار شروع کر دیجیے رکھنا ناممکن ہو جاتا ہے:

۲,۶۰۰ صفحات: ۵ خوبصورت جلدیں قیمت: =/۷۰ روپے

مع محصول ڈاک: آرڈر کے ساتھ دس روپے پیشگی آنا ضروری ہے۔

لامکاں

غلام مرتضیٰ راہی اردو غزل میں ایک بالکل منفرد آواز ہے۔ بے معنی غزلوں کے موجودہ سیلاب میں راہی کا شعری مجموعہ لامکاں غزل کے نئے امکانات کی نشاندہی کرتا ہے۔ قیمت: ۳ روپے

○

ماہنامہ کتاب کی ۶ یادگار اشاعتیں

افسانہ نمبر ۱۹۷۰ء
۱۳۱ افسانے، ۲ ناولٹ، ۲ ڈرامے، ۴ مضامین اور ۲ فکر انگیز سمپوزیم، ۳۰ تصاویر، صفحات ۳۳۴۔ قیمت: ۶ روپے

سالنامہ ۱۹۶۶ء
اس یادگار نمبر میں آل احمد سرور، حیات اللہ انصاری، فراق گورکھپوری، ڈاکٹر محمد حسن، مجید امجد، قاضی عبدالستار اور بہت سے دوسرے فن کاروں کی تخلیقات شامل ہیں۔ قیمت: ۲ روپے

سالنامہ ۱۹۶۷ء
اس یادگار نمبر میں ہندستان اور پاکستان کے صفِ اول کے فن کاروں کی تخلیقات کے علاوہ جدید شاعری پر ایک پر مغز سمپوزیم شامل ہے جس میں ہند و پاک کے سارے ہی اہم نقادوں اور شاعروں نے حصہ لیا ہے۔
قیمت ۳. روپے

منتخب افسانہ نمبر
اردو افسانہ نگاروں نے ۱۹۶۲ء میں کم و بیش ۲ ہزار افسانے تخلیق کیے جن میں سے رام لعل اور عابد سہیل نے ۲۰ افسانے منتخب کیے۔ قیمت: ۴ روپے

نئی ہندی کہانی نمبر
اردو افسانہ نے ہندی افسانے کو کس حد تک متاثر کیا ہے۔ اس کا اندازہ آپ اس نمبر سے لگا سکتے ہیں۔ قیمت: ۲ روپیہ

علی عباس حسینی نمبر
اس نمبر میں حسینی صاحب کی بہترین کہانیوں کے انتخاب کے علاوہ ان کے فن اور زندگی پر متعدد مضامین شامل ہیں۔ قیمت: ۲ روپے

ماہنامہ
کتاب
کپور مارکیٹ لکھنؤ ۳